ہمدم



PDFBOOKSFREE.PK

شگفتہ بھٹی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پیش لفظ

شگفتہ کا ناول ''ہمدم'' ماہنامہ چمن بتول میں قسط وار چھپا ہے۔ جس کی ہر قسط کا قارئین کو شدت سے انتظار رہتا تھا۔ اس سے بیشتر ان کا ناول ''زادِ راہ'' بھی ماہانہ چمن بتول میں چھپتا رہا اور فوراً بعد ادارہ بتول کو اسے کتابی شکل میں چھاپنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ اس کے علاوہ شگفتہ بھٹی کے دیگر ناول مڑ آ کے مول نہ جائیں اور فاصلے اور چاہتیں بھی قارئین سے مقبولیت کی سند پا چکے ہیں۔

''ہمدم'' ناول ایک بہت خوبصورت اور مغرور خاتون کی آٹھ دس سالہ ازدواجی زندگی کی کہانی کے گرد گھومتا ہے جس نے شادی کے فوراً بعد چھ سال تک فیملی پلاننگ کے ذریعہ بچے کی پیدائش کو روکے رکھا۔

''آئمہ احمد حسن'' ایک امیر کبیر اور لاڈلی بیگم جس نے وقت اور پیسے کی فراوانی کے باعث فضول مشاغل اپنانے کے ساتھ ''بہبودیٔ خواتین'' کی NGO's سے الحاق کر کے اپنی ایک الگ فاؤنڈیشن بنا لی۔ مختلف کانفرنسز بیجنگ، کھٹمنڈو، بنکاک اور امریکہ جانا اس کی مصروفیات میں شامل تھا۔ بیجنگ کانفرنس کے ایجنڈے کو ڈسکس کرنے کے لیے پانچویں عالمی کانفرنس امریکہ میں رکھی گئی۔ جس کا عنوان اکیسویں صدی کی خواتین کے لیے حفی مساوات، امن اور ترقی اور اس کام کو آگے بڑھانے کے لیے تھا۔ وزیر بہبودِ آبادی نے بڑی تفصیل سے سابقہ ایجنڈے پر عملدرآمد میں فیملی پلاننگ، بہبودِ آبادی کے سنٹرز، مانع حمل ادویات، میڈیا کا بھرپور کردار، مردوں کے شانہ بشانہ، بنک، پولیس، ٹریفک پولیس، نوجوان نسل میں جنسی تعلیم اور اس کا فروغ، خصوصاً ایڈز سے بچنے کے لیے اور مزید بہت سے ایسے اقدامات جن سے رویوں میں لچک اور نئے تصورات جنم لیں پر مشتمل رپورٹ پیش کی۔

انہی مشاغل میں وقت گزرتا رہا۔ آئمہ کو علاج کے لیے مجبور ہونا پڑا میڈیکل رپورٹس میں اس کے پاس صرف 5% ماں بننے کے چانسز رہ گئے تھے۔ وہ خود کلاتی کرتی ہے بہت

پریشانی میں خود کلامی کرتی ہے۔

اب آئمہ تم بانجھ ہو..... بانجھ..... بلکہ تم نے خود کو بانجھ کر لیا ہے۔ دراصل تم قاتل ہو ان کلکاریوں کی قاتل..... جو تمہارے وجود سے اُٹھ سکتی تھیں۔

احمد حسن اور آئمہ ایک غیر بچہ پالنے کا ارادہ کرتے ہیں۔ تو اس کی امی اسے قرآن پاک اور شریعت کی روشنی میں قانون محرمات اور معاشرتی نظام اور قانونِ وراثت سے بڑی عمدگی سے آگاہ کرتی ہے امریکہ میں اس آخری کانفرنس کے قیام کے دوران آئمہ کو طبیعت کی خرابی کے باعث ماں بننے کی خوشخبری ملتی ہے۔ وہ کانفرنس بیچ میں ہی چھوڑ چھاڑ جلد واپس پہنچتی ہے مگر احمد اس خبر سے بجائے خوش ہونے کے مشکوک ہو کر اسے میکے چھوڑ دیتا ہے وہ اس خبر کو چھپائے رکھتی ہے باپ اس کا موڈ دیکھ کر اپنی بیوی سے کہتا ہے۔

اسے سمجھاؤ اپنے یہ فضول شوق چھوڑ دے۔ گھر اور شوہر کی فکر کرے۔ پاکستان ہو یا امریکہ دنیا میں جتنی بھی عورتیں اپنے حقوق کی جنگ لڑنے کے لیے گھر سے باہر نکلیں ان کے اپنے سروں پر گھر کی چھتیں نہیں رہیں۔ وہ خود بے سکون اور غیر محفوظ ہی رہی ہیں۔ دنیا کے نظام کا ایک بڑا اصول ہے Give and take اور اسی پر انصاف قائم ہوتا ہے۔

چلیے سسرال میں یہ خوشخبری پہنچ جاتی ہے۔ مگر احمد حسن کا رویہ بدستور رہتا ہے۔ اس کی یہ ناراضگی آئمہ حسن کو خدا کے بہت قریب کر دیتی ہے وہ دن رات اللہ سے لَو لگاتی ہے۔ ایک طرف اس کا شکرانہ دوسری طرف احمد حسن کی ناراضگی، نماز اور تلاوت میں گم ہو جاتی ہے۔ ایک رات کا ذکر.....

''میرے خدایا صرف اتنا کر دے کہ میں احمد کے سامنے اپنے کردار پہ لگا داغ صاف کر سکوں جو وہ سمجھ رہے ہیں اسے غلط ثابت کر دوں۔ اس نے اپنا مدعا اپنے اللہ کے حضور التجا کے ساتھ رکھ دیا اور اس مالک کا ذکر کرتے کرتے سو گئی۔

ایک چیخ..... اللہ اکبر..... اللہ اکبر..... میرے کان میں بڑی میٹھی سی پکار پڑی اور میں ایک لمحے کی سستی کیے بغیر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ حی علی الصلوٰۃ..... حی علی الفلاح..... میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی کے پردے ہٹا کر دونوں پٹ کھول دیئے باہر فضا میں یہی پکار تھی۔ ہوائیں اپنے ساتھ اس پکار کو لیے جھوم رہی تھیں۔ ساعتوں سے دل کے اور دل سے روح کے تاروں کو چھیڑتی اس آواز میں کیسا جادو تھا میں نے ایک لمبی سانس اپنے اندر اُتاری۔ کتنا سکون تھا۔ میرا درد سے بوجھل سر فوراً ہی ہلکا پھلکا ہو گیا۔ اللہ اکبر..... اللہ اکبر..... لا الہ الا اللہ..... میرا رواں رواں اس سچائی کی گواہی دے رہا تھا اتنا پیارا نغمہ، ایسی انوکھی شاعری پوری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فضا میں گونجنے والی آوازوں کی ایک سی لَے اور ایک سا رِدھم..... واقعی امی جان ٹھیک کہتی تھیں
صبح فجر کی اذان سنا کرو۔ جو لطف و سرور اس کے سننے میں ہے وہ دنیا کی کسی موسیقی، کسی
سُر تال میں نہیں۔ جو نغمگی ایک مؤذن کے گلے میں ہوتی ہے وہ دنیا کے کسی عظیم ترین گلوکار
کے گلے کو نصیب نہیں۔ یہ کلام مالکِ کائنات نے خود اپنی مخلوقات کے لیے تجویز کیا ہے۔

بہت پہلے..... ''احمد حسن نے خواہش کا اظہار کیا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں بیٹی دے تو
میں اس کا نام عائش رکھوں گا۔ یہ نام تو میں نے کبھی نہیں سنا۔''

''یہ کوئی عام نام نہیں بڑا منفرد اور مقدس نام ہے عظیم ترین ہستی کی لازوال محبت کا
اظہار۔'' میں نے اپنے ساتھ سوئی ہوئی عائش کے ماتھے پر محبت سے بوسہ دیا جو سوتے میں
بالکل احمد جیسی دکھائی دیتی تھی میں نے اسے آئمہ حسن نہیں بلکہ عائش احمد بنانے کا عہد کر لیا
ہے ان شاء اللہ۔''

اب میں جان گئی ہوں کہ اللہ تعالیٰ جس سے پیار کرتا ہے اور جس کا بھلا چاہتا ہے اسے
ہی تنبیہ کرتا ہے۔ اس نے مجھے کبھی نہیں دھتکارا نہ مجھ پر اپنی عنایات کا سلسلہ بند کیا ہے اس کا
غضب مجھ پر برسنے سے پہلے ہی ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ میری ہمت بندھ جاتی ہے اور میں اس
کے دامنِ عفو میں پناہ ڈھونڈنے لگ جاتی ہوں۔ بے شک اس نے مجھے تنہا نہیں چھوڑا.....

ناول بہت مثبت اور بے شمار پند و نصائح لیے ہوئے ہیں۔ بہبودیٔ خواتین کا جھوٹا نعرہ،
محبت اور یوگا پر بڑی معلوماتی چیزیں ہیں۔ شگفتہ بھٹی مبارکباد کی مستحق ہیں۔

ثریا اسماء

مدیرہ ماہنامہ چمن بتول، لاہور

اظہارِ خیال

شگفتہ بھٹی ایک ممتاز ادیبہ اور معروف کالم نگار ہیں، شگفتہ ادب برائے عیش و تفریح کی بجائے ادب برائے مقصد کے نظریے سے متفق ہیں، وہ ادب کیا جو آوارہ خیالی پیدا کرے اور قارئین کو گمراہ کرے، ادب کو تو فرد اور معاشرے کی فکری تربیت اور حسن عمل کی ترغیبات پیدا کرنی چاہئیں، اس نقطہ نظر کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے شگفتہ بھٹی معاشرتی ناول لکھتی ہیں۔

شگفتہ بھٹی کا نیا ناول ''ہمدم'' پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی، اس سے قبل بھی ان کے کئی ناول شائع ہو کر اہل ذوق کو پسند خاطر ہو چکے ہیں۔ خصوصاً ان کا ناول ''زادراہ'' اب ان کی نئی تصنیف ''ہمدم'' منظر عام پر آئی ہے۔ یہ بھی ایک معاشرتی ناول ہے، ایک ایسا معاشرتی ناول جو اپنے اندر معنویت اور بھرپور تاثر رکھتا ہے۔ جس میں ہمارے گھرانوں کے ازدواجی مسائل و احوال کا تذکرہ ہے۔ ایسے احوال جو غلط فہمیوں، خوش فہمیوں اور بے دلیل و بے ثبوت باتوں سے وجود میں آتے ہیں۔ ایسے مسائل جو اکثر میاں بیوی کے درمیان معمولی سی بدگمانی سے پیدا ہوتے ہیں اور اکثر ان کا اختتام ''طلاق'' پر ہوتا ہے۔

شگفتہ کا ''ہمدم'' ہمارے معاشرے کی ان خواتین کے لیے نہایت سبق آموز ہے جو اپنے شوہروں پر اعتماد نہیں کرتیں۔ شگفتہ نے ازدواجی زندگی کے بے حد نازک مسئلے پر بڑی ہی بہادری مگر سمجھداری اور حکمت عملی سے قلم اُٹھایا ہے۔ ''فیملی پلاننگ'' کرنے والے شادی شدہ جوڑوں کے مسائل اور ان سے پیدا ہونے والی سنگینی کو بڑے ہی سلیقے سے بیان کیا ہے۔ اتنے نازک موضوع کو جسے اکثر ہمارے معاشرے میں موضوع گفتگو بنانے میں بھی ہچکچاہٹ محسوس کی جاتی ہے شگفتہ نے بڑی ہی ''حیاداری'' اور محتاط انداز میں پیش کیا ہے۔ شگفتہ کی یہ کاوش نہایت قابلِ تحسین ہے اور پڑھنے کے لائق ہے۔ ''ہمدم'' کا اندازِ تکلم انتہائی پُر اثر ہے، اگرچہ یہ ناول ایک مرکزی کردار ''آئمہ'' کے ہی گرد گھومتا ہے یہ خود کلامی پر مبنی ایک خوب صورت تحریر ہے مگر ''آئمہ'' اپنے عہد اور اونچے طبقے اور حلقے کی خواتین کی نمائندگی کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی ماں کی بہترین

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تربیت اور اپنے نیک خون کی پاسداری بھی بڑے ہی توازن کے ساتھ کرتی دکھائی دیتی ہے۔

''ہمدم'' کی کہانی کا مرکزی خیال بڑا ہی جاندار ہے، یہ ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو ہمارے آزاد خیال معاشرے کی وہ عورت ہے جو خواتین کے حقوق کی علمبردار تو ہے مگر اپنے ازدواجی فرائض سے غافل اور بے بہرہ دکھائی دیتی ہے۔ ''ہمدم'' کا مرکزی کردار ''آئمہ'' ایک ایسی عورت ہے جسے شادی کے بعد بھی اپنا حُسن، جوانی اور سوشل ورک، اتنا عزیز ہوتا ہے کہ وہ ''اولاد'' جیسی نعمت کو اپنے لیے خواہ مخواہ کی اُلجھن اور اپنی مصروفیات میں رکاوٹ تصور کرتی ہے، لہٰذا وہ بچے پیدا کرنے اور ماں بننے جیسی عظمت کو دقیانوسی اور بے کار جاننے لگتی ہے، چنانچہ جان بوجھ کر اپنے اس فرض کی ادائیگی سے گریز کرتی رہتی ہے، جبکہ اس کے شوہر ''احمد حسن'' کے دل میں اولاد کی خواہش دن بہ دن شدید ہوتی جاتی ہے، آخر کار اس کے سسرال اور میکے میں اس بات کو لے کر چہ میگوئیاں ہونے لگتی ہیں، دھیرے دھیرے یہ چہ میگوئیاں سنجیدہ گفتگو بن جاتی ہیں اور پھر ہر جگہ ''آئمہ'' موضوع گفتگو بن جاتی ہے۔ اس کا حُسن اس کی دولت اور شہرت کچھ بھی اس کے لیے لوگوں کی کٹیلی باتوں اور طنزیہ نظروں کے سامنے ڈھال نہیں بن سکتے۔ کوئی کہتا ''یہ تو بنجر زمین ہے۔'' کبھی اس کے کانوں میں ایسی آوازیں پہنچتیں کہ ''اس بہار کا کیا فائدہ جس میں گل کھلیں نہ کونپلیں پھوٹیں۔'' آئمہ کی ماں سمجھاتی تھی ''بیٹی اگر عورت جوانی میں ماں نہ بنے تو پھر اس کے حُسن و جوانی کو دیمک لگ جاتی ہے عورت کی زندگی تو بچوں کے وجود سے ہی تعبیر پاتی ہے۔'' ''بیٹی'' یہ تم جیسی ماڈرن لڑکیاں اپنے ساتھ کیسا ظلم کرتی ہو جو بچوں کے معصوم وجود اپنی کوکھ میں پالنے کی بجائے فیملی پلاننگ کا مسلسل زہر اپنی رگوں میں اُتارتی ہو۔'' کبھی اس کی ساس سمجھاتی کہ ''تم آج کل کی لڑکیاں یہ بات کیوں نہیں سمجھتی ہو کہ ہمارے جسم کے ہر عضو کے ذمے اللہ تعالیٰ نے کچھ کام فرض کر دیئے ہیں، لہٰذا ہر عضو کو کام کرنا چاہیے اگر کوئی عورت اپنے جسم کو اس کے مقصدِ تخلیق ہی سے محروم رکھے گی تو اس کا سارا جسمانی نظام نہ صرف زنگ آلود ہو کر رہ جائے گا بلکہ دوسری طرف اس کی پوری شخصیت بے کیفی، محرومی اور شکست کا شکار ہو جاتی ہے۔''

غرض شگفتہ نے عورت کے مقصدِ تخلیق کو نہ صرف قرآن و سنت کے حوالے سے واضح کیا ہے بلکہ ایک عورت کے جسمانی نظام کی پیچیدگیوں کو سائنسی نقطہ نظر سے بھی بڑی خوب صورت الفاظ گری میں سمجھایا ہے جو یقیناً آج کی آزاد خیال ''عورت'' کے لیے سبق آموز ہے۔ شگفتہ کا انداز تحریر سادہ، آسان اور نہایت خوب صورت ہے وہ الفاظ کی جادوگری سے قاری کو اپنے ساتھ اتنی محبت سے باندھ لیتی ہیں کہ پھر اس کا قاری اس کی پوری تصنیف کو

ایک ہی نشست میں پڑھ لینے کا حریص نظر آتا ہے۔ ''ہمدم'' میں ایک چیز جو پوری کہانی میں ''رگوں میں لہو'' کی طرح گردش کرتی دکھائی دیتی ہے وہ ایک عورت کا مافی الضمیر ہے یعنی اس کا نفس'' جسے شگفتہ نے بڑے خوب صورت انداز میں ایک معمولی سے کانٹے کی پھانس سے تشبیہہ دی ہے۔ یہ پھانس آئمہ جیسی ماڈرن اور آزاد خیال عورت کے پاؤں کے تلوے سے چبھ کر اس کے رگ و پے میں اُتر جاتی ہے اور پوری کہانی میں یہ ''پھانس'' اس کے لہو کو رگیدتی رہتی ہے ''یہاں تک کہ دین سے دور آئمہ'' اپنے رب کو پہچاننے لگتی ہے وہ جو عمر بھر اپنے بے حد چاہنے والے شوہر پر زعم کرتی ہے ایک وقت آتا ہے کہ اسی محبوب کی جانب سے سخت ذہنی اذیت اُٹھاتی ہے اور تب وہ جانتی ہے کہ اس کا دراصل ''ہمدم'' کون ہے۔

المختصر ''ہمدم'' ایک ایسی بیوی کی آپ بیتی ہے کہ جو اپنی نادانیوں کے باعث اولاد پیدا کرنے کے ہنر سے محروم ہوتی دکھائی دیتی ہے مگر وہ بڑی ہی چالاکی سے اس کا الزام اپنے شوہر پر لگا کر اس کی اہلیت کو اسی کی نظر میں مشکوک کر کے رکھ دیتی ہے، بلاشبہ وہ دوہرے جرم کا ارتکاب کرتی ہے اور یہ بھید کھلنے سے لے کر کہانی کے اختتام تک قاری ایک تجسس کی بڑی نرم سی ڈور سے بندھ کر رہ جاتا ہے جو قاری کے دل و دماغ کے گرد کچھ اس طرح سے لپٹ جاتی ہے کہ قاری اپنے شوق کے ہاتھوں مجبور ہو کر کہانی کو ختم کر کے ہی دم لیتا ہے۔ خود میں اسی کیفیت سے دوچار رہا اور کہانی ختم ہونے کے بعد بھی تادیر مجھ پر یہ سحر طاری رہا۔

شگفتہ کی پہلی تصانیف کی طرح ''ہمدم'' بھی ایک اصلاحی معاشرتی ناول ہے، جو اس بنیادی نقطے پر مرکوز ہے کہ انسان کو فطرت کے اصول و قوانین کے تحت زندگی بسر کرنی چاہیے۔ جب بھی کوئی شخص فطرت کے اصول و قوانین کے خلاف قدم اُٹھاتا ہے تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔

شگفتہ کو آج کے دور کی ادبیات میں یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ وہ ''زندگی'' میں خصوصاً عورت کے حقیقی مسائل پر نہ صرف قلم اُٹھاتی ہیں بلکہ انہیں ہاتھ پکڑ کر بڑی محبت سے ان مسائل سے آزادی کا راہ بھی دیتی ہیں۔ وہ ادب برائے زندگی اور زندگی برائے بندگی کی قائل ہیں اور ہم سب کے فکر و عمل کی راہنمائی کرتی ہیں۔ ''ہمدم'' ہماری بیٹیوں کے لیے لازم مطالعہ ہے تاکہ وہ جب کسی کی بیویاں بنیں تو انہیں اپنے فرائض یاد ہوں اور وہ اپنے مقصدِ تخلیق سے غافل نہ ہوں۔ مجھے امید ہے کہ شگفتہ کا یہ تخلیقی سفر جاری رہے گا جس سے معاشرہ اصلاح پاتا رہے گا۔

ڈاکٹر عاصی کرنالی

ملتان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''میری نظر میں''

داستان، حکایت یا کہانی وغیرہ سننے کی روایت ہم انسانوں میں بہت قدیم زمانے سے ہے۔ افسانہ اور ناول بھی اسی قصہ کہانی کی ارتقائی شکل میں اردو ادب کی تشکیل وتعمیر میں مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین کا بھی کافی حصہ رہا ہے۔ اس ضمن میں خواتین کی پہلی اردو ناول نگار ''رشیدۃ النسا'' ہیں جن کا ''اصلاح النساء'' کے نام سے پہلا ناول شائع ہوا۔ یہ 1881ء کی بات ہے پھر اس کے بعد سے لے کر شعروادب کی دنیا میں نام کمانے کے لیے خواتین پیش پیش رہیں۔ یہاں تک کہ بعض مرد حضرات بھی خود ناول لکھ کر کسی خاتون کے فرضی نام سے شائع کیا کرتے۔ اس سے بھی خواتین ناول نگاروں کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

شگفتہ بھٹی بھی ناول نگار خواتین کی صف میں ایک نمایاں نام ومقام رکھتی ہیں۔ پانچویں کلاس میں تھیں جب روزنامہ ''جنگ'' کے بچوں کے صفحات پر ان کی پہلی کہانی شائع ہوئی۔ اس وقت کا چلا قلم رکا نہیں، تھما نہیں بلکہ مسلسل رواں دواں ہے۔ قارئین کے لیے حصولِ عمل کا نشان ہے۔

ویسے عجیب اتفاق ہے کہ بچپن میں روزنامہ ''جنگ'' سے قلمی سفر کا آغاز آنے والی شگفتہ آج تک حالتِ جنگ میں ہے۔ معاشرتی بُرائیوں کے خلاف جنگ..... بدعات کے خلاف جنگ..... بے حیائی و بے باکی کے خلاف..... تخریب و انتشار کے خلاف اور..... اور غیر اخلاقی اقدار کے خلاف جنگ۔

شگفتہ نے افسانے کا آغاز 1987ء میں کیا اور اس شان سے کیا کہ اب تک بہترین افسانہ نگاری پر تین گولڈ میڈل حاصل کر چکی ہیں۔ کئی ایک انعامی مقابلے جیت چکی ہیں۔ کالم نگاری کی طرف متوجہ ہوئیں تو اس میدان میں بھی کئی ایوارڈز لے کر اپنا لوہا منوا لیا۔ وہ روزنامہ ''نوائے وقت'' (ملتان ایڈیشن) کی باقاعدہ کالم نگار بھی ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ کئی

خوب صورت، تعمیری و اصلاحی ادب کے حامل ناول لکھ کر قارئین کے ایک وسیع حلقے سے داد وتحسین وصول پا چکی ہیں گویا بچپن میں قلم پکڑنے والی شگفتہ سی شگفتہ کا قلمی سفر آج بھی جاری ہے۔ بغیر کسی اکتاہٹ کے..... بغیر کسی تھکاوٹ کے اور الحمدللہ یہ ارتقاء کا سفر ہے۔

خواتین کے کافی سارے ماہناموں مثلاً ماہنامہ ''بتول'' ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ، پاکیزہ، شعاع اور کرن وغیرہ میں لکھنے والی ہماری یہ بہن عمدہ افسانوں کی ایک پہچان ہیں۔ کالم، افسانہ، ناول سب کچھ بڑی سہولت سے..... بڑی قدرت سے اور بڑی نفاست سے سپردِ قلم کرتی ہیں اور قارئین سے ڈھیروں داد پاتی ہیں۔ ڈھیروں دعائیں لیتی ہیں۔ ان کا ناول ''زادِ راہ'' ایسا زبردست تھا کہ بہت ساری ماؤں نے خود پڑھنے کے بعد اپنی بیٹیوں کو بھی پڑھایا اور کئی ایک نے تو اسے ایک سے زائد دفعہ پڑھ کر لطف اُٹھایا۔ ''زادِ راہ'' جیسے مقبول ناول کی داد وتحسین سمیٹنے سے شگفتہ ابھی فارغ بھی نہ ہوئی ہوں گی کے ساتھ ہی ''ہمدم'' قارئین کو پیش کر دیا ہے ماشاءاللہ۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

''ہمدم'' ایک ایسی خوب صورت اور طویل کہانی ہے جو قاری کو غیر محسوس انداز میں ایک عارضی ''ہمدم'' سے حقیقی ''ہمدم'' کی طرف لے جاتی ہے یہ غرور وتکبر کی شکست کی کہانی ہے۔ خودسر اور انانیت کی شکار ایک عورت کی کہانی ہے جسے آخر کار سچائی، عاجزی اور زمانہ درازی کے دامن میں ہی پناہ ملتی ہے۔ امان ملتی ہے۔

''ہمدم'' مجاز سے حقیقت کی طرف سفر کی کہانی ہے..... یہ کہانی ہے جھوٹ سے سچائی کی طرف لٹنے کی..... دھوکا دہی سے اعترافِ جرم کرنے کی..... تکبر سے عاجزی..... اور راہِ اضطراب سے شاہراہِ سکون کی طرف پلٹ جانے کی۔

''ہمدم'' ایک ایسی لڑکی کی داستان ہے جو ہم سا ہو تو سامنے آئے، جیسی خود پسندی میں گوڈے گوڈے ڈوبی ہوئی ہے پھر حالات اور واقعات اسے اپنی ذات کی نفی جیسی روحانی منزل پر لا کر اسے ایک ایسے ہمدم کے آگے ڈھیر کر دیتے ہیں جس کی دم سازی اور ہمدمی کے آگے بڑے سے بڑا غم بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا اور تب یہ خودسر وخودستائش لڑکی فی الواقعی سربلند ہو جاتی ہے۔ بڑے سے بڑے دکھ اور اسے ناورا ہو کر اصلی اور بڑی خوشی کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے۔ ارتقائی سفر کی یہ داستان پڑھنے سے تعلق تی ہے۔ ناول میں واقعات فطری انداز میں آگے بڑھتے ہیں۔ خودکلامی کا انداز اپنے اندر گہرائی اور برائی سمیٹے ہوئے ہے۔

جرنلزم اور پولیٹیکل سائنس میں ماسٹر کی ڈگریاں رکھنے والی شگفتہ بھٹی ''ہمدم'' میں ایک ماہر نفسیات روپ میں سامنے آئی ہیں ان پر اللہ رب العالمین کا خاص کرم ہے کہ وہ نہایت اہم موضوعات پر ایسے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دلکش انداز میں قلم اٹھاتی ہیں کہ خاندان کے ہر فرد کو روشنی فراہم کرتی ہیں..... شعور و آگہی کی روشنی..... پُرسکون زندگی کی روشنی..... قلب مطمئن کی روشنی۔ یہی وجہ ہے کے ان کے ناول خاندان کے ہر فرد کے لیے ہوتے ہیں بیٹی، بہو، ساس، شوہر ہر کسی کو راہِ عمل فراہم کرتے ہیں۔ گویا شگفتہ بھٹی کے ناول تکیے کے نیچے چھپائے نہیں جاتے بلکہ بچوں کے ہاتھوں میں تھمائے جاتے ہیں۔

شگفتہ کے فن میں سادگی، اخلاص، پاکیزگی اور خوبصورتی ہے۔ ان کی تحریر میں ایک درد مند اور انسانیت سے محبت کرنے والا اور اسلامی اخلاق پر فریفتہ دل دھڑکتا ہے۔ شگفتہ بھٹی کا اندازِ بیان دلکش ہے۔ ان کی نثر میں شاعرانہ حُسن ہے..... انسانی رویوں پر ان کی گہری نظر ہے..... جاندار مکالمے لکھنا جانتی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ بناوٹ، تصنع اور سستے مکالموں کے بغیر شائستہ انداز میں بامقصد مگر دلچسپ اور خوب صورت کہانی کہنا ایک آرٹ ہے اور شگفتہ کو اس کا ملکہ بخوبی حاصل ہے۔

فرزانہ چیمہ
ڈپٹی چیف لائبریرین
پنجاب یونیورسٹی
قائداعظم کیمپس، لاہور

میں آئینے کے سامنے کھڑی اپنا بھرپور جائزہ لے رہی تھی۔ گلابی رنگ کے کامدار قیمتی لباس میں ملبوس گلے میں ہیروں کا نازک سا نیکلس پہنے..... کانوں میں میچنگ ٹاپس، ہاتھوں میں کئی انگوٹھیاں، دونوں کلائیوں میں کنگن، اپنی سُرخ و سپید رنگت کے ساتھ جدید طرز کے میک اَپ سے آراستہ۔ میں آئمہ حسن..... آج بھی ویسی ہی حسین اور ساحرانہ دکھائی دے رہی تھی جیسی اپنی نوجوانی میں دکھائی دیتی تھی۔ اگرچہ آج میں اپنی عمر کے اڑتیسویں سال میں قدم رکھنے جا رہی تھی مگر کوئی مجھے پچیس سے زیادہ کا ہرگز نہ سمجھتا تھا۔ میں نے ایک بار پھر بڑے فخر سے خود پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی۔ میں اطمینان کرنا چاہتی تھی کہ میں واقعی آج بھی اتنی ہی جوان ہوں اور پُرکشش بھی۔ قدِ آدم آئینے کے مزید سامنے ہو کر میں نے اپنے چہرے پر ایک گہری سی نظر ڈالی کہ کہیں وقتِ گذشتہ کے قدموں کے کچھ نشان تو کسی ناگوار لکیر کی صورت نہیں ٹھہر گئے۔ میرے چہرے کی جلد آج بھی تروتازہ تھی..... بے شکن اور چمک دار..... میک اَپ کی ہلکی سی تہہ اور غازے کے نیچے، آنکھوں کے حلقوں میں، ٹھوڑی سے نیچے، گردن کے اطراف میں، کہیں بھی میری فکرمندی کے لیے کچھ علامات نہ تھیں۔ اور ہوتیں بھی کیونکر..... میں بڑی باقاعدگی سے شہر کے سب سے بڑے اور مہنگے بیوٹی پارلر سے اسکن اٹنگ اور فیس لفٹنگ کے مساج اور فیشل لیتی تھی۔

اپنے چہرے کے حسن سے مطمئن ہو کر میں نے آئینے میں اپنے قدِ بُت کا جائزہ لیا۔ ں آج بھی سِلم اسمارٹ تھی۔ ہر طرز اور تراش خراش کا لباس مجھ پر جچتا تھا۔ میں نے پھر خود کو تعریفی نظروں سے دیکھا اور اطمینان بھری مسکراہٹ کے ساتھ پلٹنے لگی۔ ارے میرے بال۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں دوبارہ سے پلٹی اور آئینے کے قریب ہو کر اپنے بالوں کو دیکھنے لگی۔ میرے جدید انداز میں ترشے اور اسٹریکنگ ہوئے بالوں میں بے شمار بال ایسے تھے جو سفید ہو چکے تھے اور باقی تیزی سے ہو رہے تھے.....

''یہ دیکھو وقت کے پاؤں.....'' میرے دل میں کسی نے چٹکی لی۔

''اُوں ہوں۔ یہ وقت کے پاؤں تھوڑا ہی ہیں۔ یہ تو کیمیکل سائڈ افیکٹس ہیں یعنی یہ جو میں آئے دن اپنے بالوں کو مختلف شیڈز میں ڈائی کرواتی رہتی ہوں یہ تو اِس کی وجہ سے ہو گئے ہیں۔ ویسے بھی آج کل بالوں کے سفید ہونے کا عمر سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی کوئی اس کا نوٹس لیتا ہے۔ وہ زمانہ گیا جب عورت کے بالوں میں ایک بھی چاندی کا تار چمکتا تھا اور وہ خود کو ادھیڑ عمر سمجھنے لگتی تھی۔ اب تو خواتین فیشن میں بھی اپنے بالوں کو مٹیالے رنگ میں رنگوا لیتی ہیں اور اعتماد سے جیتی ہیں، میں نے خود کو وضاحت پیش کر کے مطمئن کیا۔ اور پھر اڑتیس سال بھی کوئی عمر ہے۔ میں نے اپنے ذہن کو جھٹکا جس میں خواہ مخواہ ہی بال آ گیا تھا۔ یہ بال آئینے پر پڑا ہو یا ذہن پر، اچھے بھلے عکس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔

آئمہ حسن دیکھو..... سنو! تم ابھی حسین ہو..... جوان ہو زمانہ تمہاری قدر کرتا ہے..... اور تمہارا شوہر آج بھی تمہیں دیکھ دیکھ کر جیتا ہے۔'' میں نے خود کو مخاطب کر کے اپنی سائیکو تھراپی کی۔

''آئمہ! بھئی جلدی کرو ہمیں پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔'' احمد حسن یہ کہتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے اور مجھے دیکھتے ہی مبہوت ہو گئے۔

انہیں یوں اپنی طرف دیکھتا پا کر میں سمجھ تو گئی کہ وہ میرے حسن سے مرعوب ہو کر چپ ہو گئے ہیں پھر بھی میں نے انجان بنتے ہوئے ذرا نخوت سے کہا۔

''اب چلیں بھی، کہاں کھو گئے.....؟''

وہ جیسے چونکے۔ ''ہاں ہاں چلو باہر اماں نے شور مچا رکھا ہے۔''

''اماں؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی میرے ماتھے پر بَل اور زبان پر نمک آ گیا۔

''ہاں وہ ماجد بھائی نے وہاں جلدی پہنچنا تھا اِس لیے وہ لوگ نکل گئے۔ اماں ہمارے ساتھ چلیں گی۔'' احمد حسن نے شاید میرے ماتھے کا بَل دیکھ لیا تھا اس لیے ذرا

سے ہو کر بولے۔

''اچھا ٹھیک ہے'' میں نے کچھ نخرے سے جواب دیا۔

''ویسے آج تم بے حد اچھی لگ رہی ہو'' احمد حسن نے میرا موڈ ٹھیک رکھنے کے لیے بات بدلی۔

میری گردن کچھ اور تن گئی۔ میں کمرے سے باہر آئی تو اماں وہیں برآمدے میں مل گئیں وہ ہمیں بلانے ہی آ رہی تھیں۔

''السلام علیکم اماں!'' میں نے انہیں دیکھتے ہی سلام کیا اور نادانستہ ہی میرا ہاتھ اپنے دوپٹے کی طرف بڑھ گیا جسے میں نے سر پر رکھنے کی کوشش کی تھی۔

''وعلیکم السلام جیتی رہو'' انہوں نے مسکراتے ہوئے مجھے دُعا دی حالانکہ اُن کی نگاہیں سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لے رہی تھیں۔

''آئیں اماں.....'' میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اُنہیں گاڑی میں بیٹھنے کی دعوت دی۔ ہم لوگ برآمدے سے نکل کر پورچ میں آ چکے تھے جہاں ہمارا ڈرائیور اسلم پہلے سے ہی گاڑی کے دروازے کھولے مؤدبانہ انداز میں ہمارا منتظر تھا۔

''خوش رہو'' اماں نے اسلم کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اُسے دُعا دی اور گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ ''اسلم میاں آج تم رہنے دو میں خود گاڑی ڈرائیو کروں گا۔ تم آرام کرو اور چوکیدار کے ساتھ گپیں لگاؤ'' احمد حسن نے اسلم سے گاڑی کی چابی لیتے ہوئے کہا۔ میں نے جب احمد حسن کو ڈرائیونگ سیٹ پر آتے دیکھا تو میں بھی فرنٹ پر احمد کے برابر آن بیٹھی۔

''چلو بیٹا..... وقت تو دیکھو بارات تو آ گئی ہو گی اور ہم لوگ ابھی تک یہاں ہیں۔''

اماں ذرا خفگی سے بولیں تو احمد حسن جو مجھے کنکھیوں سے دیکھ رہے تھے فٹافٹ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ اگلے چند لمحوں میں ہماری گاڑی سبزہ زار کی طرف رواں تھی جہاں احمد حسن کی چچازاد بہن صوفیہ کی شادی کی تقریب ہو رہی تھی۔

❁❁❁

بارات آ چکی تھی اور اُن کا استقبال ہو رہا تھا اماں مجھے لے کر جلدی سے خواتین کی طرف آ گئیں۔ مجھے مسکرا مسکرا کر اجنبی خواتین کو سلام کرنا اور خوش آمدید کہتے ہوئے اُن کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گلے میں پھولوں کے ہار ڈالنا ہرگز بھی اچھا نہ لگ رہا تھا مگر اماں چونکہ میرے ساتھ جڑی کھڑی تھیں اور بار بار مجھے تنبیہی نظروں سے دیکھ بھی رہی تھیں اس لیے میں بادلِ نخواستہ ایسا کر رہی تھی۔ خدا خدا کر کے باراتی خواتین کا اندر آنے کا سلسلہ ختم ہوا اور میں اماں سے نظر بچا کر وہاں سے رفو چکر ہو گئی۔

''یہ اماں بھی بس میرے ہی پیچھے پڑی رہتی ہیں۔ میرے اخلاق سنوارنے کو ہی انہوں نے اپنی آخرت سنورنے کا ذریعہ کیوں سمجھ لیا ہے۔ آخر ثریا اور مائدہ بھی تو ہیں۔'' میں نے جل کر اپنی دیورانیوں کے بارے میں سوچا۔ ''ہونہہ..... ثریا اور مائدہ۔'' میرے اندر کی خود پسندی نے طنز کیا۔ ثریا اور مائدہ نہ صرف خوش شکل تھیں اچھے خاندانوں سے تھیں بلکہ بقول اماں کے بے حد سلیقہ شعار اور سلجھے ہوئے مزاج کی بھی تھیں۔ ''ہوں گی.....'' میں نے انہیں اور اُن کی خوبیوں کو نظر انداز کرنا چاہا۔ ''بھلا میرے حسن کے آگے ہے کسی کی مجال؟ آئمہ تو آئمہ ہے۔'' میں نے اپنے دوپٹے کو اِک ادا سے اپنے کندھوں پر ڈالا۔ ''اُف! کس قدر مشکل ہے زیادہ دیر تک دوپٹہ سر پر اوڑھے رکھنا اور پھر ساری پرسنالٹی کی مت ماری جاتی ہے۔ اچھے بھلے ہیئر اسٹائل کو ڈھانپ کر الگ اُس کا ستیاناس کرو۔ میں نے اِدھر اُدھر چوری نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنا دوپٹہ دونوں شانوں پر پھیلا کر سکھ کا سانس لیا کہ کہیں اماں تو مجھے نہیں دیکھ رہیں۔ شکر ہے اماں دولہا کی والدہ کے ساتھ محوِ گفتگو تھیں۔

میں آرام سے ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی۔ پتہ نہیں مجھے گہما گہمی کیوں اچھی نہیں لگتی تھی۔ میں ہمیشہ سے ہی تقریبات سے گھبرایا کرتی تھی۔ میں عام لوگوں میں بالکل بھی گھلتی ملتی نہ تھی۔ مجھے بس اپنا ایک حلقہ احباب اچھا لگتا تھا۔ اپنی سہیلیاں وہ بھی گنی چنی سی۔ یا پھر کلب کی ماہانہ گیدرنگ..... جس میں ہر بار کوئی نہ کوئی پارٹی ہوتی۔ کبھی کمیٹی پارٹی اور کبھی کلب کی طرف سے کسی کا عشائیہ، اعزاز یہ یا فیئر ول۔

ہمارا کلب نہ صرف شہر کی سطح پر بلکہ ملکی اور بین الاقوامی سطح پر رجسٹرڈ تھا اِس لیے وہ حقوقِ نسواں، انسانی حقوق اور سماجی بہبود و ترقی کے لیے خاصا سرگرم رہتا تھا۔ میں اپنے کلب کی صدر تھی اور یہ عہدہ گذشتہ کئی برس سے میرے پاس تھا۔ میں نے کلب کے لیے کام بھی تو بہت کیا تھا۔ میں اپنے اور اپنے کلب کی کارکردگی کے بارے میں سوچنے لگی۔ نہ صرف شہر بھر

میں بلکہ دیہی علاقوں میں بھی ہر سال تین بار پولیو کے خلاف مہم چلانا، صاف پانی کے لیے فلٹر لگوانا، خواتین میں روزگار کے لیے اسکیموں کا انعقاد، فنڈز کا اجرا اور چھوٹے پیمانے پر دستکاری کے کارخانے، ووکیشنل سینٹرز کا قیام اور اُن کی صحت اور حقوق کے بارے میں آگاہی کے پروگرام..... کتنے بے شمار کام تھے جو میں نے ہی شروع کروائے، ان کی باقاعدہ پلاننگ سے لے کر ان کے قیام تک میں نے کس قدر جان ماری کی تھی تب جا کر مجھے ایک مقام اور نام ملا تھا..... ''آئمہ احمد حسن.....'' میں نے تفاخر سے اپنا نام لیا..... اور اب میں ہر جگہ کی مہمانِ اعزاز تھی۔ کوئی دن ہی ایسا طلوع ہوتا جس کے اخبارات میں میری تصویر نہ چھپتی..... کسی سکول کی مہمانِ خصوصی، کسی سینٹر کا افتتاح کرتے ہوئے کہیں حقوقِ نسواں پر لیکچر دیتے ہوئے۔ میں کس قدر سوشل تھی۔ ہر وقت کہیں نہ کہیں گھری رہتی اور پھر بھی کہتی کہ میں تقریبات پسند نہیں کرتی، مجھے گہما گہمی سے الجھن ہوتی ہے۔ اور ایسا میں اپنے ہر میڈیا انٹرویو میں بھی کہتی تھی شاید یہ منافقت تھی۔

''منافقت اور میں..... نہیں نہیں..... میں تو اپنے ہر انٹرویو میں کہتی ہوں کہ مجھے جھوٹ سے نفرت ہے میں سچ بولتی ہوں اور سچ بولنے والوں کو پسند کرتی ہوں۔'' میں نے اپنے خیال کا اُٹھتا ہوا سَر وہیں پر کچل دیا۔ کوئی مجھے غلط کہہ دے مجھے یہ کہاں برداشت تھا چاہے وہ میری اپنی سوچ ہو۔ بے ساختہ خیال ہو یا پھر میرا ضمیر..... ضمیر..... یہ کیا ہوتا ہے.....؟ یہ تو بس فلسفیوں کی ڈھکوسلے بازی ہے اور بڑے بڑے قلمکاروں کا گھڑا ہوا ایک لفظ ہے جسے انہوں نے انسان کے کسی مخفی جذبے یا حِس کا نام دے دیا ہے۔ اور بقول انہی کے یہ ضمیر ہر ذی عقل کو اُس کے اچھے بُرے کی پہچان کراتا ہے اور اس کے عمل کی نگرانی کرتا ہے۔ بلکہ اسے بتاتا رہتا ہے کہ وہ کیا درست کر رہا ہے اور کیا غلط..... تو پھر یہ ''ضمیر'' تو نہ ہوا عقل ہی ہوئی۔ اور عقل تو انسان کو قدرت نے ودیعت کر دی ہے جو اس سے کام لے وہ عقل مند اور جو نہ لے نادان۔ بلکہ جاہل.....

پھر یہ تعلیم کیا ہے؟ علم کیا ہے؟ میں اپنے آپ سے بحث چھیڑ بیٹھی۔ مجھے کیا لینا دینا میں تو خود تعلیم یافتہ ہوں، عقل مند بھی ہوں لہٰذا باضمیر بھی یقیناً ہوں۔ مجھے کیا سر درد ہے جو میں ان معاملات کی وجہ سے ٹینشن لوں.....

میں نے اپنی کنپٹیاں دباتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا۔ میرا سر واقعی بوجھل ہو رہا تھا۔ یہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ٹینشن تو مجھے ذرا برداشت نہ ہوتی تھی۔ میں وہاں سے اُٹھ کر اس طرف آ گئی جہاں کولڈ ڈرنکس رکھی تھیں۔ میں نے ایک ٹھنڈی کوک اُٹھائی۔

''اوہیلو! میڈم۔'' کسی نے مجھے ہی پکارا تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ ایک اسمارٹ اور چارمنگ سی لڑکی تھی۔

''ہائے.....'' میں نے بھی نرمی سے مسکراتے ہوئے اُسے جواب دیا۔ ایسے موقعوں پر میں بے حد خوش اخلاق ہو جایا کرتی تھی۔ اور ایسے لوگوں کے ساتھ بھی جو میری شخصیت کی اصل پہچان کر کے میری طرف بڑھتے تھے۔

''میڈم آپ نے مجھے پہچانا نہیں شاید۔'' وہ لڑکی جس کے ساتھ اُس کی چار پانچ سہیلیاں تھیں یا شاید کزنز..... وہ مجھے کچھ یاد کروا رہی تھی۔

''اوہ سوری! میں نے واقعی آپ کو نہیں پہچانا.....'' میں کوک وہیں واپس رکھ کر اپنی کرسی کی جانب واپس جانے کو مڑی۔

''میڈم! کوک لیں ناں پلیز۔'' وہ لڑکی کوک اُٹھا کر میری طرف بڑھاتی ہوئی بولی۔ نو تھینکس، ٹھنڈی نہیں ہے.....'' میں نے بہانہ بنایا بلکہ نخرہ دکھایا۔ لڑکی نے کوک واپس رکھ دی اور میرے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی باتیں کرنے لگی۔ ''میڈم! میری آپ سے ملاقات پچھلے ہفتے ہی تو ہوئی تھی۔ وہ ایک دس سالہ بچی کو ''وَنی'' کیے جانے والے کیس پر سیمینار ہوا تھا پریس کلب میں..... وہاں۔''

''اوہ ہاں مجھے کچھ یاد تو آ رہا ہے..... آپ.....؟''

''میں بھی خواتین کی بہبود و ترقی سے متعلق تنظیم کی جنرل سیکرٹری ہوں۔'' اُس نے اپنی تنظیم کا نام بتایا۔

''اچھا..... اچھا..... ہاں۔'' میں نے یاد آ جانے کی ایکٹنگ کی۔

پھر وہ لڑکی جس کا نام مہرالنساء تھا اپنی کزنز سے میرا بھرپور تعارف کروانے لگی۔ یہ سب لڑکے والوں کی رشتہ دار تھیں اور میرے ساتھ آ کر بیٹھ گئی تھیں۔ مہرالنساء اُن کے سامنے میری اتنی تعریفیں کر رہی تھی کہ وہ سبھی مجھ سے مرعوب ہونے کے بعد اب تو میری شخصیت کی اِس قدر جامعیت اور حسن کے سامنے دبتی جا رہی تھیں اور پھر کیوں نہ دبتیں..... میں حسین تھی،

دولت مند تھی، تعلیم یافتہ تھی اور پھر سماج میں میرا ایک نام اور مقام تھا، شہرت خود میرے نام کے ساتھ جڑ کر خوش تھی۔

''آپ تو آئیڈیل ہیں نئی نسل کے لیے بلکہ رول ماڈل ہیں۔''

''ارے نہیں کہاں۔ آپ تو ایسے ہی تعریف کر رہی ہیں۔ یہ سب کام تو میں اپنا فرض سمجھ کر کرتی ہوں۔ آج کی عورت کو اپنے حقوق کا شعور دینا اور اسے یہ باور کرانا کہ وہ کمزور یا کم درجہ نہیں ہے بلکہ مردوں کے برابر اور بعض معاملات میں تو مردوں سے بھی اوّل ہے۔ یہی میری زندگی کا مقصد ہے۔ بس میں اپنے وطن کی عورتوں کو بین الاقوامی سطح پر کسی طرح سے بھی کم نہیں دیکھنا چاہتی۔''

میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگی۔ یوں باتوں کا اک سلسلہ چل نکلا۔ ''عورت سب کچھ کر سکتی ہے۔ اس کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں۔ مرد اسے کسی سطح پر کمزور کہہ کر مسترد نہیں کر سکتا۔'' میں نے اک ولولے سے کہا۔

''جی میڈم آپ بالکل درست کہہ رہی ہیں۔ ہمارا مطمحِ نظر یہی نصب العین ہے۔'' وہ ساری لڑکیاں یک زبان بولیں۔

''آئمہ بھابی! آپ یہاں بیٹھی ہیں۔'' اتنے میں مائدہ کہیں سے مجھے ڈھونڈتی ہوئی آ گئی۔ ''السلام علیکم.....'' اُس نے میرے اردگرد بیٹھی لڑکیوں کو مسکرا کر سلام کیا۔

''وعلیکم السلام.....'' مہرالنساء نے سب کی طرف سے جواب دیا۔

''بھابی! آپ کو اماں بلا رہی ہیں۔'' مائدہ نے اُن لڑکیوں کی طرف معذرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ایکسیوزمی پلیز۔'' میں نے اُن لڑکیوں سے معذرت کی اور مائدہ کے ساتھ جانے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس وقت مجھے مائدہ کا آنا ایک نعمت ہی لگا تھا دراصل میں اُن لڑکیوں کے سوالات کے جوابات دے دے کر تنگ آ گئی تھی اور خود جان چھڑانا چاہ رہی تھی۔

''او کے میڈم آپ سے پھر ملاقات ہوگی۔ بے حد اچھا لگا آپ سے مل کر..... یقین جانیں اتنی ذرا سی دیر میں ہم نے آپ سے بہت کچھ سیکھا ہے.....'' اُٹھتے اُٹھتے بھی مہرالنساء نے میری تعریف کرنا نہ چھوڑی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ارے نہیں میں کس قابل ہوں۔'' میں نے اُوپری زبان سے یہ فقرہ رسماً کہا حالانکہ میں تو اپنے سے زیادہ کسی کو قابل سمجھتی ہی نہ تھی۔ ویسے بھی اس وقت ان لڑکیوں کی وجہ سے مائدہ کے سامنے میری حیثیت کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

''آج تو آپ بہت ہی حسین لگ رہی ہیں؟'' مائدہ نے کھلے دل سے میری تعریف کی۔

''کیا مطلب ہے؟ میں ویسے حسین نہیں ہوں؟'' میں نے ذرا بنتے ہوئے کہا۔

اس پر وہ زور سے ہنسی۔

''وہ تو آپ ہیں ہی۔ مگر یہ بناؤ سنگھار چار چاند جو لگا دیتا ہے۔'' وہ مجھے سر سے پاؤں تک دیکھ رہی تھی۔

''اچھا تم بھی کچھ کم نہیں ہو۔'' میں نے یونہی کہہ دیا۔

''بس اللہ کا شکر ہے ورنہ آپ کا کیا مقابلہ۔''

میں نے دیکھا تھا مائدہ بڑے صاف دل اور سہولت کے ساتھ میری تعریف کیا کرتی تھی۔ اُسے مجھ سے کوئی جلن محسوس نہ ہوتی تھی۔ نہ میرے حسن سے نہ شہرت سے اور بالکل اِسی طرح سے ثریا بھی تھی۔ میں اکثر سوچتی کہ یہ دونوں آخر کس قسم کی عورتیں ہیں انہیں مجھ سے کبھی حسد نہیں ہوتا۔ یہ کبھی میرا مقابلہ کرنے کی کوشش بھی نہیں کرتیں۔ جب ملتی ہیں وارفتگی سے ملتی ہیں۔ خود میری تعریف دوسروں کے سامنے کرتی ہیں۔ اور میں..... مَیں جو اِن سے ہر لحاظ سے خود کو بہت بہتر اور مکمل سمجھتی ہوں پھر بھی مجھے ان کی طرف سے خطرہ کیوں رہتا ہے؟ مجھے یہ خوف کیوں رہتا ہے کہ کہیں ان کی اہمیت مجھ سے زیادہ نہ ہو جائے۔ کہیں یہ مجھ سے بازی نہ لے جائیں۔

میں اپنے تحت الشعور میں آنے والی سوچ کو جھٹک نہ سکی۔ میں نے دوبارہ سے اپنے ساتھ چلتی ہوئی مائدہ کو دیکھا۔ اُس کے چہرے پر بڑی ہی پُرسکون سی مسکراہٹ تھی اور وہ میری طرف سے بالکل لاپرواتھی۔

ہم دونوں اسٹیج کے قریب آ گئیں جہاں خواتین کا اچھا خاصا رش تھا۔ صوفیہ بیوٹی پارلر سے تیار ہو کر آ چکی تھی اِس لیے لڑکیوں کا ایک ہجوم اسٹیج پر موجود تھا جو بڑے اشتیاق سے اُسے دیکھ رہی تھیں۔

''آؤ آئمہ!'' اماں نے مجھے دیکھ کر اپنے پاس بلایا۔ ''نادرہ! یہ میری منجھلی بہو ہے۔'' وہ میرا تعارف کسی خاتون سے کروا رہی تھیں جو دیکھنے میں بڑی بارعب اور جاندار شخصیت کی مالک تھی۔

''اچھا..... احمد حسن کی بیوی.....'' وہ مجھے دیکھ کر ذرا مسکرائی۔ ''ہاں احمد حسن کی بیوی..... اور آئمہ یہ تمہاری پھوپھی ساس لگتی ہیں حسن صاحب کی خالہ زاد بہن ہیں۔ مدت سے کینیڈا میں مقیم ہیں اب کوئی بیس بائیس برس کے بعد پاکستان آئی ہیں جب جوان پوتے نواسوں والی ہو گئیں تو.....'' اماں نے اپنی ایک عدد نند اور احمد کی پھپھو کا تفصیلی تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

''ماشاءاللہ یہ بہو تو تمہاری چاند کا ٹکڑا ہے۔'' نادرہ آنٹی نے میری تعریف کی۔

''ہاں اللہ نظرِ بد سے بچائے۔'' اماں نے محبت بھری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا جس سے میرے اندر ایک طمانیت کا احساس بھر گیا۔ ''اچھا! احمد حسن کے کتنے بچے ہیں؟'' نادرہ آنٹی نے ایک دم سے پوچھ لیا۔ ''اِسی طرح کے خوبصورت ہوں گے اور احمد بھی تو ماشاءاللہ بہت خوبصورت ہے۔ بچے تو لازمی پیارے ہوں گے۔'' وہ اِدھر اُدھر کچھ تلاشتی ہوئی بولیں۔

''احمد کے بچے نہیں ہیں۔'' اماں کی چمکتی آنکھیں جیسے یہ کہتے ہوئے بجھ سی گئیں۔

''کیا مطلب بچے ہوئے ہی نہیں یا.....؟'' وہ یا کو ذرا لمبا کرتے ہوئے بڑے تجسس سے کریدنے لگیں۔

''بس اللہ کی مرضی.....'' اماں نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

''تو کیا ڈاکٹر کو نہیں دکھایا..... کچھ علاج وغیرہ نہیں کرایا.....؟''

نادرہ آنٹی تو پوری پوری تحقیق کرنے لگیں..... اور میں جانے کیوں شرمندگی سی محسوس کرنے لگی۔ مجھے اُن کا یہ پوچھنا نہ صرف بُرا لگ رہا تھا بلکہ یہ سب میرے لیے بے حد تکلیف دِہ بھی تھا۔

''ڈاکٹر کو تو دکھاتی رہتی ہے۔ اب مسئلہ کیا ہے..... یہ اسے معلوم یا پھر خدا کو.....

''ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے اماں.....'' مین نے فٹ سے اماں کے سوال کا جواب دیا کہ مبادا وہ آگے کچھ اور نہ کہہ دیں۔

''تو پھر فیملی پلاننگ چل رہی ہو گی؟'' اب اماں کی بجائے نادرہ آنٹی کا سوال تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دونوں کی چبھتی ہوئی نظریں مجھ پر گڑی تھیں جس سے میں بوکھلا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

''اللہ ہدایت دے ہماری آج کل کی بہو بیٹیوں کو جو نئی تہذیب کی چکا چوند میں جکڑی جا رہی ہیں۔'' مجھے چپ پا کر نادرہ آنٹی نے بات کو آگے بڑھایا۔ ''دیکھو بیٹی! اگر اولاد میں اتنی تاخیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگئی ہے تو خیر ہے۔'' نادرہ آنٹی نے مجھے سمجھانے کے لیے اپنا پند و نصائح والا پٹارہ کھولا اور میں سوچنے لگی یہ اِس قدر ماڈرن اور تعلیم یافتہ نظر آنے والی عورت جس کی ظاہری شخصیت کے سحر میں مَیں کچھ لمحے جکڑی گئی تھی..... ہونہہ..... یہ بھی اندر سے اتنی ہی دقیانوسی ہے جتنی یہ ہماری اماں جان.....

میں نے احمد حسن کی والدہ پر ایک طنزیہ سی نظر ڈالتے ہوئے سوچا۔

''اللہ کے گھر میں دیر ہو سکتی ہے۔ کچھ اُس کی مصلحت ہوگی۔ مگر ہم لوگ جان بوجھ کر مشیتِ الٰہی اور قوانینِ فطرت کے خلاف چلیں..... یہ بہت بُرا عمل ہے۔'' وہ میرا ہاتھ تھامے تھامے مجھے لان کی اس طرف لے آئیں جہاں مہمانوں کی زیادہ ریل پیل نہ تھی۔ اماں جان بھی اُن کے ساتھ ساتھ تھیں۔ اگر نادرہ آنٹی نے مجھے ہاتھوں میں ہاتھ لے کر پکڑ رکھا تھا تو ''اماں جان'' کی نگاہیں بھی مجھ پر گرفت کیے ہوئے تھیں۔

اُف میرے خدایا! میں کہاں پھنس گئی۔ میں نے ناچار کرسی پر بیٹھتے ہوئے دل ہی دل میں اپنی خیر مانگی۔

''تم میری بات کا مطلب تو سمجھ رہی ہو ناں؟'' نادرہ آنٹی نے مجھ سے تصدیق چاہی۔

''جی آنٹی!'' میں نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

''اچھی بات ہے۔'' وہ دھیمے سے مسکرائیں۔

''میری بہو بڑی سمجھدار ہے نادرہ!'' اماں نے محبت پاش نظروں سے مجھے دیکھا۔

''ماشاء اللہ کہو رشیدہ.....'' نادرہ آنٹی نے بھی میری طرف پیار سے دیکھا۔ اِتنے میں وہاں کچھ اور رشتہ دار خواتین بھی آ گئیں اور میری جان اُس موضوع سے چھوٹ گئی۔ میں اُن بزرگ خواتین کو آپس میں خاندانی مسائل پر باتیں کرتا چھوڑ کر وہاں سے کھسک گئی۔

❁❁❁

اُس رات گھر واپس آ کر بھی میرا موڈ خاصا خراب ہی رہا۔ مجھے بار بار نادرہ آنٹی کی

نظروں کی تپش محسوس ہوتی رہی۔ وہ جیسے مجھے سر سے پاؤں تک کھوج رہی تھیں لگتا تھا میری اسمارٹنیس کا مذاق اُڑا رہی ہوں۔ اور وہ اُن کی حسرت و یاس سے بھری ''ہائے'' جب انہوں نے مجھ پر ایک گہری نظر ڈالتے ہوئے کہا تھا۔ ''ہائے..... کتنے افسوس کی بات ہے کہ تم ابھی تک محض ایک بیوی ہو۔ ''ماں'' نہیں بنیں۔'' کیا تھا اُس وقت اُن کی اس ایک نگاہ میں افسوس، یا رحم..... یا پھر وہ مجھ پر ترس کھا رہی تھیں۔ ترس مگر کیوں؟ مجھے اپنی بے عزتی سی محسوس ہوئی۔

''ہونہہ..... مائی فٹ.....'' میں نے غصے سے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہیئر مساجر ذرا زور سے ڈریسنگ ٹیبل پر پٹخا۔

''کیا ہوا آئمہ؟ کیوں غصہ کر رہی ہو.....'' احمد حسن جو ٹی وی پر کوئی کرکٹ میچ دیکھ رہے تھے میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولے۔

''احمد! یہ آپ کی نادرہ آنٹی ہیں کیا چیز.....؟'' میں اُسی طرح غصے میں تنی احمد کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا.....؟'' وہ کچھ نا سمجھتے ہوئے پوچھنے لگے۔

''بڑی مغرور سی ہیں اور اپنی دولت مندی پر بڑا پوز کرتی ہیں۔''

میں نے اپنا غصہ اُتارنے کے لیے اُن کی بدتعریفی کی۔ شاید اس طرح میں اپنی اس جلن کو کم کرنا چاہ رہی تھی جو مجھے اُن کی چبھتی ہوئی نگاہوں اور اس تیکھے سے جملے کی وجہ سے ابھی تک ہو رہی تھی۔

''نادرہ آنٹی اور غرور.....؟ تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' انہوں نے بڑے آرام سے میری بات کی تردید کر دی جس پر مجھے اور بھی غصہ آ گیا۔

''مجھے غلط فہمی نہیں تمہیں اُن کے بارے میں خوش فہمی ہے شاید.....''

میں نے بھی اپنا نقطہ نظر ماند نہ پڑنے دیا جس پر احمد حسن نے مجھ سے بحث کرنے کی بجائے بڑی لاپروائی سے یہ کہتے ہوئے ریموٹ کنٹرول دوبارہ اُٹھا لیا کہ ''ابھی تمہاری اُن سے پہلی ملاقات تھی تمہیں اُن کے مزاج کا صحیح علم نہیں ہو سکتا۔''

''میں ایک نظر میں بندے کو پہچان لیتی ہوں۔'' میں نے بڑے زعم سے کہا۔

''ساری ہی حسین عورتوں کو یہ خوش فہمی ہوتی ہے۔'' احمد حسن نے مسکرا کر میری طرف

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیکھتے ہوئے کہا۔ مجھے لگا وہ مجھے چڑا رہے ہوں۔

''خوش فہمی نہیں قدرت کی طرف سے دیا گیا ادراک کہو جو حسن کی خوبیوں کو چار چاند لگا دیتا ہے۔''

میں پھر سے آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ احمد حسن نے ایک شوخ سی نگاہ مجھ پر ڈالی اور دوبارہ میچ دیکھنے میں محو ہو گئے۔

''احمد!'' میں دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اُن کے قریب آ گئی اور بیڈ کے پاس دھری ایزی چیئر پر نیم دراز ہو گئی۔

''احمد!'' میں نے اُنہیں دوبارہ پکارا۔

''ہاں کہو بھئی کیا بات ہے۔'' انہوں نے بدستور ٹی۔وی پر نظریں جمائے جمائے کہا۔

''اِسے تو چھوڑیں.....'' میں نے اُن کی توجہ اپنی طرف مبذول کروانے کے لیے ریموٹ کنٹرول اُن کے ہاتھ سے لے لیا۔

''آئمہ پلیز.....! صرف دو اوور رہ گئے ہیں دیکھنے دو ناں؟'' انہوں نے بڑی سماجت سے ریموٹ میرے ہاتھ سے لینا چاہا۔

''افوہ آپ کے یہ کرکٹ میچ.....مجال ہے کبھی دو گھڑی کو بھی آپ فارغ ہوں اور آپ کے ساتھ سکون سے بات ہو سکے۔''

میں نے جھنجھلا کر ریموٹ کنٹرول اُنہیں واپس دیا اور کمرے سے باہر آ گئی۔ میرا دل بے حد اُداس تھا۔ پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا جی چاہ رہا تھا میں کسی سے باتیں کروں، اپنی کیفیت کا اظہار کروں مگر کس سے.....؟

ایک دم ہی مجھے اپنی تنہائی کا احساس شدت سے ہونے لگا۔ اِس گھر میں تو ہر ایک مصروف تھا، سب کا اپنا حساب کتاب تھا، اپنی زندگی کی مصروفیات تھیں اور یوں بھی کوئی کسی کے معاملات میں دخل اندازی نہ کرتا تھا۔ میں نے اپنے اطراف کے لوگوں کا جائزہ لیا۔ مائدہ اور ثریا اِسی گھر میں رہتی تھیں مگر اپنے اپنے پورشن میں۔ ویسے بھی اُنہیں تو اپنے بچوں سے ہی فرصت نہ ملتی تھی۔

بچے.....! میری سوچ یہاں آ کر ٹھہر گئی۔

مائدہ کے دو بیٹے ہیں اور ایک بیٹی.....وہ ان کے ساتھ کس قدر مصروف رہتی ہے اور خوش بھی۔ مجھے آج پہلی بار مائدہ کے بچوں کے بارے میں سوچتے ہوئے اچھا لگ رہا تھا۔ ورنہ تو میں ہمیشہ اُس کے بچوں کی شرارتوں اور ضدوں کا سوچ کر گھبرایا ہی کرتی تھی۔ مائدہ کی شادی مجھ سے چار برس بعد ہوئی تھی۔ اُس کے تین بچے تھے اور تینوں ہی اب تو بڑے ہو رہے تھے۔ مجھے یاد تھا ہر بار جب مائدہ کے ماں بننے کی خبر آتی تھی تو اماں مجھے بڑے پیار سے کہتیں۔

''بس اب تو اللہ تعالیٰ میری آئمہ کی گود بھی بھر دے۔''

تب میں لاپروائی سے کندھے اُچکا کر کہتی۔

''اماں! ابھی کیا ہے۔ مجھے کوئی ایسی جلدی نہیں اور نہ ہی کچھ شوق ہے۔''

''اللہ سے توبہ کرو آئمہ!'' اماں مجھے تنبیہی نظروں سے گھورتے ہوئے کہتیں۔

''اماں! آپ بھی جب دیکھو یہی موضوع لیے رہتی ہیں۔ کیا میں بوڑھی ہو گئی ہوں۔''

میں انہیں جواب دیتی۔ اگرچہ میرا انداز بدتمیزی والا نہ ہوتا مگر میں کسی بات پر چپ نہ رہتی تھی۔ میرے پاس اپنی بات کو درست ثابت کرنے کے لیے سو دلائل ہوتے تھے اس لیے مائدہ اور ثریا بھابی نے تو مجھ سے الجھنا ہی چھوڑ دیا تھا.....میں پتہ نہیں کیا کیا سوچتی ہوئی باہر لان میں آ گئی تھی۔ رات کافی ہو چکی تھی اور فضا میں خنکی بھی کچھ زیادہ ہی تھی۔

نومبر کا مہینہ چل رہا تھا، سردیوں کی آمد آمد تھی۔ میں نے لان میں رکھی کین کی کرسیوں میں سے ایک کرسی کو کھینچ کر ذرا برآمدے کے شیڈ تلے کیا اور اُس پر ایزی ہو کر بیٹھ گئی۔ چاند کی معلوم نہیں کیا تاریخ ہو گی مگر تھا وہ خوب روشن.....شاید بارہ یا تیرہ تاریخ کا چاند تھا۔ ٹھنڈی اور نرم چاندنی ایک ریشمی چادر کی طرح اس وقت ماحول پر تنی ہوئی تھی۔ ہوا میں موگرے اور چنبیلی کی رچی ہوئی مہک نے مجھے مسحور کر لیا اور میں کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گئی۔ مجھے اپنی زندگی کے وہ سہانے دن اور راتیں یاد آنے لگیں جب میری پلکوں تلے بڑے حسین خواب اور دل میں بڑے گداز سے خیالات چٹکیاں لیتے رہتے تھے۔ جب نہ چاہتے ہوئے بھی میں سوچنے لگتی تھی کہ میرا جیون ساتھی کیسا ہو گا؟ اُس کی پسند و ناپسند کیسی ہو گی؟ اُس کے خیالات کیسے ہوں گے؟ اور اُس کا معیارِ زندگی کیا ہو گا؟

مجھے یاد آنے لگا کہ اکثر میری کلاس فیلوز میرے ایسے خدشات پر ہنس کر مجھ سے کہا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرتی تھیں۔

''آئمہ صاحبہ! وہ جیسا بھی ہو تمہیں پانے کے بعد ویسا نہ رہے گا۔''

''کیا مطلب ویسا نہ رہے گا؟'' میں ذرا منہ بنا کر پوچھتی۔

''بھئی جو مرید حسن ہو جائے گا وہ سوائے تمہیں راضی رکھنے کے اور کیا کرے گا.....؟''

میں پورے وثوق سے اُن کی باتوں پر اعتبار کر لیتی اور جانے کیا کیا سوچنے لگتی اور اُن دنوں تو میں سچ مچ ہی اپنی تخیلاتی دنیا میں بالکل ہی گم ہو کر رہنے لگی تھی جب احمد حسن کا پروپوزل میرے لیے آیا اور سب ہی نے اُسے فوراً منظور بھی کر لیا۔ دراصل احمد حسن نے مجھے کسی شادی کی تقریب میں دیکھا اور پسند کر لیا تھا۔ یہ بات احمد حسن کی بڑی بھابی ثریا خانم نے رشتہ منظور ہونے کے بعد مجھے مبارکباد دیتے ہوئے بتائی تھی۔

''بھئی واقعی احمد حسن کا دل واویلا درست تھا۔ اُس نے گھر میں حتمی اعلان کر دیا تھا کہ میری شادی اگر ہو گی تو اُسی لڑکی سے ہو گی ورنہ.....''

ثریا بھابی نے ''ورنہ'' پر بات کو اُدھورا چھوڑ کر مجھے جن بھرپور تعریفی نظروں سے دیکھا تھا انہوں نے مجھے اپنے ریشمی خوابوں میں مزید کئی راتوں تک اُلجھائے رکھا تھا اور مجھے یقین ہو گیا تھا کہ احمد حسن تو میرے ہنسنے پر ہی ہنسیں گے اور میرے رونے پر تو اُن کی جان پر بن جایا کرے گی۔ شادی کے بعد ہوا بھی ایسا ہی۔ شروع کے دو تین برس تو احمد حسن نے میرے ناز نخرے ہی اُٹھائے۔ بات میرے لبوں سے نکلتی بعد میں تھی اور احمد اُسے پورا پہلے کر دیتے تھے۔ ہم لوگوں نے یہ وقت تو سیر سپاٹوں اور پارٹیوں میں ہی انجوائے کرتے گزار دیا۔ احمد مجھے کئی ممالک کی سیر کروالائے تھے۔ وہ دولت مند ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے خاصے آزاد خیال بھی تھے۔ میں کچھ بھی پہنوں، کہیں بھی جاؤں، کسی سے بھی ملوں وہ کبھی اعتراض نہ کرتے تھے۔ تبھی تو میں اتنی سوشل ہو گئی تھی۔ مگر پھر آہستہ آہستہ زندگی کی ڈگر بدلنے لگی۔ احمد ایک بزنس مین تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اپنے کاروبار میں مگن ہوتے گئے اور میں نے اپنے شوق پورے کرنے شروع کر دیئے۔ مجھے بچپن سے ہی ''لیڈر شپ'' کی عادت تھی۔ گھر میں اکلوتی ہونے کی وجہ سے میری ہی چلی۔ مما اور پاپا نے کبھی کسی بات پر انکار نہ کیا۔ دادا دادی، نانا نانی، سب کی لاڈلی رہی۔ سکول، کالج میں سہیلیوں نے سر آنکھوں پر بٹھائے رکھا۔

یوں مجھے تحکم کی عادت اور ذات کی برتری عزیز ہو گئی۔ چاہتی تو میں یہ تھی کہ سیاست میں آؤں اور راج کروں مگر احمد حسن نے مجھے اِس معاملے میں بے اختیار کر دیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ ''دیکھو مومی! اگر تمہیں تقریریں کرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو کوئی این جی او بنا لو۔ آج کل بڑی بڑی بیگمات کا یہ مشغلہ ہے۔''

مجھے اُن کا یہ مشورہ بے حد اچھا لگا یوں بھی میں اپنے سکول و کالج کی کئی سوسائٹیوں کی عہدیدار رہ چکی تھی۔ کسی کی جنرل سیکرٹری اور کسی کی صدر۔ یوں میں نے اپنی ہم خیال کچھ خواتین کو ساتھ ملا کر ایک سماجی تنظیم بنالی۔ جب اس تنظیم کو رجسٹرڈ کروانے کا مرحلہ آیا تو ہمیں اپنی تنظیم کا بنیادی مقصد اور ایجنڈا بتانا تھا کہ آخر ہماری تنظیم کے مقاصد کیا ہوں گے۔ اِس مسئلے کو حل کرنے کے لیے میں نے ایک مقامی ہوٹل میں اپنی چند ہم خیال سہیلیوں کو جمع کیا۔ فائزہ خان جسے میں اپنی تنظیم کی جنرل سیکرٹری بنا رہی تھی خاصی ذہین تھی اور ایک میگزین بھی نکالتی تھی، اُس کا مشورہ تھا۔

''محض حقوقِ نسواں کی بنیاد پر کوئی ایجنڈا تیار کرنے کی بجائے اگر اپنی تنظیم کا نصب العین کسی ایک حق پر بنائیں تو ہی اس میں انفرادیت ہو گی اور اُس کی افادیت ہمیں جلد ہی مرکزِ نگاہ بنا دے گی۔''

''اپنے خیال کی وضاحت کرو فائزہ.....'' میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا تھا۔

''ہمارے ملک کا سب سے بڑا مسئلہ غربت ہے، ملک کی اکثریت خطِ افلاس سے بھی نیچے زندگی گزار رہی ہے۔'' میری طرف سے حوصلہ افزائی پا کر فائزہ نے اپنے خیال کی تفصیل بتانی شروع کی۔

''تو تمہارا مطلب ہے کہ معاشرے میں عورتوں کی تعلیم اور ملازمت کو یقینی بنانا ہمارا نعرہ ہونا چاہیے؟'' راحت نے فائزہ کی بات سے اپنی سمجھ کے مطابق مطلب نکالا۔

''ارے نہیں راحت! تم تو بالکل بھولی ہو۔'' فائزہ نے مسکراتے ہوئے بڑی ادا سے راحت کے خیال کی تردید کر دی۔ ''تعلیم اور معاش کو لے کر کئی حقوقِ نسواں کی تنظیمیں کام کر رہی ہیں۔''

''تو پھر ہم کون سی نئی بات کریں گی۔ خواتین کے حقوق میں تو ماڈرن زمانے میں یہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مسائل ہیں.....'' راحت کو اپنی بات کی تردید اچھی نہ لگی۔

''بحث میں مت پڑو تم لوگ۔ توجہ سے فائزہ کی بات سنو'' میں نے انہیں آپس میں الجھنے سے منع کیا۔

''دیکھو میں نے خواتین کے حقوق پر ہونے والی تین عالمی کانفرنسوں کے ایجنڈے کا بغور مطالعہ کیا ہے جن میں مسلم ممالک کے لیے جن ''اہداف'' کو چنا گیا تھا اُن میں غربت، تعلیم، حفظانِ صحت، عورتوں پر تشدد، معاشی عدم مساوات وغیرہ کا ذکر بالخصوص شامل تھا۔ اور اب.....''

فائزہ بڑا ٹھہر ٹھہر کر وہ تفصیلی معلومات ہمیں فراہم کر رہی تھی جو اُس نے واقعی بڑی ریسرچ سے جمع کی تھیں۔

''اور اب چوتھی بین الاقوامی خواتین کانفرنس ہونے کو ہے.....''

اُس نے میری جانب بڑی معنی خیز اور گہری نظروں سے دیکھا۔ جن کا مطلب میں سمجھ گئی۔

''میں چاہتی ہوں ہم لوگ ''بہبودِ آبادی'' پر کام کریں۔'' اُس نے پاکستان کی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی اور کم ہوتے وسائل کو مدِنظر رکھ کر بڑا اچھا سوچا تھا۔

''ہوں بہبودِ آبادی!'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے دُھرایا۔

''یعنی کم بچے خوشحال گھرانہ والا سلوگن.....'' راحت نے پھر سے بولنا ضروری سمجھا۔

''صرف کم بچے خوشحال گھرانہ کا سلوگن کیوں..... اِس بہبودِ آبادی کے بینر تلے تو اور بہت کچھ ہے.....'' فائزہ کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوگئی۔

''تو کھل کر بتاؤ.....'' راحت نے ہی فائزہ کی حوصلہ افزائی کی۔

''مثلاً ازدواجی عصمت دری بند کی جائے اور بیویوں کی مرضی کے بغیر شوہر اُن سے یہ خدمت نہ لیں۔ اور یہ کہ عورتوں کو اُن کی مرضی کے خلاف ماں بننے پر مجبور نہ کیا جائے۔ معاشرے میں لوگوں کو یہ شعور باقاعدہ ایک تعلیمی سلیبس کے ذریعے دیا جائے کہ غربت کے خاتمے اور معاشی ترقی کے لیے ہمیں آبادی پر کنٹرول کرنا ہوگا..... اور.....'' جیسے ہی فائزہ اپنے ایک ''اور'' پر ذرا ٹھہری راحت نے اُس کے ''اور'' کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اور ہمیں بچوں کی پیدائش کم کرنے کی باقاعدہ تعلیم کو عام کرنا ہوگا۔ آبادی کی بڑھتی

ہوئی شرح فیصد کو یوں بیان کرنا ہوگا کہ وہ ایک خوفناک جن کی طرح لوگوں کے دل و دماغ پر چھا جائے..... ہے نا؟''

''ہاں بھئی ہاں۔ بالکل ہماری تنظیم کا یہی نصب العین ہوگا۔ تب ہی تو صحیح معنوں میں ہم معاشرے کی کوئی ''خدمت'' کر سکیں گی۔''

فائزہ نے خوشی سے راحت کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اُنہیں اُوپر اُٹھا کر واقعی ایک نعرہ لگا دیا ''کم بچے خوشحال گھرانہ'' عورتوں کو اُن کے ازدواجی حقوق دیئے جائیں تاکہ وہ معاشرے کی فعال کارکن بن سکیں۔''

یوں اُس روز ہم لوگوں نے اپنی تنظیم کا حتمی ایجنڈا تیار کیا۔ راحت کے شوہر چونکہ سوشل ویلفیئر کے محکمے میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے ہمیں رجسٹرڈ ہونے میں نہ کوئی اور مسئلہ درپیش ہوا اور نہ ہی دیر لگی۔ تنظیم کے رجسٹرڈ ہوتے ہی ہم نے پریس کانفرنسیں کرنا شروع کر دیں۔ جلسے اور جلوس..... بہت جلد ہماری تنظیم کی شہرت ملک بھر میں پھیل گئی اور پھر کئی بین الاقوامی تنظیموں نے ہم سے رابطے کرنے شروع کر دیئے۔ اُن کا خیال تھا کہ ہم اُن کے ساتھ مل کر کام کریں مگر کسی اور کے پلیٹ فارم پر ہم چلی جائیں ہمیں یہ گوارا نہ تھا لہٰذا ایک بڑی تنظیم اپنے اغراض و مقاصد کو لے کر ہمارے پلیٹ فارم پر آ گئی اور ہم سے الحاق کر لیا۔ یوں میں ایک بین الاقوامی تنظیم کی سربراہ بن گئی۔

میری شادی کو چھٹا برس لگ چکا تھا۔ اب احمد حسن اپنے کاروباری دوروں پر اکثر ملک سے باہر جاتے مگر تنہا ہی۔ کیونکہ میں تو اس قدر مصروف ہو چکی تھی کہ میرے پاس اکثر اتنا وقت ہوتا ہی نہ تھا کہ میں ہفتہ بھر صرف احمد حسن کے ساتھ سیر و تفریح میں گزار دوں۔ یوں میرے اور احمد حسن کے درمیان نہ چاہتے ہوئے بھی کچھ فاصلے آتے گئے۔ وہ گھر پر بھی ہوتے تو اپنا زیادہ تر وقت ٹی وی پر سپورٹس یا پھر نیوز چینلز دیکھنے میں گزار دیتے اور میں کسی نا کسی سہیلی کے ساتھ فون پر لمبی گفتگو کرتی رہتی۔ گاہے بہ گاہے اتنا ہوتا کہ احمد حسن چائے یا کافی کی فرمائش کر دیتے اور کہتے کہ میں خود بنا کر لاؤں۔ میں فارغ ہوتی تو خود بنا لاتی ورنہ خانساماں سے بنوا دیتی اور خود ٹرے میں سجا کر لے جاتی۔

اب ہم گھنٹوں ایک دوسرے کے چہرے تکنے اور محبت بھری باتیں کرنے میں مگن نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہتے تھے۔اور قربت کے لمحات بھی شاید ہماری فطری جبلت کے مرہونِ منت ہی ہوتے تھے۔

ویسے مجھے کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ہم اکثر ڈنر کرنے کے لیے باہر جاتے تھے۔ بڑے بڑے فائیو سٹار ہوٹلوں سے لے کر سڑک کنارے بنے چھپر ہوٹلوں تک سے ہم نے کھایا تھا۔احمد کو کہیں کا کچھ پسند تھا تو کہیں کا کچھ۔مگر دال اور چائے وہ اکثر ایسے ہی ''ڈھابوں'' سے جا کر کھاتے پیتے۔ شادی کے شروع سالوں میں تو مجھے یہ بے حد اچھا لگتا تھا اور اک ایڈونچر لگتا تھا مگر اب مجھے ایسی جگہوں پر جانا ہرگز بھی اچھا نہ لگتا تھا۔میں وہاں جانے سے گریز کیا کرتی اور اگر جاتی تو بددلی کے ساتھ جاتی۔جس پر اب احمد حسن کا بھی موڈ خراب ہو جاتا اور وہ کہہ دیتے۔

''آئمہ! میرے اور تمہارے خیالات میں آنے والی دراڑیں کہیں ہمارے دلوں میں نہ آ جائیں؟'' تب میرا دل اک لمحے کو ہول سا جاتا مگر میں بڑی ادا سے اُنہیں منا لیتی۔

''احمد! پلیز میرا یہ مطلب نہ تھا۔میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ ایسی جگہوں پر صفائی کا خیال نہیں رکھا جاتا، گندے برتنوں میں پکایا اور دیا جاتا ہے۔آپ بیمار نہ ہو جائیں میں تو اس خیال سے منع کرتی ہوں۔''

''جو لوگ یہاں سے ہر روز کھاتے پیتے ہیں وہ بھی انسان ہیں اور شاید ہم سے تو زیادہ صحت مند زندگی گزار رہے ہیں۔''

''وہ کوئی اور لوگ ہوں گے احمد! میرے لیے تو آپ سے زیادہ اہم کوئی نہیں۔ مجھے تو آپ ہی کی فکر ہے۔''

میں ایسے ڈائیلاگ بول کر اُنہیں منا ہی لیتی۔بات یہ بھی نہ تھی کہ میں محض ڈائیلاگ ہی بولتی تھی بلکہ مجھے احمد کے ساتھ سچ مچ محبت تھی۔شدید محبت..... مجھے اُن کی صحت اور زندگی سے زیادہ کچھ عزیز بھی نہ تھا۔مگر ہاں..... میں کچھ لفاظی کرنے بھی لگی تھی۔میری محبت میں اب خلوص کے ساتھ ساتھ ذرا دکھاوا بھی آنے لگا تھا۔مجھے احمد کی پسند کے احترام کی بجائے اُن کی خفگی کا خوف رہتا تھا.....اور پھر احمد نے بھی شاید میری نبض کو پہچان ہی لیا۔اب انہوں نے مجھے ایسی جگہوں پر لے جانا چھوڑ دیا بلکہ میرا تو یہ خیال تھا کہ انہوں نے اب خود بھی ایسی جگہوں پر جانا چھوڑ دیا ہوگا۔مجھے لگتا تھا ہماری زندگی بہت اچھی ہی گزر رہی تھی۔

❀❀❀

''آئمہ!''

''جی''

''ہماری شادی کو کتنے برس ہو گئے؟''

احمد نے ڈائمنڈ رنگ تحفے میں دیتے ہوئے اُس شام اچانک ہی پوچھ لیا جب ہم دونوں اپنی شادی کی چھٹی سالگرہ کا کیک ہالی ڈے اِن اسلام آباد کے ایک خوبصورت کمرے میں کاٹ رہے تھے۔احمد نے کافی دنوں بلکہ چھ سات مہینوں کے بعد میرے ساتھ دو تین روز لاہور سے باہر گزارنے کا ارادہ کیا تھا۔اِتفاقیہ طور پر ہماری شادی کی سالگرہ بھی آ رہی تھی۔چنانچہ اس بار احمد نے یہ سالگرہ کسی فیملی فنکشن یا سوشل پارٹی کی صورت میں کرنے کی بجائے اپنے اور میرے بیچ میں ہی منانے کا فیصلہ کیا تھا۔آج احمد نے اس خوشی کو منانے کے لیے بالکل ویسا ہی اہتمام کر رکھا تھا جیسا میری شادی کی پہلی سالگرہ پر تھا جو ہم نے دبئی میں منائی تھی۔

''ہماری شادی کو کتنے برس ہو گئے آئمہ!؟''

احمد نے وہ ڈائمنڈ رنگ میری اُنگلی میں پہناتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔

''چھ برس.....'' میں نے کچھ حیرت سے احمد حسن کو دیکھا کہ وہ جانتے بوجھتے مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں۔

''اور واجد بھائی کی شادی کو کتنے برس ہو گئے؟''

''دوسرا سال ہے اُن کی شادی کو.....'' میں نے دل ہی دل میں حساب لگا کر بتایا۔

''اور وہ ایک بے حد پیارے سے بچے کے والدین بن چکے ہیں۔'' انہوں نے یہ مجھے بتایا تو بالکل سادگی سے اور رسان کے ساتھ مسکراتے ہوئے تھا۔مگر مجھے لگ رہا تھا اُن کی مسکان مجھے چُھونے کی بجائے کھرچ گئی ہو۔

کتنا پیارا ہے عُمید؟'' انہوں نے واجد بھائی اور ثریا بھابی کے بیٹے ''عُمید'' کو آنکھوں میں بھرتے ہوئے کہا۔''عُمید'' جب سے ہوا تھا احمد کو باتیں کرنے کے لیے ایک اور موضوع مل گیا تھا۔

''ہاں بہت کیوٹ ہے۔'' میں نے مختصراً کہا اور احمد کے دھیان کو پلٹنے کے لیے اور باتیں شروع کر دیں۔''احمد! پتہ نہیں کیا بات ہے آج کل میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں رہتی۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اوہ..... کیا ہوا؟'' احمد نے فکرمندی سے پوچھا۔

''پتہ نہیں سر میں مسلسل درد رہنے لگا ہے اور میں بڑی جلدی تھک جاتی ہوں۔'' میں نے اپنی کیفیات سے اُنہیں آگاہ کیا اور یہ جھوٹ نہ تھا آج کل واقعی میری طبیعت کچھ گری گری سی رہتی تھی۔

''چلو کل یہاں پر کسی لیڈی ڈاکٹر سے مشورہ کرلو۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ ہمیں کسی گائنا کالوجسٹ سے ملنا چاہیے۔''

انہوں نے آج پھر اپنی اس دلی خواہش کا اظہار کردیا تھا جو پچھلے ایک ڈیڑھ برس میں شدت اختیار کرچکی تھی۔

''احمد! آپ کو تو معلوم ہے ناں..... آئی کانٹ افورڈ اٹ.....'' میں نے انہیں سمجھانا چاہا۔

''لیکن کیوں آئمہ..... پرابلم کیا ہے؟'' اب وہ میرے گریز سے چڑنے لگے تھے

''اچھا بس ابھی نہیں..... صرف ایک دو برس اور.....'' میں نے ذرا لجاجت اختیار کی۔

''دیکھو! مجھے تم سے بحث نہیں کرنی۔ اب بہت ہوگئی پلاننگ۔ تم وہ اپنی تنظیمی ''بہبودِ آبادی'' والی سوچ اپنے دماغ سے نکالو۔'' وہ تو سچ مچ غصے میں آگئے۔

''بڑا افسوس ہے احمد۔ آپ کی سوچ بھی بالکل عام سے مردوں والی ہے۔'' میں نے اُنہیں جذباتی طور پر اُس سوچ سے ہٹانا چاہا۔

''اِس لیے کہ میں ایک مرد ہوں..... اور اپنے گھر میں افراد چاہتا ہوں وہ افراد جو میرے وجود کا حصہ ہوں۔ میری اگلی نسل ہوں۔'' وہ تو جیسے بھرے بیٹھے تھے۔

''تم کیسی عورت ہو آئمہ.....؟ جو ماں نہیں بننا چاہتی۔ جسے ابھی تک اپنی کوکھ کے سُونے پن کی کچھ فکر نہیں۔''

''احمد! احمد! دیکھیں میری بات سنیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں تو بس۔'' میں نے اُن کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنی چاہی۔

''تم تو کیا آئمہ.....؟ مجھ سے اب اپنے گھر کا خالی پن اور دل کی اُداسی برداشت نہیں ہوتی۔ میں نے تمہاری خواہش کا احترام بہت صبر سے کیا ہے اب تم بھی اپنا فرض خوشی سے ادا کرو.....''

وہ غصہ بھول کر مجھے پیار سے سمجھانے لگے۔

''ٹھیک ہے احمد میں جلد ہی کسی گائنا کالوجسٹ سے ملوں گی.....'' میں نے اُن کی تسلی کردی جس پر وہ بے حد خوش ہوگئے۔

''تھینک یُو آئمہ.....''

''یُو آر ویلکم می لارڈ.....'' میں نے بھی ماحول کو سازگار بنانے کے لیے خوش دلی سے کہا۔

❀❀❀

گائنا کالوجسٹ سے ملنے کے لیے مجھے احمد کی خواہش سے زیادہ اپنی پریشانی نے مجبور کردیا تھا جو مجھے اُن کے بدلتے ہوئے مزاج سے محسوس ہونے لگی تھی۔ ورنہ ابھی بچے کی ماں بننے کا مجھے شوق تھا نہ خواہش۔ مجھے تو بچے کبھی بھی بہت اچھے نہ لگے تھے۔ اچھی خاصی زندگی کو درہم برہم کردینے والے۔ ہر وقت شور اور ہنگامہ مچانے والے۔ جن کی وجہ سے عورت ایک مشین بن کر رہ جاتی ہے۔ چھوٹے ہوں تو اُن کا ہر دم کا رونا چلانا اور سنبھالنا..... اور سب سے بڑھ کر وہ..... وہ۔ نیپیاں اور پمپرز بدلنا۔

''اَخ تھو.....'' مجھے تو یہ سب سوچ کر ہی گھن آرہی تھی۔

چلو اگر یہ سب ایک اچھی آیا کر بھی لے۔ تب بھی تو اُن کے ڈھیر کام ہوتے ہیں جو بہر حال ایک ماں کو ہی کرنے پڑتے ہیں۔

میں اپنے ماں بننے کے بعد کی ذمہ داریوں کو سوچ کر پہلے ہی سے گھبرانے لگی۔ ''نہ بابا نہ مجھ سے یہ سب ہرگز نہ ہوسکے گا۔''

مجھے یہ سب مشکل ہی نہیں ناممکن بھی لگ رہا تھا۔ مجھے سمجھ نہ آرہی تھی۔ میں اپنی اِس پرابلم کو کس کے ساتھ ڈسکس کروں۔

''کیا کسی سہیلی سے؟'' میں نے سوچا۔

''مگر ایسی کون سی میری مخلص سہیلی ہے جو میری بات کو سنجیدگی سے سن کر مجھے مخلصانہ مشورہ بھی دے.....'' مجھے اپنے اردگرد کے جمگھٹے میں ایک بھی ''بیگم'' ایسی نظر نہ آئی جو واقعی اخلاص والی ہو۔ یہاں تو سب کی سب حسد کی ماری ہوئی تھیں اور ایک دوسری کی خامیوں کی تاک میں رہتی تھیں تاکہ اُنہیں اُن کے ذریعے بلیک میل کرسکیں یا نیچا دکھا سکیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''تو پھر میں کس سے بات کروں.....؟'' میں اپنے آپ میں اُلجھنے لگی۔

''مما.....'' میرے دل و دماغ میں روشنی سی ہوئی۔

''ہاں، ہاں مما۔ اُن سے زیادہ میرا بھلا چاہنے والا کوئی اور ہرگز نہیں ہوسکتا۔'' مجھے اپنی مما پر دنیا جہان کا بھروسہ تھا۔ کیوں نہ ہوتا، وہ تو مجھے ساری دنیا سے بڑھ کر محبت کرتی تھیں۔ پاپا سے بھی زیادہ..... اور..... اور احمد حسن سے بھی زیادہ ''مگر مما تو مجھے یہی سمجھائیں گی کہ مجھے ہر حال میں احمد حسن کی خواہش کا احترام کرنا چاہیے۔''

میرے جوش پر کچھ اوس سی پڑ گئی۔

''مگر پھر بھی مجھے اس مسئلہ کا کچھ حل تو ڈھونڈنا ہی ہوگا اور مسئلہ تبھی حل ہوگا جب میں اس پر کسی سے بات کروں گی.....''

خود کلامی کرتے کرتے میں اِسی نتیجے پر پہنچی کہ مجھے بہر حال مما سے مشورہ کرنا ہی چاہیے۔

❁❁❁

اگلے روز میں مما کی طرف آ گئی۔ مجھے دیکھ کر وہ تو جیسے نہال ہی ہوگئیں۔ ''آئمہ! میری جان۔''

وہ مجھے کتنی ہی دیر سینے سے لگائے کھڑی رہیں۔

''کتنی بُری ہو تم..... اِتنے روز کے بعد آئی ہو۔ کیا تمہارا دل نہیں چاہتا والدین سے ملنے کے لیے.....''

وہ مجھ سے محبت بھرے گِلے کرنے لگیں۔

''سوری مما..... واقعی مجھے بہت دن ہو گئے تھے۔ اب ایسا نہیں کروں گی.....'' میں اپنی غلطی تسلیم کر رہی تھی۔

''اچھا چھوڑو بتاؤ کیا لو گی۔ چائے، ٹھنڈا یا پھر کھانا.....؟'' وہ مجھے پیار سے پوچھ رہی تھیں۔

''کھانا مما..... مجھے بہت روز ہو گئے آپ کے ہاتھ کا کھانا کھائے۔ اچھا بتائیں آج کیا پکایا ہے آپ نے؟''

میں نے بے صبری سے پوچھا۔ مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی اور مما کے ہاتھ کا کھانا

کھانے کا دل بھی کر رہا تھا۔ ہمارے گھر میں مالی، ڈرائیور، چوکیدار اور ماسی سب تھے مگر ''خانساماں'' کو میرے پاپا نے کبھی پسند نہیں کیا۔ وہ کھانا ملازموں کے ہاتھوں کا پکا پسند نہ کرتے تھے۔ اِس لیے مما ہی ساری کُکنگ کرتی تھیں۔ ''آج پالک گوشت اور سفید چاول بنے ہیں تمہارے فیورٹ.....''

مما نے میری بھوک کو اور بھی اشتعال دکھایا۔

''تو پھر جلدی کریں مما.....''

اُس وقت میں ایک چھوٹی سی بچی بن گئی تھی جو اپنی ماں کے ہاتھ سے کھانا کھانے کو مچل رہی تھی۔

''تم ہاتھ دھو کر آؤ..... میں ابھی ٹرے بنا کر لائی.....''

مما مجھ پر فدا ہوئی جا رہی تھیں۔ میں دیکھ رہی تھی مجھے دیکھ کر اُن کے چہرے پر شمعیں روشن ہو گئی تھیں اور ایک عجیب سی وارفتگی اُن کے برتاؤ سے ظاہر تھی۔ اُن کی خوشی اُس وقت اُن کے ہر عمل سے عیاں تھی۔ مجھے دیکھنے، مجھ سے بات کرنے، اور میرے لیے کام کرنے میں وہ ذرا بھی بے زار نہ تھیں۔ نہ ہی وہ تھکی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔

وہ تو سدا سے ہی ایسی تھیں جب میں بہت چھوٹی تھی تب سے (یعنی جب سے مجھے یاد تھا) وہ میرے لیے ایسی ہی خوشی اور مستعدی سے کام کرتی تھیں حالانکہ میں نے ہمیشہ انہیں بہت ستایا اور تھکایا تھا۔ میری ضدیں، میرے نخرے، یہ نہیں کھانا، یہ نہیں پہننا۔ اُس سے نہیں بولنا..... وہاں نہیں جانا..... میں تو اپنی مرضی سے مما کو بھی پابند رکھتی تھی جو مجھے پسند نہ ہوتا میں اُس کے ساتھ مما کو بھی بات نہ کرنے دیتی تھی۔

''اُف! میں نے مما کو کس قدر تنگ کیا تھا ہمیشہ.....''

میں نے اپنے بارے میں سوچا تو مجھے خود کو بھی جھرجھری سی آ گئی۔ مگر میری مما..... انہوں نے میری خواہشوں کو پورا کرتے وقت کبھی ماتھے پر بَل تک نہ ڈالا تھا۔ شاید اِس لیے کہ وہ میری ''ماں'' تھیں۔ میں نے اپنی ماں کی عظمت کو جی ہی جی میں سراہا۔

''لو بھئی گرما گرم کھانا.....''

اتنے میں مما میرے لیے کھانا لے آئیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''مما! میں آپ کو کتنا ستاتی ہوں۔ واقعی میں بُری ہوں۔''

میں نے کھانے کی ٹرے اُن کے ہاتھ سے لیتے ہوئے ذرا شرمندگی سے کہا۔

''بُری.....''

مما نے مجھے پیار بھری نظروں سے دیکھا اور پھر ہنس پڑیں۔

''بُری تو نہیں البتہ پگلی ضرور ہو.....''

انہوں نے میرے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔

''اچھا تم کھانا کھاؤ میں تمہارے لیے قہوہ بنا کر لاتی ہوں۔''

وہ مجھے کھانا چھوڑ کر قہوہ بنانے چلی گئیں اور میں ''تھینک یُو مما.....'' کہہ کر کھانا کھانے لگی۔

''آئمہ! کیا بات ہے بیٹی تم کچھ پریشان دکھائی دے رہی ہو؟'' قہوہ پینے کے بعد انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

''پریشان.....نہیں تو.....!'' میں نے قدرے سکون سے جواب دیا۔

دراصل اب میں واقعی پریشان نہ تھی۔ وہ بات جس نے مجھے پچھلے کئی روز سے پریشان کر رکھا تھا اور جس کے لیے میں اپنی ماں سے مشورہ کرنے آئی تھی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ مما کا محبتوں سے گندھا ہوا، گداز اور جاں نثار رویہ دیکھ کر، انہیں خود پر فدا ہوتے دیکھ کر، اُن کی آنکھوں میں موجزن پیار کا سمندر دیکھ کر، مجھے مشورہ بھی مل گیا اور اپنی پریشانی کا بڑا ٹھوس جواب بھی۔ اِس لیے میں نے پھر اُس موضوع پر اُن سے کوئی بات نہ کی۔ بس روزمرہ کی اور اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔

''اچھا مما! اب میں چلتی ہوں۔'' گھڑی پر پانچ بجے دیکھ کر میں نے اُٹھنا چاہا۔

''ابھی سے.....'' وہ گھڑی کی بجائے میرے چہرے کو یوں تکنے لگیں جیسے مجھے آئے تین گھنٹے نہیں بلکہ محض تین ساعتیں ہی گزری ہوں۔

''بہت دیر ہو گئی مما.....'' میں نے مسکرا کر اُن کے اُداس پڑتے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''مہینے کے بعد آتی ہو.....دو تین گھنٹے ٹھہرتی ہو.....اور کہتی ہو دیر ہو گئی۔'' وہ وارفتگی

سے مجھے یوں تکے جا رہی تھیں جیسے میری دید سے اپنی ممتا کی تشنگی مٹا رہی ہوں۔ وہ کچھ بھی نہیں کہہ رہی تھیں اور میرا جی پگھلے جا رہا تھا۔ ایسے جیسے میں رو ہی دوں گی۔ مجھے لگ رہا تھا میرا رواں رواں زبان بن کر اُن سے سرگوشیاں کر رہا ہو..... دھیمی دھیمی اور بھیگی بھیگی سرگوشیاں۔ جسے شاید دکھ سکھ کرنا کہتے ہیں۔ وہ دُکھ سکھ جو اولاد اپنی ماں سے کرتی ہے۔ صرف اپنی ماں سے.....

''مما! میں پھر آؤں گی۔'' میں اُن کی آنکھوں کی اُس میٹھی میٹھی سی چبھن سے بُری طرح گھبرا رہی تھی جو مجھے اندر سے کُریدے جا رہی تھی

''اچھا ٹھیک ہے جاؤ۔'' انہوں نے مسکرا کر مجھے جانے کی اجازت دے دی مجھے لگا وہ میری کیفیت جان گئی تھیں تبھی تو اُن کی آنکھوں کا حصار بھی مجھ پر ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ مما کی یہ عادت مجھے بے حد پسند تھی وہ کبھی بھی زبردستی کچھ نہ پوچھتی تھیں۔ میں خود سے کبھی کوئی بات بتا دیتی تو وہ اپنی رائے یا مشورہ دے دیتیں مگر خود کبھی تفتیش نہ کرتیں کہ تم کیسی ہو؟ تمہارا شوہر تو تمہارے ساتھ ٹھیک ہے.....ساس تو تنگ نہیں کرتی وغیرہ وغیرہ۔

''بیٹی! ذرا آتی جاتی رہا کرو۔ تمہاری صورت دیکھ لوں تو لگتا ہے ابھی میری ہڈیوں میں جان باقی ہے.....اور اگر یہ صورت ہنستی مسکراتی نظر آئے تو یقین مانو مجھے تو یہ لگتا ہے کہ میں ابھی جوان ہی ہوں۔'' انہوں نے مجھے بڑی ہی محبت سے اپنے سینے سے لگا کر بھینچتے ہوئے کہا۔

''تو مما آپ جوان ہی تو ہیں۔'' میں نے ایک بھرپور نظر اُن پر ڈالی۔ واقعی وہ آج بھی بڑی اسمارٹ اور فریش تھیں۔

''اور نہیں تو کیا.....میں تو بالکل جوان ہوں۔ ابھی تو صرف ''ساس'' بنی ہوں۔ نواسے نواسیاں کھلاؤں گی۔ کوئی نانی نانی کہنے والا آئے گا تو ہی لگے گا کہ وقت نے میری عمر کو رسیدہ کرنا شروع کر دیا ہے۔'' انہوں نے ہنستے ہنستے وہ بات کہہ دی۔ جس کے لیے میں اُن سے مشورہ کرنے آئی تھی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ یعنی وہ مجھے اپنا مشورہ دے چکی تھیں۔

''مما آپ بھی ناں.....؟'' اب میں نے اُنہیں گلے سے لگا لیا۔

''ماں ہو گی تو جانو گی کہ میں بھی کیا؟'' انہوں نے میرے گال پر بوسہ دیتے ہوئے ہولے سے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''مما! میں نے آج گائنا کالوجسٹ کے پاس ہی جانا ہے۔ اِسی لیے تو کہہ رہی تھی کہ دیر ہو رہی ہے.....''

میں نے ذرا شرماتے ہوئے کہا۔

''بہت اچھی بات ہے۔ جاؤ پھر دیر نہ کرو۔ اللہ کرے میں جلد ہی نانی بننے کی خوش خبری سنوں۔'' وہ مجھے دعا دیتے وقت بے حد خوش تھیں۔

نادانستہ ہی میرے لبوں سے ''آمین'' نکلا۔

میں نے یہ فیصلہ تو کر لیا تھا کہ اب میں نے احمد کو اور زیادہ ناراض نہیں کرنا مگر میں کسی گائنا کالوجسٹ کے پاس احمد کے ساتھ نہ جانا چاہتی تھی۔ پتہ نہیں کیوں میرے دل میں اک خوف سا تھا کہ کہیں اُس نے کوئی ایسی ویسی بات بتا دی تو.....؟ بس اِسی لیے میں نے فیصلہ کیا کہ میں راحت کو اپنے ساتھ لے جاؤں۔

''راحت.....! ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔ وہ خاصی ذہین ہے اور پھر اُس کی ایک کزن مشہور گائنا کالوجسٹ بھی تو ہے۔'' مجھے یاد آیا اور میں نے ڈرائیور سے راحت کی طرف چلنے کو کہا۔''

❀❀❀

مجھے یوں اچانک اپنی طرف دیکھ کر وہ بے حد خوش ہوئی.....اور جب میں نے اُسے اپنے آنے کا مقصد بتایا تو وہ ہنس پڑی۔

''یعنی اِس ملک کی کروڑوں کی آبادی میں اب تم نے بھی حصہ ڈالنے کی ٹھان لی ہے۔''

''بکواس نہ کرو۔'' میں نے جھوٹ موٹ کا ایک مکہ اُسے جڑتے ہوئے کہا۔

''اچھا چلو خیر ہے۔ شادی کے چھ برس بعد ایک بچے کی ماں بننا تو تمہارا حق ہے۔ آخر تمہیں بھی تو ''مما'' کہنے والا اب کوئی ہونا چاہیے۔'' اُس نے گویا میرے معاملے میں بڑا احسان فرماتے ہوئے کہا۔

''چلو اُٹھو تقریریں مت جھاڑو۔ یہاں کوئی جلسہ نہیں ہو رہا۔'' میں نے ہاتھ کھینچ کر اُسے صوفے پر سے اُٹھایا۔

''چلو فون کرو اپنی کزن کو اور ٹائم لو.....'' میں نے اُسے ٹیلی فون کی طرف دھکیلا۔

''کیوں وقت کس لیے لوں۔ ہم کوئی عام سے مریض ہیں۔ چلو چلتے ہیں۔'' وہ اپنی

کزن پر اپنا مان جتاتے ہوئے بولی۔ اور اُس کا یہ مان درست بھی تھا کیونکہ جب ہم ڈاکٹر مہ نور کے کلینک پہنچے تو وہ بے حد رَش ہونے کے باوجود ہماری خبر پا کر خود باہر آ گئی اور بڑی محبت سے ہم دونوں کو باری باری گلے ملی۔ راحت نے میرا تعارف کروایا۔

''مہ نور! یہ میری دوست آئمہ ہیں اور ہماری این جی او کی صدر بھی.....''

''جانتی ہوں بھئی.....اور پھر انہیں کون نہیں جانتا۔ اتنی معروف شخصیت ہیں۔'' وہ پیار سے میری طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

ہم اندر آ چکے تھے۔ وہاں مہ نور اپنی مریضوں کا معائنہ کیا کرتی تھی۔ اچھا خاصا بڑا کمرہ تھا جس میں الٹرا ساؤنڈ مشین کے علاوہ بھی اور کئی قسم کی مشینیں دھری تھیں جن کے بارے میں مجھے کچھ زیادہ علم نہ تھا۔ تھوڑی دیر مجھ سے اور راحت سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے اور کولڈ ڈرنک پینے کے بعد مہ نور نے راحت کو باہر جانے کا کہہ دیا۔

وہ ایک بے حد قابل گائنا کالوجسٹ تھی۔ یہ اُس کے پرتاؤ اور باہر جمع خواتین کے جمِ غفیر سے صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ وہ صرف ڈگریاں ہی بڑی نہیں رکھتی تھی بلکہ اُس کا اخلاق بھی بے حد اچھا تھا۔ اُس نے بڑی تسلی اور سمجھداری سے میری بات سنی۔ مجھ سے کچھ سوال کیے اور پھر میرا معائنہ کیا۔

''مسز احمد! آپ کب سے فیملی پلاننگ کر رہی ہیں۔'' وہ اب خاصی سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔

''جب سے میری شادی ہوئی ہے۔'' میرا جی اُس کی اتنی سنجیدہ شکل دیکھ کر کچھ ہولنے لگا تھا۔

''یعنی.....؟''

''چھ برس سے.....'' میں نے آہستگی سے کہا اب میرے دل کی دھڑکن مجھے صاف سنائی دے رہی تھی۔

''یعنی آپ مسلسل چھ برس سے دوائیاں استعمال کر رہی ہیں۔'' وہ مجھ سے سوال کرتے وقت اب میرے چہرے کی طرف نہ دیکھ رہی تھی بلکہ لکھتی جا رہی تھی۔

''جی.....جی ہاں.....'' میری آواز اور بھی دبنے لگی۔

پھر وہ چپ ہو گئی اور مجھ سے چپ رہنا مشکل ہو گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''مہ نور خیریت تو ہے؟'' آخر میں نے پوچھ ہی لیا۔

''ہاں ہاں..... ان شا اللہ تعالیٰ.....'' وہ مسکرائی شاید وہ مجھے تسلی دے رہی تھی ورنہ اُس کے چہرے پر کوئی خوشی کے تاثرات نہ تھے۔

''آپ یہ ٹیسٹ کروا لیجیے..... اور ہاں اگر آپ اپنے شوہر کو بھی لے آئیں تو اچھا ہو گا.....'' اُس نے ایک کاغذ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''احمد کو..... خیر تو ہے.....'' میرا دل میرے حلق میں پھنسنے لگا۔

''ارے آپ تو پریشان ہو گئیں۔ یہ سب تو روٹین چیک اَپ ہے اور ہمیں کرنا پڑتا ہے۔ میرے شوہر بھی گائنا کالوجسٹ ہیں۔ آپ احمد بھائی کے ساتھ کل شام آ جائیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا.....'' اب وہ کھل کر مسکرا رہی تھی اور مجھے بڑے ہی پیار سے سمجھا رہی تھی۔ پھر اُس نے مجھے تفصیل سے چند باتیں سمجھائیں اور حوصلہ دیا۔

''اب آپ یہ ٹیسٹ کروا لیں تا کہ کل تک آپ کی رپورٹس بھی آ جائیں۔'' مہ نور نے اِنٹر کام پر اپنی ایک اسسٹنٹ کو بلایا۔

''نادیہ! مسز احمد کو لے جائیں اور اُن کے یہ ٹیسٹ لے لیں.....'' مہ نور نے مجھے نادیہ کے ساتھ بھیجتے ہوئے کہا۔ ''آئمہ! اللہ سے اچھی اُمید رکھیں سب ٹھیک ہو گا۔''

میں ڈرے ڈرے سے دل کے ساتھ نادیہ کے ساتھ کلینک کی لیبارٹری والے حصے میں چلی گئی۔ میں جو بے حد بے باک بڑی تعلیم یافتہ سمجھدار اور با اعتماد تھی، یوں کہہ لیں کہ بڑی ''گورجس'' تھی میرے قدم جانے کیوں لڑکھڑا رہے تھے اور دل ڈانواں ڈول سا تھا۔ میری سدا کی تیز چھٹی حس بھی بیدار ہو گئی تھی۔ مگر کیوں؟ اس کا جواب میرے پاس نہ تھا بلکہ جواب میں بھی ایک خوف ہی تھا..... انجانا اور انہونا سا خوف.....

❀❀❀

میرا وہ خوف رات بھر مجھ پر طاری رہا۔ وہ رات میری بے چینی اور بے قراری میں گزرنے والی رات تھی۔ جبکہ احمد اِس بات پر بے حد خوش تھے کہ میں نے اُن کی خواہش کا احترام کیا ہے۔ جب میں نے انہیں اپنے ساتھ ڈاکٹر کے پاس جانے کو کہا تو وہ بخوشی تیار ہو گئے۔ وہ رات میں نے تقریباً آنکھوں میں ہی کاٹی..... میں خود اپنی اس کیفیت پر حیران اور

پریشان تھی کہ آخر مجھے کس بات کا ڈر ہے اور کیوں؟ اور یہ میرے اندر ایک دم سے ممتا کیوں مچلنے لگی تھی وہ بھی اِک بن جنمے بن دیکھے بچے کے لیے۔ ابھی تو میری کوکھ خالی ہی تھی مگر میری گود کو کسی کی ہُوک لگ گئی تھی۔ ساری ترقی پسندی اور آزاد خیالی ایک دم سے ہوا ہو گئی تھی اور میں محض ایک عورت بن گئی تھی۔ میری مٹی گداز ہو کر مہکنے لگی تھی۔ کسی کونپل کی سرسراہٹ میرے لہو میں چلنے لگی تھی اور مجھے اپنے وجود میں اس کی طلب شدت سے محسوس ہونے لگی تھی جس کی خواہش بھی پچھلے دو چار روز تک مجھے نہ تھی۔ میرا دل ''ماں'' کہلانے کو مچلنے لگا۔

''بیٹا یا بیٹی؟'' میں خود سے سوال جواب کرنے لگی۔

''بیٹا..... وہ بھی گول مٹول سا۔''

''کیسا؟''

''عُمید جیسا.....'' میرے اندر سے بے ساختہ جواب آیا۔

''عُمید جیسا.....؟'' میں اپنے اندر چھپی ماں کا جواب بن کر حیران تھی۔ ''مگر میں نے تو کبھی عُمید کو اس نظر سے نہیں دیکھا۔ بلکہ میں نے تو اُسے کبھی اتنی گہری اور پیار بھری نظر سے بھی نہیں دیکھا.....'' میں اپنا جائزہ لینے لگی۔ لیکن عُمید کا پورا ناک نقشہ اور حلیہ تو جیسے میرے اندر کے نہاں خانوں میں پہلے سے موجود تھا۔ میں البتہ اس سے اب آگاہ ہو رہی تھی۔ سُرخ و سپید رنگت..... صحت مند گُل گوتھنا سا۔ بھورے بالوں والا عُمید..... جو ہنستا تو اُس کی بھوری آنکھیں اور بھی شفاف اور چمک دار ہو جاتیں اور چھوٹی سی ناک لال ہو کر چہرے پر نمایاں ہو جاتی۔ جس کی شرارتوں سے گھر بھر کے لوگ لطف اندوز ہوتے۔ میں عُمید کی ذرا ذرا سی بات کو یوں یاد کر رہی تھی جیسے وہ میرے ہی پاس رہتا ہو۔ حالانکہ میں تو بس آتے جاتے اس پر ایک نظر ڈالتی اور زیادہ ہی ہوتا تو کبھی کبھی اُس کے گپلے سے گالوں پر نرمی سے ایک چٹکی بھر کے کہتی۔ ''موٹو!'' اِس سے زیادہ تو میں نے کبھی اُسے پیار بھی نہ کیا تھا۔ مگر پھر بھی وہ میرے اندر یوں رچا بسا ہوا تھا کہ مجھے اُس کی مکمل تصویر اپنی آنکھوں میں جڑی نظر آ رہی تھی۔ میرا جی چاہا کہ میں اُسی وقت جا کر اُسے ثریا بھابی کے پہلو سے اُٹھا لاؤں اور اپنے ساتھ لگا کر بھینچ لوں۔ خوب پیار کروں اور گدگدیاں کر کے اُسے خوب ہنساؤں تا کہ اُس کے گالوں کے دائرے گہرے ہو کر اُسے اور خوبصورت بنا دیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''یا اللہ! میرا بیٹا بھی عُمید جیسا پیارا ہو۔'' میرے دل سے بے ساختہ دُعا نکلی۔

''میں اپنے بیٹے کا نام کیا رکھوں گی؟'' میں سوچ میں پڑ گئی۔

''اُس کا نام تو احمد جو چاہیں رکھ لیں مگر میں تو اُسے ٹیپو ہی بلاؤں گی۔'' میں نے تو گویا طے کر لیا۔

''ٹیپو.....! ہاں یہ بہت پیارا نام ہے۔'' میں نے بڑے پیار سے دہرایا۔

''ٹیپو.....''

میری اس خاموش سی سرگوشی کی بازگشت میرے لہو کے ساتھ گردش کرنے لگی میرے چہرے پر اِک پُرسکون سی مسکراہٹ پھیل گئی اور میں ٹیپو کے وجود کی گدازی کو اپنے پہلو سے لگا کر ساری رات باتیں کرتی رہی۔

❀❀❀

میں آئمہ احمد حسن.....ایک دن اور ایک رات میں ہی اس قدر تبدیل ہو جاؤں گی میں نے یہ کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ کہاں تو مجھے بچوں کے نام سے ہی چڑ تھی اور میں ان کے ذکر پر کترا کر گزر جایا کرتی تھی اور کہاں اب میں ایک بچے کے لیے اُتاولی ہو رہی تھی۔ میں اپنے جذبات میں ایسی ہی تھی ہمیشہ کی شدت پسند.....کوئی چیز مجھے بلاوجہ ہی ناپسند ہو جاتی تو میں اُس کی مخالفت میں نفرت تک اُتر آتی اور کچھ بھا جاتا تو اُسے پانے کے لیے میں ایسی ہی دیوانی ہو جاتی تھی جیسی اب ہو رہی تھی۔ پھر میں اس کے حصول میں اپنا تن من دھن لگا دیا کرتی تھی۔ یہ بھلا کر کہ میں جو چاہوں وہ فوراً ہی پالوں یہ میرے اختیار میں بھلا کب ہے۔ مجھے جس شدت سے یہ خواہش ہوئی کہ میری گود میں بھی کھیلنے والا کوئی آجائے اس کا حصول میرے لیے اِتنا ہی مشکل اور کٹھن ہو گیا۔

میری طلب کی آزمائش اس شام ہی شروع ہو گئی جب ڈاکٹر مہ نور نے میری میڈیکل رپورٹس دیکھنے کے بعد مجھے کہا۔

''آئمہ! ہمیں چند ماہ تک آپ کا کچھ علاج کرنا ہو گا۔''

''میرا علاج۔ کیوں۔ کیا میں بیمار ہوں.....'' میرے تو ہوش ہی اُڑنے لگے تھے اُس کی [illegible] سن کر۔

''ارے نہیں خدانخواستہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' اُس نے بڑے پیار سے مجھے تسلی دی۔

''تو پھر کیا بات ہے مہ نور! مجھے کھل کر بتایئے۔'' میں کوئی بھی بات راز میں برداشت نہیں کر سکتی تھی نہ ہی تجسس میں

''بات کچھ بھی نہیں ہے مسز احمد! بس کچھ پرابلمز ہیں جنہیں ہم ادویات سے ٹھیک کر لیں گے۔'' وہ مجھے سمجھانے لگی۔

''کیا میں میڈیکلی اَن فٹ ہوں.....؟''

میں نے خوفزدہ ہو کر پوچھا۔ یہ وہی خوف تھا جس نے اِس خواہش کے پہلے قدم پر میری اُنگلی تھام لی تھی۔

''اَن فٹ.....نہیں ابھی تو ہم ایسا نہیں کہہ سکتے۔ ہاں کچھ مسائل ضرور ہیں۔'' وہ مجھے حکمت سے بتا رہی تھی اور میں شدت سے محسوس کر رہی تھی۔ میری طبیعت میں حکمت اور حوصلہ کب تھا اِس لیے مجھے تو اندھیرا ہی لگ رہا تھا.....اور پھر اپنی کوئی خامی کوئی کمی میں نے پہلے کب تسلیم کی تھی جو اب کرتی۔

''ڈاکٹر مہ نور آپ کو کوئی غلط فہمی تو نہیں ہو رہی۔ یہ میری ہی رپورٹس ہیں؟'' میں نے اُس کے سامنے رکھی اپنی میڈیکل رپورٹس کو شک کی نظر سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آپ پریشان نہ ہوں آئمہ..... یہ آپ کی ہی رپورٹس ہیں اور ابھی ان میں ایسا کچھ نہیں ہے جس کی بنا پر آپ کو اَن فٹ گردانا جائے، اور پھر آج کل کس مسئلے کا حل ناممکن ہے؟ سائنس بہت ترقی کر چکی ہے.....اور آپ کو تو فی الحال ایسا کوئی سنجیدہ مسئلہ ہے ہی نہیں۔''

''تو پھر مجھے کیا ہے؟ آپ کیوں کہہ رہی ہیں کہ مجھے علاج کی ضرورت ہے؟'' میں اب اُسے شک کی نظر سے دیکھ رہی تھی۔

''دراصل آپ نے جو فیملی پلاننگ کی ادویات لی ہیں اور باقاعدہ چھ برس تک لیتی رہی ہیں یہ سب اُنہی کا نتیجہ ہے۔'' اب وہ بھی سنجیدہ ہو گئی۔

''میں نہیں مانتی.....'' مجھے مہ نور کی یہ بات عجیب سی لگی۔

''یہ ساری ادویات تو انتہائی محفوظ اُصولوں پر تیار کی جاتی ہیں اور یہ مضر صحت نہیں ہوتیں.....''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں ایک ڈاکٹر کو وہ سب بتانے لگی جسے وہ مجھ سے بہتر جانتی ہو گی۔ ''آئمہ ڈیئر! میں آپ کے ساتھ کسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتی۔ بس میری ایک بات سن لیں دوا کوئی بھی ہو وہ اگر علاج کے لیے استعمال کی جائے تو فائدہ مند ہوتی ہے۔ پہلے سے صحت مند نظام کی کارکردگی کو سُست بنانے کے لیے استعمال ہو تو آپ سمجھ سکتی ہیں اُس کے کیا اثرات ہوں گے۔ بہرحال میں نے یہ نسخہ لکھ دیا ہے آپ اِسے استعمال کریں اور ایک مہینے کے بعد دوبارہ آ کر چیک اَپ کرائیں۔'' اُس نے نسخہ میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

''اور احمد کے بارے میں.....؟'' مجھے احمد کی فکر ہو رہی تھی جو مہ نور کے شوہر کے پاس گئے ہوئے تھے۔

''اُن کی رپورٹس چار روز کے بعد لے جایئے گا۔ باقی حیدر نے اُنہیں سمجھا دیا ہو گا۔''

مہ نور نے اپنے شوہر ڈاکٹر حیدر کو فون کر کے کچھ پوچھا اور میری طرف مسکراتی نظروں سے دیکھتی ہوئی مسکرا دی۔

''اللہ سے اچھی اُمید رکھیں اور پھر وہی تو ہے جو ہمیں بیماری میں شفا دیتا ہے.....''

میں اُداس دل کے ساتھ ڈاکٹر مہ نور کو خدا حافظ کہہ کر باہر آ گئی۔ ''احمد پوچھیں گے تو کیا کہوں گی۔ جانے ان رپورٹس میں کیا لکھا ہے؟'' میرے قدم کلینک کے بیرونی دروازے کی جانب بڑھنے کی بجائے وہیں رُک گئے اور نہ چاہتے ہوئے بھی میں اس کلینک کے بڑے سے ویٹنگ روم میں ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔

''کیا کروں؟ اگر احمد نے یہ رپورٹس کسی اور گائنا کالوجسٹ کو دکھانے کو کہا تو.....؟'' میرے اندر کئی سوال سَر اٹھانے لگے۔

''تو انہیں پتہ چل جائے گا.....'' شرمندگی اور خوف نے مجھے مکمل طور پر گھیرے میں لے لیا۔

وہ تو ہمیشہ سے ہی اس چیز کے خلاف تھے۔ وہ تو مجھے پہلے ہی کہا کرتے تھے ''آئمہ! قانونِ قدرت کو مت بدلو۔ جو اللہ چاہتا ہے تم اُسے کیوں روکنا چاہتی ہو اور پھر تمہیں کیا مسئلہ ہے جو تمہیں بچے نہیں چاہئیں؟''

''احمد! پلیز ابھی نہیں.....'' میں ہمیشہ ہی اس موضوع پر بات کرنے سے گریز کر جاتی

اور احمد بھی زیادہ بحث نہ کرتے۔ لیکن احمد ہی کیا اس معاملے میں تو مجھے کئی بار اماں جان بھی سمجھا چکی تھیں۔

''آئمہ! میری بیٹی! میں جانتی ہوں کہ آج کل کی لڑکیاں زیادہ بچوں کو جھنجھٹ سمجھ کر ان سے جان بچاتی ہیں اور اللہ ہدایت دے انہیں جو یہ فیملی پلاننگ کا زہر اپنی رگوں میں اُتارتی ہیں۔''

وہ پہلے تو فیملی پلاننگ والوں کو خوب سناتیں پھر مجھے پیار سے اپنے پاس بٹھا کر کہتیں۔

''دیکھو میری جان! ہمارے جسم کا ہر عضو کام کرنا چاہتا ہے اور کسی عضو کو بھی اپنے وظیفہ کی انجام دہی سے روکا جائے گا تو پورے نظام کا توازن درہم برہم ہو جائے گا۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو ناں؟''

وہ بڑے طریقے سے بات کر کے مجھ سے پوچھتیں۔

''جی اماں جان!'' میں سعادت مندی سے سر ہلا کر کہہ دیتی حالانکہ مجھے اُن کی باتیں سمجھ نہ آ رہی ہوتی تھیں۔

''میری بیٹی! ایک عورت کو اولاد کی ضرورت صرف اس لیے نہیں ہوتی کہ وہ اس کی فطرت ممتا کا تقاضا ہوتا ہے۔ بلکہ اس کے سارے نظام جسمانی کو اللہ تعالیٰ نے بنایا ہی اس کام کے لیے ہے۔ تو ذرا سوچو!'' وہ میری جانب اک گہری سی نظر ڈالتی ہوئیں بولیں۔

''اگر وہ اپنے جسم کو اس کے مقصد تخلیق ہی کو پورا کرنے سے محروم رکھے گی تو پھر نہ صرف اس کا سارا نظام جسمانی زنگ آلود ہو کر رہ جائے گا بلکہ اس کی پوری شخصیت بے کیفی، محرومی اور شکست کا شکار ہو جائے گی۔ اس کا نقصان نہ صرف اس کا جسم اُٹھائے گا بلکہ وہ تو ذہنی طور پر نفسیاتی مریضہ بن کر رہ جائے گی.....''

اماں جان کے اس روز کے سمجھانے کے بعد میں دل ہی دل میں کتنا ہنسی تھی کہ یہ ہماری اماں جان بھی توبہ! کس قدر ڈرا دینے والی باتیں کرتی ہیں اور کیسی اول جلول سی جن کی کوئی Logic ہی نہیں ہوتی۔ مگر آج مجھے اُن کی اُن باتوں کی کچھ نہ کچھ Logic نہ صرف سمجھ آ رہی تھی بلکہ نظر بھی آ رہی تھی۔

''لیکن اب میں کیا کروں؟'' میرے سامنے پھر وہی کیا؟ سیدھا کھڑا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''مجھے یہ رپورٹس بہر حال احمد کو نہیں دکھانی چاہئیں۔''

میں نے کچھ سوچ کر اپنی میڈیکل رپورٹس تہہ کر کے اپنے ہینڈ بیگ میں چھپا لیں اور باہر جانے کو اٹھ کھڑی ہوئی۔

یہاں پر پھر میرے اندر کی خودسر اور کچھ حد تک خودغرض آئمہ مجھ پر حاوی ہو گئی تھی جو اپنی ذات کی مکمل تصویر پر کسی بھی ایسی چھینٹ کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھی جو اسے بدنما بناتی ہو۔

میرے اندر کوئی کمی ہو۔ میں یہ تسلیم کرنے کو خود بھی تیار نہ تھی۔ اِس لیے میں نے یہ بات سوچ لی تھی کہ میں نہ صرف آج بلکہ آنے والے کسی اور وقت میں بھی احمد سے اِس معاملے کو شیئر نہ کروں گی۔

''آئمہ! کیا کہا ڈاکٹر نے.....'' گاڑی میں بیٹھتے ہی احمد پوچھنے لگے۔

''ڈاکٹر نے..... ہاں۔ کہنا کیا تھا۔ یہی کہ سب ٹھیک ہے..... دوائیں کھائیں.....'' میں نے احمد کو ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں بتایا حالانکہ کلینک کے اندر کھڑے رہ کر میں نے ا اعتماد بحال کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔

''ارے واہ..... یہی سب تو مجھے بھی ڈاکٹر حیدر نے کہا ہے۔ لگتا ہے یہ دونوں میاں بیوی پہلے سے طے کر لیتے ہیں کہ کیا کہنا ہے۔'' احمد نے ڈاکٹر حیدر اور مہ نور کو مذاق سے کہا میں نے احمد کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل بھی فکر مند یا پریشان نہ تھے بلکہ خاصے بشاش دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ ورنہ مجھے بڑی فکر تھی کہ کہیں مجھ سے رپورٹس کے بارے میں نہ پوچھ لیں۔

''آئمہ!''

''جی''

''اب یہ دوائیں باقاعدگی سے استعمال کرنا..... پلیز.....'' انہوں نے ایک نظر مجھ ڈالتے ہوئے کہا۔

''احمد! آپ فکر نہ کریں۔ میری طرف سے کچھ غفلت نہ ہو گی.....''

میں نے دل سے کہا کیونکہ اب میں خود وہی چاہتی تھی جو احمد چاہتے تھے۔ احمد اِسی با

پر بے حد خوش تھے کہ میں نے سنجیدگی سے اِس مسئلے کی طرف توجہ دینی شروع کر دی ہے۔

''چلو آج ڈنر باہر کرتے ہیں۔'' احمد نے بہت دنوں کے بعد خوشگوار موڈ میں پوچھا۔

''ہاں۔ ٹھیک ہے۔'' میں بھی بڑی حد تک مطمئن ہو چکی تھی۔

''کہاں چلیں؟'' وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے۔

''جہاں مزاج یار میں آئے.....'' میں نے خوشی سے جواب دیا۔

''چلو پھر ''بلّے دے ڈیرے'' چلتے ہیں۔ پہلے گرما گرم حلیم اور کلیجے اور پھر لمبی سی سیر.....'' احمد آج واقعی بے حد خوش تھے۔ بلکہ ہم دونوں ہی خوش تھے۔ احمد نے کار کو تیسرے گیئر میں ڈالا اور بڑی ترنگ میں گنگنانے لگے۔

اُن کی آواز بڑی اچھی تھی۔ بھاری اور گھمبیر۔ کالج کے زمانے میں وہ کبھی کبھار دوستوں کی فرمائش پر اسٹیج پر بھی کوئی اچھی سی غزل سنا دیا کرتے تھے۔ میں اُنہیں دیکھ رہی تھی..... خوش شکل، خوش مزاج، خوش لباس اور دولت مند! اُن میں کوئی کمی نہ تھی۔ میں واقعی کتنی خوش قسمت تھی۔ میرے شریکِ سفر میں وہ ساری خوبیاں تھیں جو کسی بھی عورت کو خوشیاں اور آسائشیں دے سکتی ہیں۔ مجھے نادانستہ ہی راحت کا خیال آ گیا۔ راحت خود کتنی خوبصورت تھی سُرخ و سپید رنگت اور تیکھے نقوش۔ مگر اُس کا شوہر..... اُف..... اُس کے شوہر کا خیال آتے ہی مجھے جھنجھلاہٹ سی ہونے لگی۔ موٹا، چھوٹا سا قد..... اُس پر گہرا سانولا رنگ..... اُس کے ساتھ تو وہ ذرا بھی نہ جچتا تھا، اور پھر راحت نے ایک بار کس قدر دُکھی ہو کر بتایا تھا کہ وہ غصے کا تیز ہے اور بات کو جلدی نظر انداز نہیں کرتا۔

''اُف میرے اللہ.....'' کس قدر مشکل ہوتا ہو گا۔ راحت کا اپنے ایسے شوہر کے ساتھ گزارا..... مجھے جھرجھری سی آ گئی۔

''کیا ہوا.....'' احمد نے میرے بے ساختہ اُف کہنے پر پوچھا۔

''کچھ نہیں بس ایسے ہی.....'' میں نے ٹالنے کو کہہ دیا۔

''نہیں کچھ تو سوچ رہی تھیں۔ بتاؤ ناں؟'' وہ شرارت سے مسکرائے۔ ''دیکھوں تو۔ کہیں میرے بارے میں تو کچھ اُلٹا سیدھا نہیں سوچ رہی ہو۔''

''نہیں، وہ مجھے تو بے چاری راحت کا خیال آ گیا تھا.....'' میں نے سچ بتا دیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''راحت اور بے چاری!..... خیر تو ہے؟'' اُن کی حیرت بھی درست ہی تھی کیونکہ راحت کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر کوئی بھی اُسے بے چاری تصور نہ کرسکتا تھا۔

''احمد! آپ راحت کے شوہر سے تو ملے ہیں ناں؟'' میں نے احمد سے پوچھا۔

''ہاں ایک بار ملاقات ہوئی تو تھی..... وہ تمہاری این جی او کے کسی کنونشن پر شاید۔'' احمد نے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا۔

''بس میں اُسی کا سوچ رہی تھی کہ کیسا بدصورت سا شخص ہے۔'' میں نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

''اُس کا شوہر خوبصورت نہیں محض اِسی وجہ سے تم راحت کو بے چاری کہتی ہو؟'' وہ ہنستے ہوئے بولے۔

''نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ بدمزاج اور شکی بھی ہے۔'' میں نے اُس کی اضافی خامیاں بھی بیان کیں۔

''کمال ہے اس کے باوجود اس کی بیوی اتنی ماڈرن، سوشل اور آسودہ دکھائی دیتی ہے۔ حالانکہ شکی مزاج مرد کی بیوی اتنی آزاد خیال اور آزاد روش ہو نہیں سکتی۔'' اب احمد سنجیدہ ہو کر مجھ سے باتیں کرنے لگے۔

''یہ آزادی بھی اس شاطر شخص نے اُسے جان بوجھ کر دی ہے۔'' میں نے بات آگے بڑھائی۔

''اچھا وہ کیوں بھلا۔ اس میں اُس کا کیا مفاد.....؟'' احمد کو میری بات سمجھ نہ آئی۔

''احمد! آپ کو پتہ ہے ناں راحت کا شوہر انڈسٹریل بزنس سے وابستہ ہے اور ان کے کاروباری ٹیکس کتنے بھاری ہوتے ہیں۔''

''تو..... اِن ٹیکسوں کا راحت کی آزادی سے کیا واسطہ.....؟'' احمد اب الجھنے لگے۔ وہ واقعی بڑے سادہ لوح تھے یہ ہَل اور فریب کے کام انہیں نہ تو آتے تھے نہ ہی انہیں پسند تھے۔

میرے بھولے میاں صاحب۔ راحت کے سوشل ورکر ہونے سے اُس کے شوہر کو ان بھاری ٹیکسوں میں خاصی چھوٹ مل جاتی ہے۔ اِسی لیے تو میں آپ سے کہتی ہوں کہ آپ بھی کسی ویلفیئر کلب کے ممبر بن جائیں۔ سچ! شہرت کے علاوہ بھی اس کام کے بڑے مزے ہیں۔''

''یعنی؟'' میرے مذاق کے انداز پر بھی احمد کی سنجیدگی اور بڑھ گئی۔

''یعنی یہ بڑے بڑے مِل اونرز بزنس مین جب کسی سوشل ویلفیئر کے غیر سرکاری پلیٹ فارم پر جا کر کچھ رفاہِ عامہ کے کام کرنے لگتے ہیں، کسی بھی سماجی تنظیم خصوصاً عالمی سطح پر کام کرنے والی کسی تنظیم سے جڑ جاتے ہیں تو کچھ تو ان کے کاروباری ٹیکس ویسے ہی ہلکے ہو جاتے ہیں کہ یہ پہلے سے ''خدمتِ خلق'' کے کارکن ہوتے ہیں دوسرا ان کے آپس میں بھی تعلقات بڑھتے ہیں دوستیاں ہوتی ہیں اور پھر یہ ایک دوسرے کے مفادات کا خیال رکھتے ہیں۔ اور ہاں ان کی بیویاں بھی ایسے ہی میل جول اور دوستیوں کی بنیاد پر انہیں بہت سے فوائد دلواتی ہیں جیسے۔ جیسے راحت کی دوستی درِ شہوار سے بہت زیادہ ہے اور درِ شہوار کا شوہر اِنکم ٹیکس کلکٹر ہے..... اور جیسے تبسم کا میاں ٹھیکیدار ہے اور راضیہ کا شوہر ٹینڈر پاس کرتا ہے۔ ہوئے نا فوائد.....؟''

''تُف ہے..... ایسے مفادات پر اور اس سے بھی زیادہ اُن مفاد پرستوں پر جن کی سوچ اتنی گھٹیا ہے۔'' احمد کا موڈ ایک دم خراب ہو گیا۔

''اور یہ تمہارے کیا مفادات ہیں آئمہ احمد حسن! ذرا وہ تو مجھے آج بتاؤ.....'' وہ میری طرف شک کی نظروں سے دیکھنے لگے۔

''احمد پلیز! مجھے کیوں ایسے دیکھ رہے ہیں۔ میرے بھلا کیا مفادات ہوں گے؟'' میں ان کے بگڑتے تیور دیکھ کر پریشان ہو گئی۔

''ہاں ہے نا..... تمہارا مفاد بھی.....'' وہ بدستور شاکی تھے۔

''کیا مطلب.....؟'' مجھے خود پر اُٹھتی ان کی اُنگلی اچھی نہ لگی۔

''شہرت..... واہ واہ..... نفس پرستی، برتری کا احساس.....'' وہ اُس موڈ میں تھے۔ اِس سے پہلے کہ میں مزید اپنی صفائی میں کچھ کہتی وہ ذرا بلند آواز میں بولے۔

''بس اب بند کرو تم بھی ان سب کے ساتھ یہ ''خدمتِ خلق'' کا تماشہ..... اللہ معافی! ان خودغرضوں نے تو نیکی کی حقیقت بھی مسخ کر کے رکھ دی ہے۔ کھوٹے جذبوں کے ساتھ بھلا کبھی کوئی کسی کی فلاح کر سکتا ہے؟'' میں اِس وقت انہیں کوئی جواب نہ دینا چاہتی تھی اِس لیے چپ ہو گئی۔ اگلے تین چار منٹ تک وہ مسلسل پاکستان کے بیشتر (مجھ جیسے) سماج کے ٹھیکیداروں کو بے نقط سناتے رہے اور میں سنتی رہی۔ کیا کرتی بات تو میں نے خود ہی شروع

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی تھی اور اچھے خاصے ماحول اور مزاج کو برہم کر دیا تھا..... وہ تو شکر ہوا کہ ''بلے دا ڈیرہ'' آ گیا اور احمد چپ ہو گئے۔

''ارے واہ..... یہ کیا بنا.....'' میں نے گاڑی سے اُتر کر ایک نظر اپنے اطراف پر ڈالتے ہوئے کہا۔ میں اِس نئی جگہ پر پہلی بار آئی تھی۔

''یہ ٹیسٹ پلس والوں کا ہی ہے۔'' احمد نے شہر کے ایک مشہور ہوٹل کا نام لیا جن کے شہر بھر میں کئی فوڈ پوائنٹ تھے۔

مجھے واقعی یہ جگہ بے حد اچھی لگ رہی تھی۔ شہر سے دُور ایک مضافاتی علاقے میں کچے کوٹھے بنا کر خالص دیہی زندگی کی منظر کشی کی گئی تھی۔ ان کوٹھوں کی چھتیں سرکنڈوں سے بنے ہوئے چھپر تھیں، اندر بان کی چارپائیوں پر بچھے سوتی کھیس دیہاتی کھڈیوں کے بہترین نمونے دکھائی دے رہے تھے۔ ایسی ہی چارپائیاں باہر ڈیرے کے صحن میں بھی تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بچھائی گئی تھیں۔ احمد نے مجھے سارے ڈیرے کا ایک چکر لگوایا اور ایک ایک چیز دکھائی۔

''آؤ یہاں بیٹھتے ہیں۔'' آخر میں ہم صحن میں بچھی ایک چارپائی پر پاؤں اُوپر کر کے بیٹھ گئے۔ احمد کے مزاج کی برہمی اب پھر سے خوشگوار لہجے میں بدل چکی تھی۔ یہ اِسی پُرسکون فضا اور شہر کی آلودگی سے پاک ماحول کا اثر تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ کچھ دیر پہلے جو میرے اعصاب تناؤ کا شکار ہو چکے تھے وہ یہاں آ کر کیسے نرم اور بشاش ہو گئے تھے۔ احمد نے کھانے کا آرڈر دیا تو کچھ ہی دیر بعد ایک تہبند اور کُرتے میں ملبوس بیرا کھانا لے آیا۔ دیسی چینی کی پلیٹوں کے ساتھ ایک مٹی کی چھوٹی سی ہانڈی میں تڑکا لگا دیسی سرسوں کا ساگ اور مکئی کی دیسی گھی والی روٹیاں، چاٹی کی نمکین لسی اور پیتل کے یہ بڑے بڑے گلاس..... ''بلّے دے ڈیرے'' پر کوئی بھی برتن یا برتاؤ شہری تصنع اور بناوٹ والا نہ تھا۔ ہم دونوں نے سچ مچ ڈٹ کر کھانا کھایا۔ احمد کو تو ویسے بھی ساگ بے حد پسند تھا مگر مجھے بھی اس وقت وہ دنیا کی سب سے لذیذ ڈش لگا۔

کھانا کھانے کے کچھ دیر بعد تک ہم دونوں وہیں بنی نہر کے کنارے کچھ دیر ٹہلتے رہے۔ وہیں پر ایک چھوٹی دیہاتی لڑکی جس کی عمر کوئی آٹھ نو برس ہو گی ایک چنگیر میں کچھ

چیزیں لے کر آ گئی جن میں بچوں کے ہاتھ سے بنائے کھلونے نمایاں تھے۔

''لے لو بیگم صاحبہ بچوں کے لیے لے جاؤ۔'' وہ بڑی معصومیت سے کہہ رہی تھی۔

''یہ..... میں لے کر کیا کروں گی.....'' ایک دم ہی مجھے اپنی کم مائیگی کے احساس نے گھیر لیا۔

''لے لو ناں..... یہ دیکھو کالے موتیوں والا کڑا۔ یہ میں نے خود بُنا ہے۔ آپ اپنی بیٹی یا بیٹے کے ہاتھ میں ڈالنا اُسے نظر نہیں لگے گی.....''

وہ اپنے بُنے ہوئے موتیوں کے کڑے کی صفتیں بیان کرنے لگی جبکہ مجھ سے اپنے چہرے پر پھیلتی زردیوں کو چھپانا مشکل ہونے لگا۔

''مجھے نہیں چاہیے۔'' میں نے پیار سے اُس کے گال سہلاتے ہوئے کہا۔

''اچھا چلو یہ لے لو۔ یہ پونیاں۔ اِس میں ستارے اور نگ بھی لگے ہیں آپ کی بیٹی کے بالوں میں جگ مگ جگ مگ کریں گے.....'' اُس نے فوراً ہی کچھ پونیاں اُٹھا کر میرے سامنے کر دیں۔

''کہا ناں نہیں نہیں۔ اب جاؤ بھی۔ یہ مانگنے کے اچھے ڈھنگ ہیں۔'' میں نے اُسے اچھا بھلا ڈانٹ دیا۔

''بیگم صاحبہ! نہیں لینی نہ لو..... مگر ہم بھکاری نہیں ہیں میری ماں اور ہم بہن بھائی بڑی محنت سے بناتے ہیں یہ چیزیں.....'' وہ بُرا مناتے ہوئے کہنے لگی۔

''ارے ارے..... اِدھر آؤ..... مجھے دکھاؤ کیا ہے تمہارے پاس.....'' احمد نے پلٹ کر واپس جاتی اس بچی کو لپک کر پکڑ لیا اور اُسے پیار کرتے ہوئے اُس سے چیزیں دیکھنے لگے۔

''احمد! یہ سب فضول ہیں چھوڑیں آپ.....'' مجھے پتہ نہیں کیا ہو گیا تھا کہ میں وہاں سے جلدی جانا چاہتی تھی۔

''اچھا لاؤ یہ سب مجھے دے دو۔ کتنے روپے دوں.....؟'' احمد نے میری بات کو نظر انداز کر کے وہ ساری چیزیں اس سے لے لیں۔

''صاحب! پچاس روپے.....'' اُس بچی نے مگن کر وہ چیزیں احمد کے حوالے کرتے ہوئے قیمت بتائی.....

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اچھا تم یہ سو روپے رکھ لو.....'' احمد نے ایک سُرخ نوٹ اُس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

''نہیں صاحب! ماں مارے گی۔ بس آپ پچاس روپے ہی دے دو۔ ماں منع کرتی ہے کہ کسی سے فالتو پیسے نہیں لینے اور چیزیں بیچ کر ہی پیسے لینے ہیں۔'' وہ ڈرتے ہوئے لہجے میں بولی اور سو کا نوٹ احمد کو واپس کر دیا۔

''بھئی تمہاری ماں تو بڑی اچھی باتیں سکھاتی ہیں۔ شاباش! محنت کر کے ہی کماتے ہیں کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلانا چاہیے۔'' احمد نے اُس بچی کو پیار کیا اور سو روپے کا نوٹ کا واپس لے کر پچاس روپے کا نوٹ اُسے تھما دیا کچھ دیر بعد ہم ''بلّے دے ڈیرے'' سے واپس آ گئے۔ راستے میں احمد نے وہ پونیاں ہاتھ میں لے کر فقط اتنا کہا تھا۔

''آئمہ! واقعی اگر یہ پونیاں میری بیٹی کے بالوں میں لگی ہوں تو کیسے جگ مگ جگ مگ کرنے لگیں۔ بالکل اُس بچی کی آنکھوں سے پھوٹنے والی ان شعاعوں کی طرح جو پچاس روپے کما کر چمک اٹھی تھیں۔''

اور یہ سن کر سارے رستے میرے بیگ میں چھپی ہوئی میری میڈیکل رپورٹس جانے کیوں کسمساتیں رہیں اور میرا دل اُنہیں لوریاں سنا سنا کر بہلاتا رہا۔

❁❁❁

احمد کی میڈیکل رپورٹس لینے بھی میں خود ہی گئی اور راحت یا احمد دونوں میں سے کسی کو بھی اپنے ساتھ نہ لے کر گئی۔ میں نے اس روز ڈاکٹر مہ نور سے ملنا بھی مناسب نہ سمجھا اور لیبارٹری انچارج سے رپورٹس لے کر کلینک سے باہر ہی باہر واپس آ گئی۔ احمد بالکل صحت مند تھے۔ یہ بات میرے لیے جہاں خوشی کا باعث تھی وہیں پر مجھے اپنے بارے میں کچھ فکرمندی مزید لاحق ہو گئی تھی۔ میں نے اپنا علاج پوری دلجمعی کے ساتھ شروع کر دیا تھا اور ساری دوائیں بے حد ذمہ داری سے استعمال کر رہی تھی۔ ایک بچے کی خواہش میرے اندر جس قدر شدت اختیار کر رہی تھی اُسی قدر میرے اندر کچھ خالی ہوتا جا رہا تھا۔ احمد سے بے انتہا محبت ہونے کے باوجود میں نے اُن کی رپورٹس کو ضائع کر دیا تھا انہیں دکھائے بغیر اور اتنا کہہ کر ان کی تسلی کرا دی تھی کہ میں نے فون پر آپ کی رپورٹس کے بارے میں پوچھ لیا تھا، ڈاکٹر حیدر کہہ رہے تھے سب کچھ ٹھیک ہے بس ویسے ہی کچھ دیر ہے۔ شاید یہ دیر کسی بہت بہتر اَجر کے لیے ہو۔

''چلو جو خدا کی مرضی.....'' احمد نے بھی زیادہ کُریدنہ کی اور یوں بات آئی گئی ہو گئی۔

مجھے علاج کراتے چھ ماہ بیت گئے مگر میں اللہ کی رحمت سے محروم ہی رہی۔ اب تو میرے ساتھ ساتھ میری مما اور احمد کی اماں جان کو بھی بے حد پریشانی لاحق تھی اور احمد بھی بے حد اُداس رہنے لگے تھے۔ وہ کئی بار مجھے کہہ چکے تھے کہ چلو ملک سے باہر کسی ماہر گائنا کالوجسٹ سے مشورہ کرتے ہیں مگر میں اِدھر اُدھر کی باتوں میں ٹال جاتی تھی۔ مگر ایسا کب تک چلتا ایک روز اماں جان اپنی کسی رشتہ دار خاتون سے مل کر آئیں تو اصرار کرنے لگیں کہ کراچی میں آغا خان ہسپتال چلو وہاں پر جدید طریقہ علاج سے بہت کچھ ممکن ہے مگر میں پھر بھی دامن بچاتی رہی لیکن وہ نہ مانیں۔ آخر مجھے کہنا ہی پڑا ''ٹھیک ہے اماں جان میں احمد سے کہتی ہوں کہ وہ کراچی جانے کا پروگرام بنائیں۔'' میں نے یہ کہہ کر اپنی جان چھڑائی مگر وہ میرے ساتھ ساتھ احمد کو بھی وہاں جانے پر راضی کر رہی تھیں چنانچہ احمد نے وہاں جانے کی ہامی فوراً بھر لی۔ تب مجھے کوئی چارہ نظر نہ آیا تو میں دوبارہ ڈاکٹر مہ نور کے پاس جا پہنچی۔ اُس نے نئے سرے سے میرے ٹیسٹ کروائے تاکہ ہم لوگ پہلے سے ہی جان لیں کہ خرابی کہاں اور کس میں ہے۔ اِس بار رزلٹ آئے تو میرے لیے قیامت سے کم نہ تھے۔ ڈاکٹر مہ نور بے حد پریشان تھی۔

''مسز احمد! وہی کچھ ہوا جس کا مجھے ڈر تھا.....''

''کک.....کیا مطلب.....؟'' میرے گلے سے تو آواز بھی نہ نکل رہی تھی۔

''پہلے آپ یہ بتائیں کہ شادی کے ساتھ ہی فیملی پلاننگ کا مشورہ آپ کو کس نے دیا تھا؟''

''کس نے دینا تھا میں خود تعلیم یافتہ ہوں۔ مجھے فوری طور پر ماں نہیں بننا تھا اِس لیے میں نے.....'' میں اپنی بات کی وضاحت بھی پوری طرح سے نہ کر سکی۔

''اچھا آپ نے کسی لیڈی ڈاکٹر سے مشورہ کر کے دوائیں شروع کی تھیں؟'' وہ باقاعدہ مین میخ نکال رہی تھی۔

''ظاہر ہے میں نے پوچھ کر ہی کی تھیں۔''

''کیا اُس ڈاکٹر نے ان ادویات کے استعمال کے مشورے سے پہلے آپ کا طبی معائنہ کیا تھا۔''

''پہلے تو نہیں۔ مگر کیوں؟'' میں اُس کے سوالات سے اُکتا گئی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''یہیں..... بالکل یہیں پر غلطی ہوگئی۔ آپ سے اور آپ کی ڈاکٹر سے..... اور وہی ذرا سی غلطی آپ کے لیے زندگی بھر کا نقصان بھی بن سکتی ہے خدانخواستہ۔'' پھر ڈاکٹر مہ نور نے مجھے جو تفصیل بتائی وہ کچھ یوں تھی۔

''آئمہ! آپ میں بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت قدرتی طور پر بھی کچھ سُست تھی یعنی ٹیوبز میں پہلے سے کچھ پیچیدگی تھی اُس پر آپ نے ادویات بھی استعمال کرنا شروع کر دیں۔ یوں وہ نظامِ کار جو پہلے ہی سُست روی کا شکار تھا اور بھی ناکارہ کر دیا گیا اور اب نتیجہ یہ ہے کہ آپ کے ہارمونز میں بھی خاصی گڑبڑ ہے اور ٹیوبز میں بھی..... لہٰذا.....''

''لہٰذا کیا مہ نور؟'' مجھے زمین آسمان گھومتے دکھائی دینے لگے۔

''لہٰذا ہمیں جو اُمید تھی وہ اب ہے تو سہی مگر موہوم سی ہے۔ سمجھیں اک چراغ سرِ دیوار دھرا ہے اور طوفانی ہوا کے جھونکے ہیں۔ دُعا کریں رحمتِ خداوندی جوش میں آجائے اور ہوا یک لخت بند ہو جائے..... پھر ہم اس لَو سے اور دِیے جلانے کی ہمت پکڑ سکتے ہیں۔''

''لیکن ڈاکٹر مہ نور تم نے تو کہا تھا کہ علاج سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' میں سچ مچ رو پڑی.....

''میں اب بھی اپنے کہے پر قائم ہوں کہ ایک مسلمان کا خدا پر بھروسہ تو کبھی بھی نہیں ٹوٹتا..... مگر حقیقت کی تلخی سے بھی تو ہمیں آگاہ رہنا چاہیے۔'' وہ مجھ سے کچھ بھی نہ چھپا رہی تھی۔

''آپ صبر اور حوصلے سے کام لیں اور اپنے شوہر کو سب کچھ سچ سچ بتا دیں.....'' وہ مجھے حوصلہ دیتے ہوئے بولی۔

''احمد کو؟'' میں سٹپٹا گئی.....

''ہاں..... یہ بے حد ضروری ہے۔''

''لیکن وہ تو پریشان ہو جائیں گے اور ہو سکتا ہے غصے میں آکر مجھے کچھ.....''

بات ادھوری چھوڑ کر میں اس کا چہرہ تکنے لگی جیسے وہی مجھے اس مشکل سے نکالنے والی ہو۔

''آج کا غصہ اور پریشانی سہہ لیں تاکہ آپ کے کل میں مزید الجھنیں نہ ہوں جو اس سچ کو چھپانے سے پیدا ہو سکتی ہیں۔'' وہ مجھے بہت سی مثالوں اور طریقوں سے سمجھاتی رہی مگر میرے کانوں میں اُس کی آواز کہاں پڑ رہی تھی وہاں تو طوفانی جھکڑ چل رہے تھے۔

❁❁❁

ڈاکٹر مہ نور کے کلینک سے میں جب نکلی تو مجھے کچھ سمجھ نہ آرہی تھی کہ میں کیا کروں۔ میرے سامنے اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ میں نے انجانے میں اپنے ساتھ بہت بُرا کر لیا تھا۔ میں نے تعلیم یافتہ ہوتے ہوئے بھی خود کو اپنے حق سے محروم کر دیا تھا۔ ''حقوقِ نسواں'' کے پرچار میں اپنی ہی نسوانیت کی تکمیل کو بھلا دیا تھا۔ کتنی ظالم تھی میں!

کیسی جاہل تھی میں!

میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اب کبھی گھر نہ جاؤں اور کہیں دُور نکل جاؤں..... بہت دُور جہاں سے واپس نہ آسکوں۔ کسی ٹرک میں گاڑی دے ماروں یہ قصہ ہی ختم ہو جائے۔

میرے گرد مختلف آوازیں تھیں۔ شور تھا..... قہقہے تھے..... جو مجھ پر لگائے جا رہے تھے، اور ایک ہی فقرہ تھا جو زہر میں بجھے تیر کی طرح میرے دل و دماغ کو چھلنی کیے جا رہا تھا۔

آئمہ! اب تم کبھی ماں نہیں بن سکتیں۔

آئمہ! تم ماں بننے کے قابل ہی نہیں ہو۔

تم بنجر زمین ہو۔ بانجھ ہو..... بانجھ.....

بلکہ نہیں..... تم نے خود کو بانجھ کر لیا ہے۔

تم تو دراصل قاتل ہو۔

اُن کلکاریوں کی قاتل جو تمہارے وجود سے اُٹھ سکتی تھیں.....

❁❁❁

اِس قدر بڑے ذہنی دھچکے کے بعد میں بیمار پڑ گئی۔ اُسی رات مجھے بلڈ پریشر ہائی ہو جانے کے باعث ہسپتال داخل کرانا پڑا جہاں میں تقریباً دو روز تک نیم جاں سی پڑی رہی۔ میرا جسم میرے دماغ کے بیمار ہو جانے کے باعث ایک دم ہی لاغر ہو گیا تھا اور جی اُچاٹ..... کچھ بھی اچھا نہ لگ رہا تھا۔ نہ والدین نہ شوہر..... حالانکہ سبھی میری عیادت اور خدمت میں جُتے تھے۔ مما تو مجھے دیکھ دیکھ کر رو رہی تھیں اور میں ان سے آنکھیں نہ ملا پا رہی تھی۔ مجھے احمد کے وجود سے بھی بے زاری ہو رہی تھی حالانکہ وہ میرے لیے شب و روز ایک کیے ہوئے تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''مما! آپ مجھے اپنے ساتھ گھر لے چلیں.....'' مجھے کچھ اور نہ سُوجھا تو میں نے اُن کے ساتھ جانے کی ٹھان لی شاید میں اس وقت حالات سے فرار چاہتی تھی مگر حالات تو بظاہر ٹھیک ہی تھے۔ میں کس ذہنی کرب سے گزر رہی ہوں میرے ساتھ کیا سانحہ بیت چکا ہے اس کی کسی کو خبر نہ تھی۔ اِس لیے کہ بظاہر تو سب کچھ معمول کے مطابق تھا، سب کی محبتیں ویسی ہی تھیں۔

''مما! میں آپ کے ساتھ جاؤں گی کچھ روز کے لیے.....'' میں نے اپنی بات دہرائی۔

''ہاں ہاں ضرور میری جان.....'' مما کے ساتھ ساتھ پاپا نے بھی پیار سے کہا۔

''کیوں احمد بیٹے ہم آئمہ کو چند روز کے لیے لے جائیں اُدھر.....؟'' ''جی مما لے جائیں..... اچھا ہے اس کا دل بہلا رہے گا۔ خدا جانے اس نے کیا ٹینشن لے لی ہے۔'' احمد نے میری طرف محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ٹینشن..... کیسی ٹینشن؟ مجھے کوئی ٹینشن نہیں اور پھر کس بات کی ہوگی؟'' میں خواہ مخواہ ہی صفائی پیش کرنے لگی۔

''بیٹی اللہ نہ کرے تمہیں کوئی ٹینشن ہو۔ جاؤ کچھ دن گزار آؤ اُدھر.....'' اماں جان نے میرے پاس آکر میرے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

میں نے پھر شور مچا دیا ''میں ٹھیک ہوں..... مجھے گھر جانا ہے۔ یہاں میرا دم گھٹ رہا ہے۔''

جانے کیوں میں بیمار لوگوں کی طرح پیش آرہی تھی..... ذہنی بیمار لوگوں کی طرح۔ احمد نے ہسپتال والوں سے زبردستی مجھے ڈسچارج کروایا حالانکہ وہ ابھی مجھے گھر نہ بھیج رہے تھے۔ میرا بلڈ پریشر ابھی بھی نارمل نہ تھا مگر میں سدا کی ضدی تھی۔ بھلا میری ضد کے سامنے کسی کی کہاں چلتی تھی۔ اِس لیے میں نے چھٹی لے کر ہی دم لیا۔

❁❁❁

مما کی طرف آکر بظاہر تو میں کچھ پُرسکون ہوگئی تھی مگر میرے اندر ہونے والی کُھسر پُھسر مجھے یہاں بھی قرار نہ لینے دے رہی تھی۔ میرے اندر خیالات کا اِک جمگھٹا تھا اور میں اس بھیڑ میں شدید گھبراہٹ کا شکار تھی۔ سونے کو لیٹتی تو وہ بھیڑ میری پلکوں تلے چلی آتی۔ اُٹھ کر بیٹھتی تو کئی بدشکل سے ہیولے میرے ساتھ اُٹھ بیٹھتے۔ ان کے دھڑوں پر جو سَر دھرے تھے وہ سب کے سب سوالیہ نشان تھے۔ ایک آنکھ والے دجّال جیسے خوفناک..... جن کے بڑے بڑے ہولناک دہانوں سے ایک ہی سوال مجھ پر لپک رہا تھا۔

''آئمہ! اب تم کیا کروگی.....؟''

''آئمہ! اب تمہارا کیا بنے گا.....؟''

''مما..... مما!'' اپنے اندر کے شور سے گھبرا کر میں اُنہیں زور زور سے آوازیں دینے لگی۔

''جی میری جان! کیا ہوا؟'' اگلے ہی لمحے مما میرے پاس تھیں۔

''یہ..... یہ سُوپ کس نے بنایا ہے..... اتنا بدذائقہ۔'' میں نے خواہ مخواہ ہی اپنے سامنے دھرے سُوپ میں نقص نکالا۔

''یہ رضیہ نے بنایا ہے..... میں ذرا تمہارے پاپا کی تیاری کر رہی تھی وہ بزنس ٹور پر ملک سے باہر جا رہے ہیں۔'' پاپا نے آرمی سے ریٹائرمنٹ کے ساتھ ہی اپنا کوئی بزنس شروع کرلیا تھا، آج کل وہ اِسی سلسلے میں خاصے مصروف رہتے تھے۔

مما نے گویا اپنی طرف سے مجھے معذرت پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ کیوں خود میرا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سُوپ نہیں بنا سکیں۔

''اچھا..... پردہ زبیدہ بی بی کہاں ہے۔ وہ بنا دیتی.....''

زبیدہ ہماری پرانی ملازمہ تھی اور اگر کبھی ضرورت پڑتی تو کچن میں مما کا ہاتھ بٹا دیتی تھی۔ ویسے وہ ہمارے مالی کی بیوی تھی اور گھر میں کپڑوں کی دُھلائی وغیرہ کرتی تھی۔

''زبیدہ اب کام نہیں کرتی.....'' مما نے مجھے اطلاع دی۔

''کیا مطلب کام نہیں کرتی؟'' مجھے کچھ حیرت ہوئی۔

''مطلب یہ کہ اب اُسے کام کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔'' مما نے ذرا مسکرا کر کہا۔ مگر ان کی مسکراہٹ کے ساتھ پھر ادھورے سے جواب نے مجھے مطمئن نہ کیا۔ میری غیر مطمئن صورت دیکھ کر مما نے مجھے بتانا شروع کیا۔

''دراصل اُس کا بڑا بیٹا نوکری لگ گیا ہے اور اب اسے کام نہیں کرنے دیتا۔''

''کون..... طالب؟'' میں نے زبیدہ کے بڑے بیٹے کا نام لیا۔

''ہاں طالب.....! وہ اب تمہارے پاپا کے آفس میں ہے اور اُن کے اکاؤنٹینٹ کی مدد کرتا ہے۔''

''پاپا نے اُسے کب رکھا اور کیوں؟'' میں نے کچھ خوشی کا اظہار نہ کیا۔

''کیوں کا کیا مطلب؟ بیٹا! وہ اس قابل تھا اور پھر گھر کا دیکھا بھالا بچہ ہے ایماندار اور نمک خوار والدین کی اولاد ہے۔ تمہارے پاپا اُسے اچھی طرح سے جانتے ہیں۔'' مما کو میرے چہرے پر اُس کے لیے ناگواری اچھی نہ لگی تھی۔

''پاپا غلطی کر رہے ہیں اُسے رکھ کے۔ یہ لوگ اس قابل ہوتے ہی نہیں کہ انہیں عزت سے اپنے برابر لایا جائے.....''

مجھے پھر بھی پاپا اور مما کے اس فیصلے سے اختلاف تھا جو انہوں نے اپنی فطری رحم دلی کے تحت کیا تھا۔

''آئمہ! بُری بات.....'' مما نے مجھے ڈانٹا۔

''اللہ سے توبہ کرو۔ کس قدر تکبر اور بڑائی ہے تمہارے لہجے میں.....'' وہ مجھ سے کچھ ناراض ہو گئیں اور پھر سُوپ کا پیالہ اُٹھا کر مزید کچھ کہے بغیر چلی گئیں اور میں زبیدہ کے

بارے میں سوچتی ہوئی تلملانے لگی۔

''ہونہہ..... اب کام نہیں کرے گی۔ بیٹا نوکری لگ گیا ہے اور ماں کو کام نہیں کرنے دے گا۔ کل تک ہمارے ٹکڑوں پر پلنے والا آج ہمارے ہی گھر پر کام کرنے سے روکے گا.....؟''

مجھے خواہ مخواہ ہی غصہ آ رہا تھا۔

یہ مما اور پاپا بھی نوکروں کو بہت سر چڑھا لیتے ہیں۔ ذرا اس طالب حسین کے نخرے تو دیکھو۔ آج میرے ہی پاپا کا ملازم ہو کر اُنہی کے گھر سے ماں کو روک رہا ہے۔ یہ..... یہ خود کل کو ذرا اور تجربہ کار ہو گیا تو پاپا کو ہی سب سے پہلے چھوڑے گا یہ کہتے ہوئے کہ اب میں اس قابل ہوں کہ خود اپنا کاروبار کر سکوں۔ یہ چھوٹے لوگ۔ کم ذات..... کم ظرف۔ کبھی وفادار اور نمک خوار نہیں ہوتے..... مما اور پاپا جیسے بھولے لوگ ان کے اندر کے گھناؤنے چہرے نہیں دیکھ سکتے۔ مگر میں تو پاپا کو ایسے نہیں کرنے دوں گی۔ میں سلگتے ذہن کے ساتھ بلاوجہ ہی زبیدہ کے کوارٹر کی طرف چل دی۔ شاید اُس سے لڑنے..... یا اُسے اُس کی اوقات یاد دلانے۔

دو ٹکے کی ملازمہ اور انداز بیگموں والے۔ میں سخت غصے میں تھی۔

❀❀❀

''اوہیلو آئمہ! کیا حال ہے؟''

میں زبیدہ بی بی کے کوارٹر کی طرف جا رہی تھی جب راحت اور نگار مجھے پورچ میں ہی مل گئیں۔ وہ مجھے پوچھنے آ رہی تھیں۔

''ٹھیک ہوں، تھینک یُو۔'' میں نے اُن دونوں سے باری باری گلے ملتے ہوئے کہا۔

''او تھینک گاڈ۔ ہمیں تو تمہاری بہت فکر ہو رہی تھی۔'' راحت نے اپنے مخصوص انداز میں پوز کرتے ہوئے کہا۔ میں زبیدہ بی بی والا غصہ اُس وقت بھول کر اُنہیں اپنے ساتھ لیے ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

''آئمہ ڈیئر! خیر تو تھی۔ اچانک کیا ہوا کہ تم ہسپتال ہی پہنچ گئیں۔'' نگار پوچھنے لگی۔

''بس ذرا بلڈ پریشر اَپ سیٹ ہو گیا تھا۔'' میں نے آرام سے جواب دیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اِسے ذرا سا بلڈ پریشر اَپ سیٹ کہتے ہیں؟''

راحت نے مجھے سر سے پیر تک گھورتے ہوئے کہا۔ اُس کا اشارہ میری زرد صورت کی طرف تھا۔

''دیکھو ذرا کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے.....؟'' وہ مجھے چپ پا کر مجھ سے اور بھی محبت جتانے لگی۔

''اچھا خیر چھوڑو تم یہ سب باتیں، بتاؤ چائے، کافی یا پھر کولڈ ڈرنکس؟'' میں نے اُن کا دھیان اپنی طرف سے ہٹانے کو پوچھا۔ مجھے پتہ تھا وہ شروع ہوگئی تو بال کی کھال اُتار کر دم لے گی۔

''کچھ بھی نہیں میں تو ڈائٹنگ پر ہوں۔''

''اور میں بھی۔'' اُن دونوں نے باری باری کندھے اُچکاتے ہوئے جواب دیا۔

''تو ڈائٹ کوک لے لو.....'' میں نے اصرار کیا۔

''ہرگز نہیں..... جائے گی تو پیٹ میں ہی..... اور میری تو پہلے ہی ٹمی نکل آئی ہے۔'' راحت نے اپنی قمیص کی فٹنگ ذرا کستے ہوئے کہا۔ ''اُف توبہ ہے راحت۔ اب اس سے زیادہ تم کیا سمارٹ ہوگی دو بچوں کی ماں ہو آخر۔ یہ اتنا سا پیٹ تو بنتا ہے.....''

نگار نے تو اُس کے لتے ہی لینے شروع کر دیئے۔

''یہ بھی اُن دو کی ہی دین ہے۔''

راحت نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

''یار! یہ بچوں کے بعد اچھا بھلا فِگر برباد ہو جاتا ہے۔ بس پھر تو عمر بھر ڈائٹنگ ہی کرتے رہو۔ ورنہ ایسے ہو جاؤ۔ ڈی شیپ..... موٹے، بھدے.....''

نگار نے واقعی ٹریک پکڑ لیا۔ اُسے تو چابی کی ضرورت ہوتی تھی۔ ذرا سی لگی اور محترمہ کی نان اسٹاپ بک بک شروع ہو جاتی تھی۔ میں صوفے کی پشت سے سر ٹیک کر ان دونوں کے مباحثے سے لطف اندوز ہونے لگی۔

اِتنے میں مما کی نئی ملازمہ ڈرائنگ رُوم میں داخل ہوئی۔

''سلام بی بی۔'' وہ ہاتھ میں پکڑی پھلوں والی ٹوکری اور پلیٹیں وغیرہ میز پر رکھنے لگی۔

''کیا نام ہے تمہارا.....؟'' راحت نے اُسے سر سے پاؤں تک گھورتے ہوئے کہا۔

''جی میرا نام شمو ہے۔'' اُس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا اور پلیٹیں سب کو پیش کرنے لگی۔

''نہیں رہنے دو۔'' اُن دونوں نے تکلف سے کہا تو اُس نے مسکرا کر پلیٹیں واپس میز پر رکھ دیں اور مؤدب کھڑی ہو کر پوچھنے لگی۔

''کچھ اور لے آؤں بیگم صاحبہ.....''

میں نے ایک پل کو سوچا۔

''اچھا تم ایسا کرو مما سے کہو کہ گرین ٹی بنوا دیں اور سنو میرے کمرے میں لے آنا۔''

''ہاں ٹھیک ہے تمہارے کمرے میں چل کر بیٹھتے ہیں یہاں ڈرائنگ روم میں کیا مہمانوں کی طرح منہ سی کر بیٹھے رہیں۔''

''تم اور منہ سی کر بیٹھو.....؟ تم کہیں بھی ایسا نہیں کر سکتی ہو۔ ہر جگہ اپنے ساتھ والے کا بھیجا ہی کھاتی رہتی ہو.....''

راحت نے اُس کی کمر پر ایک دھموکا لگایا اور ہم تینوں ہنستی ہوئی ڈرائنگ رُوم سے باہر نکل آئیں۔

مما نے گرین ٹی کے ساتھ کچھ سینڈوچ وغیرہ بھی بھیج دیئے۔ پھر وہ خود آ کر ان دونوں سے مل کر بھی گئیں اور کہہ گئیں کہ اب وہ دونوں دوپہر کا کھانا کھا کر ہی جائیں گی۔ مما کی محبت اور اصرار کے سامنے دونوں کا ڈائٹ پلان زیادہ دیر نہ چل سکا اور انہیں ہاں کرنی ہی پڑی۔

''نقصان دِہ بات کھانا کھانے میں نہیں ہے بلکہ کھانا کھا کر کام نہ کرنے میں ہے۔ آج کل کی لڑکیاں سارا سارا دن پڑی سوتی رہیں یا پھر ریموٹ ہاتھ میں لیے ٹیلی ویژن کے چینلز بدلتی رہیں تو موٹاپا نہ چڑھے گا تو اور کیا ہوگا۔'' وہ دونوں کھسیانی سی ہنسی کے ساتھ بولیں۔

''بالکل آنٹی! آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' مما چلی گئیں اور شمو ہمیں چائے پیش کرنے لگی۔

''شمو! تمہاری شادی ہوگئی۔'' نگار نے فوراً ہی اُس کا انٹرویو لینا شروع کر دیا۔

''جی بیگم صاحبہ نو سال ہو گئے میری شادی کو.....'' اُس نے مسکرا کر جواب دیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''نو سال.....اور بچے کتنے ہیں تمہارے؟''

اُس نے حیرت سے اُس کے سراپے پر نظر ڈالی۔

''جی میرے چار بچے ہیں خیر سے.....تین بیٹے اور ایک بیٹی.....'' اُس نے بڑے فخر سے بتایا۔

''او مائی گاڈ.....چار بچے.....'' اب تو وہ باقاعدہ اُٹھ کر اُسے گھورنے لگی۔

''لگتا ہے ان غریبوں کو بچے پیدا کرنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں ہوتا؟'' راحت نے اپنی طرف سے شمو پر طنز کیا۔

''تمہارا میاں کام کیا کرتا ہے؟'' نگار نے اُس سے یوں پوچھا جیسے کسی مجرم کے بارے میں تفتیش کر رہی ہو۔

''کیا مطلب کرتا کیا ہے؟'' راحت نے اُس کا مذاق اُڑانے والے ذومعنی انداز میں نگار کو گھورا۔

''میرا مطلب ہے تمہارا میاں اور کیا کام کرتا ہے؟''

راحت بھی نگار سے دو ہاتھ آگے تھی اور نگار اُس کا بھی اگلا حصہ۔ ''جی وہ چوکیدار ہے بڑے صاحب کے دفتر میں.....'' شمو کے چہرے پر سجی وہ مسکراہٹ اُن دونوں کے مذاق کی وجہ سے معدوم ہوگئی۔ وہ سر جھکا کر برتن سمیٹنے لگی۔

''ایک چوکیدار اور اولاد پیدا کرنے کا اتنا شوق.....؟ کچھ تو سمجھاؤ اُسے اور کچھ اس بے چارے ملک پر ہی رحم کرو جو پہلے ہی غربت اور بے روزگاری کی دلدل میں دن بہ دن دھنستا جا رہا ہے۔ اور اس کی وجہ ہے تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی۔ جو تم جیسے جاہل لوگ بڑے شوق سے بڑھا رہے ہیں۔'' اب نگار نے اُسے باقاعدہ لتاڑنا شروع کر دیا تھا جیسے وہی بے چاری غربت اور بے روزگاری کی ذمہ دار تھی۔

''اچھا یہ بتاؤ کہ اب تمہارا اور بچے پیدا کرنے کا بھی ارادہ ہے یا توبہ کر چکی ہو؟'' راحت نے بڑے نازیبا انداز میں اُسے کریدا۔

''جی میری کیا مجال.....یہ تو اللہ کی مرضی ہے۔'' وہ دھیرے سے بولی دراصل اب وہ ان دونوں کے سوالات سے گھبرا چکی تھی۔

''لو اور سنو.....اللہ کی مرضی.....؟ یہ.....یہی تو جہالت ہے کہ ہم لوگ کچھ سمجھتے نہیں اور خود کچھ کرتے نہیں۔ ہر اچھی بُری بات کو اللہ کی مرضی سے منسوب کر دیتے ہیں.....اللہ کی مرضی.....'' اب تو نگار بیگم کو غصہ ہی آ گیا جس پر میں نے اُسے ٹالنے کو کہا۔

''جانے دو نگار! کیوں اس بے چاری کے پیچھے پڑ گئی ہو۔ شمو! تم جاؤ۔''

''واہ تم اچھی حقوقِ نسواں کی علمبردار ہو اُسے سمجھانے کی بجائے کہہ رہی ہو۔ جاؤ.....ارے بھئی اِسے بتاؤ کہ وہ اپنا خیال کرے۔ کیا اپنی صحت جوانی اپنا وقت.....صرف بچے پیدا کرنے اور انہیں پالنے میں ضائع کر دے گی۔'' نگار اس وقت ایک مکمل پاسدارانِ حقوقِ نسواں دکھائی دے رہی تھی۔

''اچھا بابا! تم سمجھا لو اِسے، اگر یہ سمجھتی ہے تو.....؟''

میں نے اس سے مزید بحث نہ کی اور چپ کر کے اُس کا وہ لیکچر سننے لگی جو وہ شمو کو دے رہی تھی۔ جسے شمو نے بھی چپ چاپ سر جھکا کر سنا اور آخر وہ صرف اتنا بولی۔

''بیگم صاحبہ ہر آنے والا جی اپنی قسمت اپنے ساتھ لے کر آتا ہے اور پھر کھلانے اور پالنے والا تو رب ہے ہم کون ہوتے ہیں جی۔ پھر بھی میں آپ کے کہے پر عمل کرنے کی کوشش کروں گی.....''

لگتا تھا وہ بڑی سمجھدار تھی، اپنی بات بھی کہہ گئی اور نگار کا کہا بھی رکھ گئی۔ اُس نے خالی برتنوں کی ٹرے اُٹھائی اور واپس جانے لگی۔

''اچھا رکو۔'' راحت نے اُسے جانے کیوں روک لیا۔

''جی.....'' وہ فوراً ہی پلٹی۔

''یہ تو بتاؤ کہ چار بچے پیدا کر کے بھی تم اتنی دُبلی پتلی سی ہو۔ تمہارا پیٹ بھی بالکل کمر کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ آخر تم نے کیا کیا ہے؟''

راحت اُس کی اسمارٹنیس کا راز جاننا چاہ رہی تھی۔

''کرنا کیا ہے جی بس کام کرتی ہوں دن بھر۔'' وہ سادگی سے بولی۔

''اور کھاتی کیا ہو.....؟'' وہ اس راز کو مکمل طور پر افشا کرنے کے درپے تھی۔

''جو مل جائے اللہ کا شکر ادا کر کے کھا لیتی ہوں.....'' وہ مسکرا کر بولی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ظاہر ہے ملتا بھی کیا ہوگا۔ کہاں پیٹ بھر کے کھانا نصیب ہوتا ہوگا.....'' نگار نے پھر اُس کی غربت پر چوٹ کرنا چاہی۔

''وہ سب ملتا ہے جی جو میرے رب نے میرے نصیب میں لکھا ہے.....اور میں بھی وہی کھاتی ہوں جو میرے مالکوں کے گھر پکتا ہے۔ وہ جی میں پہلے جہاں کام کرتی تھی وہ باجی بھی بڑی نیک تھیں اور میرا بڑا خیال کرتی تھیں اور یہ بیگم صاحبہ بھی بہت اچھی ہیں۔ مجھ سے کوئی فرق نہیں کرتیں بلکہ اچھی اچھی باتیں بھی سمجھاتی ہیں۔''

وہ اپنے مالکوں کی کھلے دل سے تعریف کرنے لگی۔

''اب میں جاؤں.....؟'' وہ بے چاری راحت اور نگار سے باقاعدہ اجازت طلب کر رہی تھی جنہوں نے اُس کی مت مارنے کی بڑی کوشش کی تھی سوال کر کر کے۔

''ہاں۔ ہاں جاؤ.....ہم نے کب روکا ہے؟'' نگار نے بڑے اجنبی انداز میں اُس سے کہا اور وہ شکریہ کہہ کر مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

''یہ کم بختیں ہوتی بڑی ہوشیار ہیں۔ دیکھا کیسے انداز و ادا سے جواب دے رہی تھی۔'' آخر میں راحت نے اُس کی بُرائی شروع کر دی۔

''رہتی بھی بہت صاف ستھری ہیں۔ ہر وقت بنی سنوری.....''

''اور کیا..... پیٹ میں چاہے روٹی نہ ہو مگر فیشن کرنے آتے ہیں انہیں بھی۔ یہ بھی تو ہم جیسی بھولی بیگموں کی غلطی ہے نا۔ جو ہم لوگ انہیں اتنے مہنگے اور اچھے اچھے کپڑے اٹھا کر دیتی رہتی ہیں اور جنہیں پہن پہن کر یہ ہمارے ہی سامنے آتی ہیں۔''

''اور.....اور تم نے سنا نہیں وہ کہہ رہی تھی کہ ہمارے مالک ہمیں وہی کچھ کھلاتے ہیں جو خود کھاتے ہیں۔''

راحت اور نگار نے ان گھروں میں کام کرنے والی ماسیوں کے خلاف اپنے جی کی خوب بھڑاس نکالنی شروع کر دی۔

''یار! بُرا نہ منانا.....'' راحت نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تمہاری مما جیسی نیک صفت خواتین ہی دراصل ان ملازماؤں کے دماغ خراب کرتی ہیں اور انہیں ہماری برابری سکھاتی ہیں۔''

''اور تبھی تو یہ ہمارے سروں پر آ بیٹھتی ہیں۔ بلکہ ہمارے گھروں تک میں نقب لگانے لگتی ہیں۔'' نگار راحت کو باقاعدہ لقمے دے کر بات آگے بڑھاتی جا رہی تھی۔

''شٹ اَپ یار! تم لوگ جب سے آئی ہو ایک ہی موضوع پر بکواس ہو رہی ہے۔ تم لوگ میرا حال پوچھنے آئی تھیں یا ماسیوں پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے۔'' مجھے سچ مچ ان دونوں پر غصہ آ گیا جو یہ اُوٹ پٹانگ باتیں کر کر کے مجھے غصہ دلا رہی تھیں۔ یہ ایسی ہی تھیں، کبھی کوئی بات ڈھنگ کی نہ کرتی تھیں۔ فون پر بھی اور اکثر تقریبات پر بھی۔ کچھ ہی دیر کے بعد ان کی ایسی ہی اِدھر اُدھر کی گفتگو شروع ہو جاتی تھی۔ یہ دونوں ہی کیا، زیادہ تر خواتین ایسی ہی فضول و واہیات اور بے مقصد گفتگو کرتی نظر آتی تھیں۔

وہ تو شکر ہوا مما نے کھانا لگنے کا پیغام بھجوا دیا اور وہ دونوں کھانے کے بعد جلد ہی رُخصت ہو گئیں ورنہ اور جانے کتنی دیر میرا دماغ کھاتیں۔

❀❀❀

رات کو میں ٹی وی پر اپنا پسندیدہ سیریل دیکھ رہی تھی اِس میں کچھ ایسی سچوئشن بن گئی جس نے مجھے ایک دم ہی بہت زیادہ پریشان اور بے قرار کر دیا۔ میں نے سیریل کی قسط ختم ہوتے ہی فوراً احمد کو فون کیا۔

''او آئمہ تم..... بڑی عمر ہے تمہاری.....''

میری آواز سنتے ہی احمد جیسے کھل گئے۔ اُن کی آواز میں خوشی کا اظہار تھا۔ ''میں ابھی تمہیں فون کرنے ہی والا تھا.....'' وہ کہہ رہے تھے۔

''اچھا! خیریت.....'' میں نے پوچھا۔

''کیا مطلب خیریت؟ بھئی تمہاری یاد آ رہی تھی تم سے بات کرنے کو دل چاہ رہا تھا'' وہ اُسی شوخی سے بولے۔

''بس رہنے دیں..... بنائیں مت مجھے.....'' میں نے ذرا اِترا کر کہا کیونکہ اُن کا اس طرح سے مجھے بنانا ہی تو اچھا لگتا تھا مجھے۔ اپنی اہمیت کا احساس جو ہوتا تھا۔

''تمہاری قسم.....تم بہت یاد آ رہی ہو.....'' اُن کی آواز میں سچ کے ساتھ ساتھ بڑی گہرائی بھی تھی۔ میرا بے قرار دل اور بھی بے کل ہو گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''تو آجائیں ناں، روکا کس نے ہے۔''

میں نے اُنہیں بلانے کے لیے ہی فون کیا تھا مگر مجھے اپنی زبان سے کہنا بھی نہ پڑا اور وہ آنے کو تیار بھی ہو گئے۔

''میں تمہیں اِسی لیے فون کرنے والا تھا کہ فوراً تیار ہو جاؤ میں تمہیں لینے آرہا ہوں.....''

''احمد! آپ آجائیں ہم کہیں باہر چلتے ہیں لیکن ابھی میں مما کے پاس دو چار روز اور رہنا چاہتی ہوں.....''

میں نے اُوپری دل سے کہا حالانکہ میرا دل بے حد اُداس تھا اور میں واپس گھر جانے کو بھی بے تاب تھی لیکن پھر بھی ابھی جانا نہ چاہتی تھی۔ شاید میں احمد سے دُور رہ کر اُنہیں اپنی اہمیت جتلانا چاہ رہی تھی اور دُوری کے فارمولے پر عمل کر کے محبت کو دوچند کرنا چاہتی تھی۔

''اچھا بارہ لو اور دو روز.....مگر صرف دو روز، اس سے زیادہ ہرگز نہیں۔''

احمد نے ہمیشہ کی طرح فوراً ہی بات مان لی۔ حالانکہ میرا دل چاہتا تھا کہ وہ ضد کریں اور زبردستی مجھے لے جائیں مگر میں اپنے منہ سے نہ کہنے کی عادت سے مجبور تھی اور وہ اپنی صلح جُو طبیعت سے مجبور۔

''چلو پھر جلدی سے تیار ہو جاؤ میں آرہا ہوں۔ آئس کریم کھائیں گے اور ایک لمبی سی ڈرائیو پر چلیں گے.....''

احمد نے مجھے تیار ہونے کی تاکید کی اور فون بند کر دیا۔ میں اِس وقت گھومنے کے موڈ میں نہ تھی مگر پھر بھی تیار ہونے لگی کہ میں اُن کو ناراض نہ کرنا چاہتی تھی۔ احمد کی ناراضگی پہلے بھی مجھے اچھی نہ لگتی تھی لیکن اب تو مجھے اُن کے خفا ہونے سے ڈر لگنے لگا تھا کہ اگر وہ مجھ سے ناراض ہو گئے اور..... اُن کا دھیان مجھ سے ہٹ گیا تو.....'' مجھے اِس سوچ کے ساتھ ہی جھرجھری آگئی۔ کپڑے تبدیل کر کے میں میک اَپ کرنے کے لیے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آگئی۔ میں تیزی سے ہاتھ چلا رہی تھی تاکہ احمد کے پہنچنے سے پہلے ہی بالکل تیار رہوں۔

''ارے یہ کیا.....؟'' میرے تیزی سے چلتے ہاتھ اپنی آنکھوں کے نیچے واضح ہونے والی لکیروں کو دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ میں نے فٹافٹ ڈریسنگ ٹیبل کے ساتھ لگے ہوئے تیز روشنی

والے دونوں بلب روشن کیے اور آئینے کے بے حد قریب ہو کر اُن لکیروں کا بغور مشاہدہ کرنے لگی۔

یہ تو آنکھوں کے نیچے بننے والی وہ لکیریں تھیں جو عمر کے گزر جانے والے برسوں کی نشان دِہ تھیں..... وقت کی رگڑ سے اُبھرنے والی خراشیں تھیں جنہیں کوئی جتن ہلکا تو کر سکتا تھا مٹا نہیں سکتا تھا۔ میں بھی ان لکیروں پر اپنی خوش فہمی کی تہیں لگا لگا کر اُنہیں دبانے کی کوشش تو کب سے کر رہی تھی مگر بھول گئی تھی کہ مصنوعی پن کسی عیب پر غلاف تو ہو سکتا ہے اس کا تدارک نہیں۔

''ایک عورت کو اپنے حسن اور جوانی پر بڑا مان ہوتا ہے مگر جب وقت کے پاؤں اُس کے چہرے کو چُھونے لگتے ہیں تو پھر بہار کی رُخصت اور بڑھاپے کی آمد کی اطلاع ہو جاتی ہے۔'' ایسا میری مما اکثر مجھے سمجھاتے وقت کہا کرتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ اُس بہار کا کیا فائدہ جس میں گل کھلیں نہ کونپلیں.....'' اُن کا مطلب ہوتا تھا کہ عورت اگر جوانی میں ماں نہ بنے تو پھر اُس کے حسن اور جوانی کا بھی کیا فائدہ یہ دونوں تو شام کی طرح جلد ہی ڈھل کر رات میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ زندگی تو بچوں کے وجود سے تعبیر پاتی ہے۔

کیا میرے حسن و شباب کا سورج ڈھلنا شروع ہو گیا تھا..... اور..... اور میں نے خوفزدہ ہو کر اپنا چہرہ آئینے کے سامنے سے ہٹا لیا جیسے میں پھر خود سے نظریں چُرانا چاہتی تھی۔

گیٹ پر احمد کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا اور میں نے جلدی سے اپنے خشک ہوتے لبوں پر گہرے رنگ کی لپ اسٹک جمالی۔ اب میں بالکل تیار تھی۔ ایک ملمّع میرے اندر باہر چڑھ چکا تھا جس نے کچھ دیر کے لیے مجھے پھر سے ملفوف کر دیا تھا۔ یا پھر یوں کہہ لیں کہ کھوٹے کو چمکا کر کھرا کرنے کی کوشش کی تھی..... بالکل اسی طرح سے جیسے کسی بچے کو گلی میں کوئی سکّہ مل جائے جو کھوٹا ہو مگر وہ بچہ پھر بھی اُسے رگڑ رگڑ کر مانجھ تانجھ کر چمکائے اور سمجھتا ہو کہ شاید چمکنے سے وہ سکّہ کھرا ہو جائے گا حالانکہ وہ معصوم یہ نہیں جانتا کہ سکّے کی چمک اُسے کارآمد نہیں بناتی بلکہ اُس کے اصلی ہونے میں ہی اُس کی اہمیت پوشیدہ ہوتی ہے۔

''او مائی ڈیئر مومی!'' احمد کب کمرے تک آگئے مجھے اپنے خیالات میں اس کی خبر ہی نہ ہوئی۔ وہ تو جب عین میرے قریب آکر بولے تو میں چونکی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''بھئی کہاں گم ہو.....؟'' وہ مجھے چونکتے پا کر ہنسے.....

''کک.....کہیں نہیں میں تو آپ کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی.....'' میں نے اپنی مسکراہٹ کو اور گہرا کرنے کی کوشش کی۔

''اچھا..... پھر میں واقعی خوش بخت ہوں.....'' مجھے وہ کندھوں سے تھام کر میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے۔

''اچھا وہ کیسے.....؟'' میں نے اپنے کندھوں پر رکھے اُن کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ مضبوط، گرم ہاتھ جنہیں تھامنے سے میرے اندر لمحہ بھر پہلے تک تھرتھرانے والا اعتماد پھر سے بحال ہو گیا۔

''بھئی میں ایک ایسی عورت کا شوہر ہوں جو کہ نہ صرف بے حد خوبصورت ہے بلکہ مجھ سے بے حد پیار بھی کرتی ہے۔ تو پھر ہوا ناں خوش بخت؟'' انہوں نے میرے ہاتھوں پر اپنی گرفت کچھ اور مضبوط کر کے اپنی بات کی سچائی کو ثابت کرنا چاہا۔

''Same to you احمد!.....'' جانے کیوں اُن کی اِس قدر محبت پر میری آنکھیں بھیگ گئیں۔

''چلیں دیر ہو رہی ہے۔'' میں نے اُن کا دھیان بٹانے کو کہا۔

''ہاں چلو.....آؤ.....'' وہ مجھے ساتھ لیے چل پڑے۔

''آئمہ!'' آئس کریم کھاتے ہوئے احمد بولے۔

''رات میں نے ایک خواب دیکھا..... بے حد خوبصورت اور لرل گداز خواب.....'' وہ کھوئے کھوئے بولے جیسے رات والے خواب کی کیفیت میں ابھی تک گم ہوں۔

''کیسا خواب؟'' میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''تم سنو گی تو ہنسو گی.....شاید مجھے دیوانہ کہو.....'' وہ اُسی سرشاری میں تھے۔

''پہلے بتائیں تو سہی.....'' مجھے اُن کی حالت دیکھ کر خواب سننے کا تجسس ہو رہا تھا.....

''میں نے دیکھا، میں ایک باغ میں کھڑا ہوں جس کے اطراف میں پھول ہی پھول کھلے ہوئے ہیں اور سامنے سے ایک گول مٹول سا بچہ بھاگتا ہوا آتا ہے اور میری اُنگلی تھام کر کہتا ہے۔

''بابا! بابا! مجھے وہ غبارے چاہئیں.....اور مجھے کھینچ کر غبارے والے کی طرف لے جاتا ہے۔

غبارے والا تیز تیز قدموں سے آگے چلتا جاتا ہے۔ اور میں اپنے بیٹے کے ساتھ اُس کے پیچھے پیچھے جاتا ہوں.....اور اُسے ڈھیر سارے غبارے لے کر دیتا ہوں جس پر وہ میرے گلے میں بانہیں ڈال کر میرے گال پر بوسہ دیتا ہے۔ اور.....اور میری آنکھ کھل جاتی ہے.....''

احمد نے بڑے جذب کے عالم میں یہ بتاتے ہوئے اپنے گال کو یوں چھوا جیسے وہ اُس بوسے کو ٹٹول رہے ہوں۔

''پتہ ہے موی؟ میں صبح سے اب تک اُسی کیفیت میں ہوں۔ اُس کا معصوم اور پیارا سا چہرہ اب تک میرے سامنے ہے۔ اور بابا! بابا! کی آواز اب تک میرے کانوں میں رَس گھول رہی ہے۔ اور.....اور موی۔ اُس کے نرم و نازک سے لب میرے گال پر اب تک دھرے ہیں یہ دیکھو.....''

احمد کی وارفتگی اُس لمحے اُنہیں دیوانہ ہی بنا رہی تھی.....

''موی! وہ ''ٹیپو'' ہی تھا۔ ہے ناں؟ وہ ٹیپو ہی تو تھا.....؟''

احمد میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے پوچھ رہے تھے۔

''احمد! وہ خواب تھا.....اور اکثر خواب ہمارے خیالات اور ہماری سوچوں کا پرتو ہوتے ہیں۔'' میں اُن کی آنکھوں میں تیرتی تشنگی اور دیوانگی سے گھبرا گئی اور نظریں چُراتے ہوئے بولی۔

''تم کچھ بھی کہو۔ کوئی نفسیاتی دباؤ کہو۔ یا خیالات کا تسلسل.....مگر وہ ٹیپو ہی تھا۔ آخر خواب سچے بھی تو ہوتے ہیں۔''

احمد نے میری بات پر دھیان ہی نہ دیا وہ تو اپنے ہی دھیان میں گم تھے۔

''تم دیکھ لینا۔ میرا یہ خواب بہت جلد سچا ہو گا.....'' وہ خوشی سے اُتاولے ہوتے ہوئے بولے۔

''ہے نا.....؟'' انہوں نے پھر میری آنکھوں میں دیکھ کر پوچھا۔

''جی.....جی.....'' میں نے گھبرا کر کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ان شاء اللہ تعالیٰ کہو آئمہ.....! اور دُعا کرو کہ میرا اور تمہاری ذات کی تکمیل..... ہمارے خواب کی تعبیر جلد ہو.....'' وہ بڑے بے قرار نظر آ رہے تھے جیسے فوراً ہی وہ حقیقت چاہتے ہوں۔

''احمد! آپ تو بالکل بچے بن گئے ہیں۔'' میں نے انہیں سرزنش کرنا چاہی۔

''تو کیا کروں.....؟ کسی کا والد جو نہیں ہوں۔'' وہ شرارت سے بولے۔

اچھا یہ بتاؤ کہ کراچی کب چلنا ہے.....؟'' وہ ایک دم ہی سنجیدہ ہو گئے۔

''کراچی.....؟'' میں جو کراچی جانے کی ٹینشن سے ہی بیمار ہوئی تھی پھر سے بوکھلا گئی۔

''ہاں بھئی Second opinion کے لیے۔''

وہ مجھے یاد کراتے ہوئے بولے۔ اور مجھے لگا میری یادداشت پر اچانک ہی کوئی بم آ گرا ہو۔ جس کے نتیجے میں مجھے کچھ بھولنے کی بجائے سب یاد آ رہا ہو۔

''آئمہ! ہم ایک چانس تو لے سکتے ہیں۔ مگر زیادہ اُمید نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے ہم کچھ بھی حاصل نہ کر سکیں..... شاید.....''

ڈاکٹر مہ نور کی باتیں تیز شور کی طرح میری سماعتوں سے ٹکرانے لگیں۔

''احمد! پلیز گھر چلیں میرے سر میں درد ہو رہا ہے.....'' میں ایک دم سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''کیوں کیا ہوا.....؟'' وہ بھی مجھے دیکھ کر پریشان ہو گئے۔

''شاید میرا بلڈ پریشر اَپ سیٹ ہو رہا ہے.....'' میں نے اپنے چکراتے ہوئے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

''آئمہ!..... آئمہ!'' احمد نے مجھے آگے بڑھ کر تھاما ورنہ میں شاید گر ہی جاتی۔

❀❀❀

''احمد!'' میں نے بہت دیر سے جمع کی ہوئی ہمت کے ساتھ بالآخر انہیں مخاطب کر ہی لیا۔

''ہوں'' انہوں نے ٹی وی کا ریموٹ ایک طرف رکھ کر اپنی پوری توجہ میری طرف مبذول کرتے ہوئے جواب دیا۔

''احمد! میں..... مَیں آپ سے ایک بات کرنا چاہ رہی تھی.....'' خود کو بے پناہ پُراعتماد ظاہر کرنے کے باوجود میری آواز کانپ رہی تھی۔

''اچھا صرف ایک بات.....! میں تو چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے بہت ساری باتیں کرو۔ جیسے تم کیا کرتی ہو..... مگر اب کچھ دنوں سے جیسے بھول گئی ہو۔ چپ چاپ اور گم صم رہتی ہو۔ جانے کیوں؟'' وہ بڑی ملائمت سے کہہ رہے تھے۔ میرا اعتماد چٹخنے لگا۔ میں نے اُن کی آنکھوں سے اپنا دل چھڑایا اور ہاتھوں سے ہاتھ۔

''احمد! مجھے آپ سے بے حد سنجیدہ بات کرنی ہے۔''

''کیا بات ہے آئمہ! تم پریشان کیوں لگ رہی ہو؟''

''احمد! میں نے آپ سے غلط کہا تھا کہ.....'' میں نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔

''کیا..... کیا غلط کہا تھا.....؟'' وہ میری ادھوری اور مبہم سی بات سن کر پریشان ہو گئے۔

''وہ..... وہ ہم ڈاکٹر مہ نور کے کلینک گئے تھے ناں.....؟'' میں نے اُنہیں یاد کرایا۔

''ہاں..... تو؟'' وہ بدستور پریشان تھے۔

''آپ کا اور میرا مکمل چیک اَپ ہوا تھا۔ بہت سے ٹیسٹ ہوئے تھے ہمارے!'' میں نے انہیں مزید یاد دلانے کی کوشش کی۔

''ہاں ہوئے تھے۔ پھر کیا ہوا؟'' انہیں میری بات سمجھ نہ آ رہی تھی۔

''احمد! تب میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ڈاکٹر مہ نور نے کہا ہے کہ مجھے کچھ پرابلم ہے اور اُس کے لیے مجھے علاج کرانا ہوگا۔''

''ہاں مجھے علم ہے..... اور یہ بھی علم ہے کہ تم نے اس بات کو اپنے دل سے لگا لیا ہے اور بیمار پڑ گئی ہو۔'' اُن کے چہرے سے پریشانی ہٹ گئی۔ ''اِسی لیے تو میں تمہیں کراچی لے کر جا رہا ہوں۔ تاکہ تمہاری پریشانی دور ہو جائے۔ اور اگر کچھ مسئلہ ہے بھی تو وہ حل کیا جائے۔''

انہوں نے محبت سے مجھے تسلی دی مگر میں تو روئے چلی جا رہی تھی۔ ''احمد! مجھے معاف کر دیں۔ میں نے آپ سے وہ سب جھوٹ کہا تھا دراصل بات کچھ اور ہے.....'' میں نے باقاعدہ ہچکیاں لینی شروع کر دیں۔

''اور کیا بات ہے؟ بولو..... کیا جھوٹ کہا تھا تم نے..... اور کیوں؟'' وہ ایک دم ہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بہت سے سوالات کر گئے۔ اب وہ حقیقت میں پریشان ہو گئے تھے۔ میں نے تیکھی نظر اُن کے چہرے پر ڈالی۔ وہاں فکر اور تجسس نے مل جل کر اُنہیں الجھن میں ڈال دیا تھا۔ اُن کی اَزلی مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی اور وہ مجھے ملتجی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے جیسے کہہ رہے ہوں۔

''آئمہ! پلیز اب اور نہ چھپاؤ جو کہنا ہے جلدی کہہ دو.....''

''احمد! دراصل پرابلم مجھ میں نہیں آپ میں ہے.....'' میں نے اپنی جھرجھر بہتی آنکھیں اُن کی آنکھوں میں ڈال کر وہ جملہ کہہ ہی دیا جسے کہنے کی ریہرسل میں کل شام سے اپنے دل ہی دل میں کر رہی تھی۔ بالآخر میں نے اپنا الزام احمد کے سر دھر دیا۔ اُس وقت مجھے سوائے اس کے اور کچھ نہ سوجھا تھا۔ مجھے احمد کو کراچی جانے سے روکنے کا یہی راستہ نظر آ رہا تھا اور یہ راستہ کراچی تو کیا احمد کو کہیں بھی اور نہ جانے دیتا۔ میں جانتی تھی وہ اب اِسی مقام پر کھڑے رہیں گے۔ نہ خود کہیں جائیں گے اور نہ مجھے ہی کسی طرف قدم بڑھانے کو کہیں گے۔ میں نے اپنے آپ کو بچانے کے لیے اپنے شوہر کو آڑ بنا لیا تھا۔ کس قدر خود غرض ہو گئی تھی میں.....!

میں نے دیکھا میری بات سن کر احمد کی آنکھوں میں جگمگاتے دیے تھرتھرا کر مدھم پڑ گئے تھے اور مسکراتے ہوئے لب سکڑ کر اِک دوجے پر جم گئے تھے۔ وہ کچھ بھی نہ بولے بس ایک نظر مجھے دیکھا اور پھر اپنے قدموں پر گھوم گئے۔ انہوں نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا تھا جیسے خود کو میرا مجرم تصور کر رہے ہوں۔ یعنی میری ترکیب کام آ گئی تھی۔ میں نے اُن سے محبت جتانے کے لیے اور بھی رونا شروع کر دیا اور ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

''احمد!..... احمد! میں اِسی لیے آپ کو بار بار منع کر رہی تھی کہ ہم نے کہیں نہیں جانا۔ مگر اماں جان اور آپ کی ضد.....''

میں اُن کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور بات ادھوری چھوڑ کر اُن کی طرف دیکھنے لگی۔ اُن کے چہرے پر چند ہی لمحوں میں زردیاں چھا گئی تھیں اور وہ بے حد بے چین دکھائی دے رہے تھے۔ میرے دل پر چوٹ سی پڑی اور میں تڑپ کے آگے بڑھی۔

''احمد! میں..... مَیں.....''

''کیا کہو آئمہ!'' انہوں نے مجھے آگے کچھ کہنے سے روک دیا۔

''پلیز مجھے کچھ دیر کے لیے تنہا چھوڑ دو۔ میں بے حد ڈسٹرب ہوں۔'' انہوں نے پھر سے میری طرف اپنی پشت کر لی۔ یقیناً وہ اپنی کیفیت کو مجھ سے چھپانا چاہ رہے تھے۔ لیکن میں اگر اس وقت انہیں تنہا چھوڑ جاتی تو شاید وہ کچھ اور سوچنے لگتے۔ مجھ سے اپنی رپورٹ ہی مانگ لیتے بعد میں..... اور میں تو ایسا چاہتی نہ تھی۔ لہٰذا اپنی اداکاری میں مزید رنگ بھر کے میں آگے بڑھی اور اُن کے سامنے جا کر گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئی میں نے اُن کے دونوں ہاتھ تھام کے اپنی گیلی آنکھوں سے لگا لیے تھے اور سر جھکا کر کچھ لمحے مزید روتی رہی یہاں تک کہ وہ بولے۔

''آئمہ! پلیز تم تو یوں مت روؤ۔ میں پہلے ہی پریشان ہوں۔'' اُن کا ایک ہاتھ میرے سَر پر آ کے تسلی کے لیے ٹِک گیا۔ مگر میں اُس کی کپکپاہٹ کو صاف محسوس کر رہی تھی۔

''مَیں..... مَیں اِسی لیے تو یہ درد تنہا ہی اُٹھا رہی تھی۔ احمد! میں نے تو سوچا تھا کہ عمر بھر آپ کو اس کی خبر نہ ہونے دوں گی۔ اِسی..... اِسی لیے میں نے وہ ساری رپورٹس ضائع کر دی تھیں کہ کہیں آپ کی نظر سے نہ گزر جائیں۔'' میں نے اصل بات بھی بڑے ہی طریقے سے کہہ دی، جس کو سن کر اس وقت احمد نے کسی بھی بُرے ردِعمل کا اظہار نہ کیا۔ البتہ انہوں نے بے ساختہ ہی کسمسا کر اپنا ہاتھ مجھ سے چھڑا لیا تھا جیسے وہ ابھی ابھی ملنے والے اِس زخم کی تاب نہ لا کر اندر ہی اندر تڑپ رہے ہوں۔

''احمد! مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ سوائے آپ کے..... آپ کی محبت کے.....'' میں نے نثار ہونے والے انداز میں اُن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا آپ کو سوائے میرے کچھ اور چاہیے؟'' میں نے اپنی نم آنکھوں میں اُن کی آنکھوں کو اُلجھا لیا۔

''احمد! مجھے آپ کی عزت۔ آپ کے وقار سے زیادہ کچھ عزیز نہیں۔ اولاد بھی نہیں.....'' میں نے اُن کی خواہش کو اپنی زبان سے یوں ادا کیا جیسے وہ میری شدید تمنا ہو مگر میں اُسے احمد کی خوشی پر قربان کر رہی ہوں۔

''آئمہ پلیز.....'' وہ ایک بار پھر مچلے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''احمد! میرا یقین کریں میرے لیے آپ ہی کافی ہیں۔'' میں نے اتنی محبت سے کہا کہ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیئے۔

''آئمہ!'' وہ میرے کندھے سے لگے لرز رہے تھے، اور میں اُن کے وجود میں ایک ایک کر کے گرتی ہوئی اینٹوں کو اپنے وجود میں اکٹھا کر رہی تھی..... اُنہیں پیار، تسلی اور حوصلے سے اُٹھا رہی تھی۔

احمد حسن کی ذات سے خود اعتمادی، خودداری اور اَنا بھربھری مٹی کی طرح جھڑتی رہی اور وہی مٹی میرے وجود پر پڑ کر اس کے جھوٹے وقار کو مزید لیپتی رہی۔ یہاں تک کہ احمد حسن کی شخصیت کا سارا ماس چَٹخ گیا جبکہ میری کینچلی بھی بدل چکی تھی۔ پہلے سے زیادہ چمکیلی اور چکنی..... جس میں سے پھوٹتی شعاعیں میری ذات کے پل پل بدلتے رنگوں کی غماز تھیں۔

میں نے احمد کو اپنی محبت کا پھر سے بھرپور اعتماد دلا کر انہیں اپنی ریشمی باتوں میں پھر سے کس کر باندھ لیا۔ اب وہ ان گرہوں کو کبھی نہ کھول سکتے تھے اور نہ ہی کھولنے کا سوچ سکتے تھے۔

جب وہ خوب رو چکے تھے تو میں نے انہیں وہاں سے بڑے پیار سے اُٹھایا اور سہارا دے کر بستر پہ لٹا دیا۔

''احمد! آپ کو آرام کی سخت ضرورت ہے۔''

''ہاں! مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔ پلیز مجھے کوئی سکون کی دوا دے دو.....'' انہوں نے دھیرے سے کہا۔ نقاہت اُن کی آواز سے صاف ظاہر تھی۔

''جی! میں آپ کے لیے گرم دودھ لے آؤں پھر دیتی ہوں۔'' میں نے اُن کی کمر کے پیچھے ایک اور تکیہ لگاتے ہوئے کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔'' اُنہوں نے آنکھیں موندتے ہوئے کہا۔

میں کچھ ہی دیر میں اُن کے لیے گرم دودھ لے آئی۔ اُنہیں سکون کی گولی کھلائی اور لٹا کر کمبل اُن کے سینے تک اوڑھا دیا۔ کمرے کی روشنی مدھم کی اور خود آ کر اُن کے سرہانے بیٹھ گئی۔

''احمد!'' میں نے اُن کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے بلایا۔

''ہوں.....'' وہ بجھے بجھے سے تھے۔

''کیا آپ مجھ سے خفا ہیں؟'' میں نے ہولے ہولے اُن کا سر دبانا شروع کر دیا ''نہیں تو.....'' وہ بدستور ویسے ہی تھے۔

''ویسے اگر آپ پھر بھی کراچی چلنا چاہیں تو میری طرف سے کوئی انکار نہیں میں تو پہلے بھی صرف آپ کی وجہ سے.....''

''آئمہ پلیز.....'' میری بات کو پورا ہونے سے پہلے ہی انہوں نے مجھے روک دیا بلکہ انہوں نے تو میرا ہاتھ بھی اپنی پیشانی سے ہٹا دیا۔

''سوری احمد۔ لیکن یہ تو قدرت کی مرضی ہے۔'' میں نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''اچھا آپ آرام کریں.....'' ساتھ ہی میں اُٹھ کر جانے لگی۔

''آئمہ.....!'' اُن کی آواز جیسے بہت دُور سے آئی۔

''جی.....'' میں سعادت مندی سے پلٹی۔

چند لمحے وہ چپ چاپ سے مجھے دیکھتے رہے جیسے کچھ کہنا چاہتے ہوں مگر اس کے لیے انہیں الفاظ نہ مل رہے ہوں۔ اُنہیں تذبذب میں دیکھ کر میں نے اُن کی آنکھوں پر اپنی ہتھیلیاں رکھ دیں۔

''احمد! آپ کو کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں۔ نہ ہی اپنے ذہن پر کچھ بوجھ لینے کی ضرورت ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ بس اللہ پہ بھروسہ رکھیں..... اور اب اپنی آنکھیں بند کر کے سو جائیں۔ شب بخیر۔'' میں بیڈ کی دوسری طرف سے گھوم کر آئی اور صوفہ کم بیڈ کو کھول کر وہاں لیٹ گئی تاکہ احمد ڈسٹرب نہ ہوں۔

رات کے اڑھائی بج چکے تھے اور میں کروٹیں بدل بدل کر بھی تھک چکی تھی مگر نیند تھی کہ میری آنکھوں سے کوسوں دُور تھی حالانکہ آج تو میں بے حد ریلیکس تھی۔ میرے دل و دماغ پر پڑا فکر اور پریشانی کا پتھر ہٹ چکا تھا۔ وہ پتھر..... جس نے میری شخصیت کا سارا دبدبہ سارا حسن گذشتہ دو ماہ سے دبا کر رکھ دیا تھا..... اور اگر وہ پتھر کچھ دیر اور اُسی طرح پڑا رہتا تو شاید میں مسخ ہو جاتی۔ شکر ہے کہ میں نے اپنی عقل مندی سے اس پتھر کو ایک ایسی سمت لڑھکا دیا تھا جہاں اب وہ عمر بھر بھی پڑا رہے تو مجھ پر اُس کا کچھ بوجھ نہ ہوگا اور نہ ہی ڈر۔

میں نے کروٹ بدل کر احمد کی طرف دیکھا۔ وہ گہری نیند سو رہے تھے۔ شاید دوا کا اثر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے، میں نے سوچا۔ ورنہ جو بوجھ اُن کی ذات پر آج پڑ گیا تھا اُس سے نیند تو کیا سانس بھی گھٹ گھٹ کر آتی۔

مگر مجھے نیند کیوں نہیں آ رہی.....؟ میں اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔ مجھے اِک عجیب سا خوف آیا..... کہیں یہ میرے اس عمل کا ردِعمل تو نہیں.....؟

وہ خوف اِک سنسناہٹ بن کر میرے لہو سے یوں گزر گیا جیسے کوئی کوئلوں سے بھٹی میں سُرخ ہوئی سلاخ اُٹھا کر یک دم سے ٹھنڈے پانی میں ڈال دے اور وہ شُررر..... کی آواز کے ساتھ بجھ تو جائے۔ مگر ٹھنڈی نہ ہو۔ بلکہ..... بلکہ اُس کی حرارت سے ٹھنڈا پانی بھی تپ اُٹھے اور اس میں سے بھی چند لمحوں تک دُھواں اور پھر بلبلے اُٹھتے رہیں۔

میں اپنی رگ رگ میں ایسا ہی دُھواں اور بلبلے محسوس کرنے لگی میرا دم گھٹنے لگا اور میں بستر چھوڑ کر کمرے سے باہر آ گئی۔

''میں نے جو کیا، کیا وہ غلط تھا.....؟'' میرے لہو سے وہ بلبلے ایک ایک کر کے میرے دماغ کی طرف آنے لگے.....

''کیا..... کیا غلط کیا.....؟'' میرے دل نے آگے بڑھ کر اُن بلبلوں کو ایک ہی پھونک میں منتشر کر دیا۔

''تم نے جو کیا..... وہ اپنے دفاع میں کیا۔ اپنا گھر بچانے کے لیے کیا، اپنی شادی شدہ زندگی کی بقا کے لیے کیا..... اور پھر احمد کی محبت میں کیا۔'' منتشر ہونے والے وہ بلبلے ایک ایک کر کے پھٹنے لگے۔

''آئمہ!..... آئمہ!..... مت سوچو۔ دیکھو کچھ بھی مت سوچو۔ اور اپنے ذہن کو جھٹک کر جھٹک کر خود سے دُور کرو۔ یہ وقتی اُبال ہے جو ضمیر پر پڑنے والے بوجھ کی تپش سے اُٹھتا رہتا ہے۔ بس تم خود کو جذباتی ہونے سے روکو..... باقی سب ٹھیک ہے۔''

میرے ضمیر نے ابھی ایک انگڑائی ہی لی تھی۔ میں نے فوراً ہی اپنی سائیکوتھراپی شروع کر دی۔

''مُول۔ آئمہ احمد مُول.....''

میں کمرے کی گھٹن سے نکل کر باہر لان میں آ گئی اور اپنی مخصوص آرام کرسی پر بیٹھ کر

''سب ٹھیک ہے..... سب جائز ہے..... ایسا ہوتا ہے..... بلکہ ایسا تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ یہ جھوٹ نہیں ہے ایک ضرورت ہے..... حکمت ہے بلکہ تمہاری بروقت عقل مندی ہے جو تم نے اِس قدر گھمبیر معاملے کو یوں سلجھانے کی کوشش کی ہے.....''

میں نے اپنی کنپٹیوں کو ہولے ہولے دباتے ہوئے خود کو سمجھایا۔ میں اپنے بڑھتے ہوئے بلڈ پریشر کے ساتھ ساتھ اپنے جذبات کا وہ تلاطم بھی کنٹرول کر رہی تھی جو احمد کو یوں پریشان دیکھ کر میرے سینے میں برپا ہو گیا تھا۔

میں نے اپنے اعصاب کو بالکل ڈھیلا چھوڑ دیا اور آرام کرسی سے اُٹھ کر۔ پاؤں کو چپل سے آزاد کر کے گھاس پر رکھ دیا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی نرم گھاس پر پاؤں رکھتے ہی ایک پُرسکون سی لہر میرے تلوؤں میں سے سرایت کر کے دماغ تک جا پہنچی۔

میں نے ایک لمبی سانس کھینچ کر اپنے پھیپھڑوں میں بھری۔ ''آئمہ احمد! تمہیں اپنے شوہر سے بے حد محبت ہے اور تم نے جو کیا اسی محبت میں آ کر کیا۔ لہٰذا سب ٹھیک ہے، بھول جاؤ، تم نے کچھ بھی بُرا نہیں کیا۔'' میں نے پوری توجہ کو سمیٹ کر یہ بات اپنے دل و دماغ کو سنائی اور پھر اپنے پھیپھڑوں میں بھری ہوئی آکسیجن کو دھیرے دھیرے آزاد کر دیا۔

میرے دل و دماغ کو گرم کرنے والی جذباتی کیفیت کاربن ڈائی آکسائیڈ بن کر میرے اندر سے خارج ہو چکی تھی۔

ایک توقف کے بعد اُسی طرح دھیرے دھیرے سانس لینے اور چھوڑنے کا یہ عمل جب میں نے کم از کم دس بار کر لیا تو واقعی میں خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ یعنی میں نے اپنے آپ کو کنٹرول کر لیا۔ میری یوگا کی یہ مشق میری سائیکوتھراپی میں واقعی مددگار ثابت ہو گئی تھی۔ میں نے اپنے اندر اِک خوشی محسوس کی۔ میں کافی حد تک پُرسکون تھی۔ اب میں نے گھاس پر ننگے پاؤں چلنا شروع کر دیا۔ میں رات کے تین بجے تنہا لان میں چہل قدمی کر رہی تھی اور مجھے یہ اچھا لگ رہا تھا۔ آج میں بہت دنوں کے بعد خوش تھی۔ میں نے اپنا درد احمد کے ساتھ بانٹ لیا تھا۔ آخر ہم دونوں دُکھ سُکھ کے ساتھی تھے اور چونکہ احمد مرد تھے اِس لیے ان کی ذمہ داریاں اور فرائض مجھ سے زیادہ تھے۔ میں بحیثیت ایک عورت کے ازدواجی زندگی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے مسائل سے تنہا نبرد آزما نہ ہو سکتی تھی اِس لیے میں نے احمد پر اُن کی قوتِ مدافعت کے مطابق کچھ زیادہ بوجھ ڈال دیا تھا۔ اگر چہ یہ بے ایمانی تھی مگر میں نے ایسا کر لیا تھا۔ میں جانتی تھی کہ وہ اِسے بخوشی برداشت کر لیں گے۔ مجھے اُن کی اس محبت پر پورا بھروسہ تھا جو انہیں حقیقتاً مجھ سے تھی.....اور مجھے؟"

"سی.....ی.....سی....." نرم نرم گھاس میں سے کوئی کانٹا میرے پاؤں میں چبھ گیا۔ میں بے ساختہ اپنے پاؤں کو پکڑ کر بیٹھ گئی۔ روشنی زیادہ نہ تھی اس لیے مجھے کچھ نظر تو نہ آ رہا تھا۔ میں نے اپنے تلوے کو ٹٹول کر دیکھا مگر وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ شاید کانٹا صرف چھوا ہی تھا۔ میں نے وہیں بیٹھ کر اپنے پاؤں کو ذرا سا مسلا، سہلایا اور پھر چلنے کو اُٹھی۔ مگر اب پاؤں کو اسی جگہ پر رکھنے کو میرا جی نہ چاہ رہا تھا۔ میں اُس معمولی سے کانٹے سے خوفزدہ ہو گئی تھی جو میری آنکھوں نے دیکھا بھی نہ تھا۔ میں ایک پاؤں کو بچا بچا کر گھاس پر رکھتی اور دوسرے سے لنگڑاتی واپس اس جگہ آ گئی جہاں میری چپل موجود تھی۔ میں نے جلدی سے چپل پہنی اور واپس اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ پتہ نہیں کیوں مجھے ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے کوئی میرے ساتھ ساتھ چل رہا ہو۔ میرے قدموں کے ساتھ کسی اور کے قدم بھی تھے جس کی چاپ نے مجھے ڈرا دیا تھا۔ رات کے تیسرے پہر باہر کھلی فضا میں مَیں بالکل تنہا تھی اور جانے کیا کیا حرکتیں کر رہی تھی۔ جب مجھے اس کا احساس ہوا تو خوف کی ایک لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسنا گئی۔ میں نے تو پھر اندر کمرے میں آ کر ہی سانس لی جلدی سے کمرے کا دروازہ بند کیا اور چٹخنی بھی چڑھا دی۔ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ کوئی میرا پیچھا کر رہا تھا۔ کسی کے پاؤں میرے پاؤں کے ساتھ چل رہے تھے، اور اِسی احساس نے مجھے پسینے پسینے کر دیا تھا۔ میں باقی سب بھول گئی تھی۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اس کی چٹخنی اور لاک دونوں میں نے خود لگائے تھے۔ باہر سے اندر بھی میں اکیلی ہی آئی تھی مگر پھر بھی یہ احساس مجھ پر طاری تھا کہ کوئی میرے دائیں جانب موجود ہے اور اگر میں نے اِس طرف دیکھ لیا تو شاید میرا دم سچ مچ ہی نکل جائے گا۔

"احمد!....." میرے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

وہ تو بے خبر گہری نیند سو رہے تھے اور میرے قدم برف ہو چکے تھے۔

"احمد!" میں نے دوبارہ انہیں پکارا۔ اس بار میری آواز پہلے سے بھی گھٹ گئی۔ مارے خوف کے میری آواز بھی گلے میں پھنس گئی تھی۔ میں نے اپنی ساری ہمتیں مجتمع کر کے زور لگایا اور تقریباً چھلانگ لگا کر بستر پر پہنچ گئی۔

"کک.....کون.....کیا ہوا؟" احمد نے اپنی مُندی آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا۔

"کیا ہوا؟" مجھے یوں سہما ہوا دیکھ کر وہ پوچھ رہے تھے۔

"احمد! مجھے ڈر لگ رہا ہے؟" میں نے ایک ڈری سہمی بچی کی طرح اُن کے پیچھے چھپنا چاہا۔

"ڈر کس بات کا....." وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

"وہ.....وہ.....میں۔" میرے منہ سے اور کچھ بھی نہ نکل سکا۔ چند لمحوں میں ہی میری حالت اتنی عجیب ہو گئی تھی کہ مجھے خود سمجھ نہ آ رہی تھی کہ میرے ساتھ ہوا کیا ہے۔

"لگتا ہے تم نے کوئی بُرا خواب دیکھا ہے۔ خیر سو جاؤ۔ میں لائٹ جلا دیتا ہوں....."

"آپ کہیں مت جائیں احمد....." وہ لائٹ جلانے کو اُٹھے تو میں نے انہیں روک لیا۔

"اچھا بابا نہیں جاتا۔ تم یہاں لیٹو....."

میری حالت پر وہ نرمی سے مسکرائے اور مجھے بچوں کی طرح پچکارنے لگے۔

"دیکھو! میں ہوں تمہارے پاس۔ ڈر وَر کوئی چیز نہیں ہوتی۔ بس ایک خیال ہے۔ جب آ جائے تو انسان پر طاری ہو جاتا ہے۔" وہ مجھے تھپکنے لگے اور میں گنگ سی، گم صم سی اُنہیں یہ بھی نہ بتا سکی کہ میں رات کے تیسرے پہر تنہا لان میں کیا کر رہی تھی اور کیوں ڈر گئی.....میرا جسم خوف کی اُسی حالت میں دیر تک لرزتا رہا.....اور دیر تک ہی احمد مجھے دلاسہ دیتے رہے۔ پھر میں کب سو گئی مجھے معلوم نہ ہو سکا۔

دراصل جب احمد مجھے امی کے گھر سے لے آئے تو اُن کی کراچی جانے کی تیاری بالکل مکمل تھی۔ تیاری تو میں نے بھی اُنہیں دکھانے کو کر لی تھی مگر میں جانے کے لیے تیار نہ تھی۔ مجھے احمد کو وہاں جانے سے روکنے اور خود کو بار بار کے میڈیکل چیک اَپ اور دوسروں کی چبھتی ہوئی باتوں سے بچانے کے لیے ایک ہی ترکیب سمجھ آئی۔ اور وہ ترکیب یہی تھی کہ میں احمد کے سامنے سارا معاملہ ہی پلٹ دوں۔ سارا مسئلہ ہی اُن کا بنا دوں۔ میں چونکہ نفسیات کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طالبہ رہ چکی تھی اِس لیے اِنسانی نفسیات خصوصاً مرد کی نفسیات کو اچھی طرح سے سمجھتی تھی۔ اب تک کی شادی شدہ زندگی میں بھی میں احمد کو اُن کی نفسیات کے مطابق ہی ڈیل کرتی تھی۔ مجھے اُن سے محبت تو تھی مگر میرا برتاؤ اُن کے ساتھ ولی جذبات کے والہانہ پن سے مزین نہ ہوتا تھا بلکہ میں تو اُن کے ساتھ اظہارِ محبت میں ایک سلوک رکھتی تھی۔ عامل اور معمول والا سلوک۔ میں جانتی تھی کہ ایک مرد کو اپنے جس وصف پر بڑا فخر ہوتا ہے۔ جس خداداد صلاحیت کی بناء پر وہ ایک نسل کی تخلیق کا امین ہوتا ہے۔ اگر اس میں کچھ کمی ہو، کجی ہو تو اول تو وہ اسے تسلیم ہی نہیں کرتا اور اگر مجبوراً تسلیم کر بھی لے تو پھر عمر بھر احساسِ کمتری اور صدمے سے بحال نہیں ہوتا۔ اوّل تو وہ اپنی یہ کمی کسی پر بھی ظاہر نہیں ہونے دیتا خصوصاً اپنی بیوی پر..... لیکن اگر خدانخواستہ اس کی بیوی ہی اس کے اس قدر حساس راز کی رازداں ہو جائے تو پھر وہ عمر بھر اس کا اسیر ہو کر رہ جاتا ہے۔ احمد..... پہلے بھی مجھ پر دل و جاں سے فدا تھے۔ مگر اس کے بعد تو وہ کبھی میرے حصار سے بدکنے کی کوشش بھی نہ کر سکتے تھے۔ یعنی احمد کبھی میرے ہوتے ہوئے دوسری شادی کا نہیں سوچ سکتے تھے۔ حالانکہ بحیثیت مرد یہ ان کا شرعی حق بھی تھا اور مجھ سے اولاد نہ ہونے کی صورت میں تو وہ اور بھی حق بجانب تھے کہ دوسری شادی کر لیتے۔ مگر..... میں، میں یہ کس طرح سے برداشت کرتی؟ میں یہ ہونے بھی کیسے دیتی؟ مجھ جیسی بڑے مرتبے والی عورتوں کا دل تو ویسے بھی بے حد چھوٹا ہوتا ہے۔ اَنا پرست اور خوددار کہلانے والے دراصل کس قدر کم ظرف اور تنگ نظر ہوتے ہیں یہ بھی مجھے علم تھا۔ خود میں ایسی ہی تھی..... پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ احمد کی زوجیت میں آئمہ کے علاوہ بھی کسی کا نام ہوتا؟ چنانچہ میں نے وہ سارے راستے بند کر دیئے جو میرے ایسے کسی بھی خدشے کو سچ کر سکتے تھے۔ میں نے اپنے دماغ میں اِس ساری ترکیب کو ترتیب دے کر ایک منصوبہ بنایا اور احمد کو بڑی ہی محبت کے ساتھ اس میں الجھا دیا۔ اب جو گرہ میں نے احمد کے دل و دماغ پر لگا دی تھی وہ خود میں بھی نہ کھول سکتی تھی۔ اگلے دو تین روز میں مَیں نے احمد کا اتنا خیال رکھا اور ان کی اس قدر دلجوئی کی کہ وہ میرے مشکور ہوتے ہوتے واقعی میرے اسیر ہو گئے۔

''آئمہ! تم کتنی اچھی ہو میں تمہاری محبت کا حق اگر عمر بھر ادا کرتا رہوں تب بھی نہ کر پاؤں گا.....''

ایک روز وہ میرے سامنے نظریں نیچی کیے اقرار کر رہے تھے۔

''احمد! آپ ایسا کیوں کہتے ہیں۔'' میں نے اپنی آنکھوں میں دنیا جہان کا پیار سمیٹ کر اُن کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''اچھا۔ اب ہم کبھی اس موضوع پر بات نہیں کریں گے۔ کسی سے بھی نہیں۔ حتیٰ کہ خود سے بھی نہیں۔''

احمد نے بالآخر وہ جملہ کہہ ہی دیا جسے کہنے کے لیے وہ گذشتہ چار پانچ روز سے مناسب الفاظ ڈھونڈ رہے تھے یا پھر مناسب وقت۔

''کیا آپ کو ذرہ برابر بھی شک ہے کہ میں کبھی ایسا کروں گی؟ مجھے آپ کی عزت آپ کا وقار اپنی جان سے بھی عزیز تر ہے۔''

میں نے اُن کے ہاتھوں کو پہلے اپنے ہاتھوں میں لے کر دبایا اور پھر اپنی آنکھوں سے لگا لیے۔

''آئمہ۔ تم سے مجھے یہی اُمید تھی۔ تھینک یُو۔ تھینک یُو آئمہ.....''

اُن کی آنکھیں نَم اور لہجہ شکستہ تھا۔

میں نے اپنی آنکھیں اُن نَم آنکھوں میں ڈال کر احمد کا دل اپنی گرفت میں اور بھی مضبوط کر لیا۔

مگر اُسی لمحے۔ ٹھیک اُسی لمحے میرے دل نے اِک ڈبکی کھائی اور سینے میں پھانس کی طرح چبھ گیا۔

❀❀❀

احمد کب سے ساحل سمندر سے چھوتی اور پلٹتی لہروں کو دیکھنے میں گم تھے اور میں اُن کے چہرے پر بنتی بگڑتی لکیروں کو دیکھنے میں گم۔ ہر لہر جو بڑی شوریدہ سری کے ساتھ غُل مچاتی ساحل کی طرف آتی تھی۔ وہ اس کی ریت کو چُھوتے ہی نرم پڑ جاتی اور پھر دُور تک اس میں سرسراتی ہوئی یوں داخل ہو جاتی جیسے کوئی روتا مچلتا بچہ اپنی ماں کی آغوش میں آ کر چپ ہو جائے اور پھر پُرسکون ہو کر سو جائے۔ ساحل سمندر کی ریت دُور دُور تک گیلی ہو چکی تھی۔ ہم دونوں جہاں بیٹھے تھے اب وہ جگہ بھی نم ہو چکی تھی۔ ہمارے پاؤں کے نیچے اب ٹھنڈی اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گیلی ریت تھی جو بے حد بھلی محسوس ہو رہی تھی۔ سورج بھی دن بھر کا تھکا ماندہ اب آہستہ آہستہ سمندر کی گود میں اُتر رہا تھا۔ ایک لال سرخ تھال جو سرمئی فلک کی پیشانی پر اس وقت بالکل ایسے دکھائی دے رہا تھا جیسے حجلۂ عروسی میں سر جھکائے بیٹھی دلہن کے ماتھے پر ٹیکا ڈھلک کر لٹکنے لگے۔ اس وقت سمندر کی شوریدہ سری بھی کچھ مدہم سی پڑ رہی تھی جیسے خود وہ سُورج کے اس طلسماتی سحر میں گرفتار ہو..... لب بستہ ہو۔ میں دنیا کے کینوس پر کل کائنات کے سب سے عظیم مصور کا پینٹ کیا ہوا یہ منظر دیکھ کر حیران ہوئی جا رہی تھی۔ جیسے جیسے سورج سمندر کی آغوش کی طرف اُتر رہا تھا ہر چیز تانبے کی ہوتی جا رہی تھی۔ سمندر کی گود میں تانبا..... آسمان پر تانبا..... سمندر کی لہروں میں تانبا اور اس کے آئینے میں دوسرا تانبے کا تھال..... میرا دل اس ہوشربا منظر کی مٹھی میں تھا اور میں اپنی کیفیت کو عجیب پا رہی تھی۔

سمندر کی لہریں میرے وجود میں اُٹھنے لگیں اور میرے دل و دماغ کی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر میرے جذبات میں گھلنے لگیں۔ اِک بے چینی اور اُداسی کا احساس مجھ پر طاری ہونے لگا۔ میرے وجود کا خالی پن بڑھنے لگا اور میری آغوش کے چاروں کونے پھیلتے پھیلتے سمندر ہو گئے۔ مجھے اس وقت ایک ایسے ہی سنہری ٹھنڈے اور طلسمی سورج کی طلب شدت سے محسوس ہوئی جو میری آغوش میں سما جائے اور میری بانہیں جسے سمیٹ کر اپنے کلیجے سے لگائیں تو ہم دونوں ہی سو جائیں۔ گہری اور پُرسکون نیند۔ وہ گہری اور پُرسکون نیند جو جانے کیوں میری آنکھوں سے روٹھ گئی تھی۔ جو پچھلے کئی روز سے میری پلکوں پر بوجھ بنی تو پڑی رہتی مگر اندر نہ اُترتی یہاں تک کہ بند آنکھوں سے کروٹیں بدلتے بدلتے صبح ہو جاتی۔ یا پھر میں زیادہ اُکتا جاتی تو اُٹھ کر کوئی کتاب پڑھنے لگتی۔ دوبارہ سے ٹی وی آن کر لیتی یا اپنے کمرے میں ہی چہل قدمی کرنے لگتی۔ اُس روز کے بعد میں رات کو باہر لان میں نہ گئی تھی۔ اب مجھے اس رات کے بارے میں سوچ کر ہی ایک جھرجھری سی آجاتی تھی اور میں بے ساختہ اپنے پاؤں کے تلوے پر اس جگہ ہاتھ رکھ دیتی جہاں اس رات مجھے کانٹا چبھ گیا تھا۔ میں نے پھر ایک جھرجھری لی۔ اُف خدایا! میں کیا سوچتی سوچتی کہاں نکل گئی تھی۔

میں نے گیلی ریت میں دھنسے اپنے پاؤں کھینچے۔ ان کے نیچے کی ریت اب پانی کی ایک پرت تلے آچکی تھی یقیناً سمندر کی کوئی لہر بے حد تھکی ہوئی تھی جو ریت سے ٹکرا کر پلٹنے کی

بجائے اِسی پر دراز ہو گئی تھی۔

میں نے نظریں اپنی دائیں طرف گھمائیں تو احمد اُسی طرح کھوئے کھوئے سے سمندر کی وسعتوں میں جانے کیا تلاش کر رہے تھے۔ اب اُن کے ہاتھ گیلی ریت سے کھیل رہے تھے۔ وہ دیکھے بغیر ہی اس گیلی ریت کو مٹھی میں بھر بھر کے سمندر کی طرف پھینک رہے تھے۔ سورج اپنے آدھے وجود کے ساتھ سمندر کی آغوش میں کھڑا تھا۔ جبکہ اُس کا اوپر کا آدھا حصہ دنیا پر ایک الوداعی نظر ڈال رہا تھا۔ وہ ڈوب رہا تھا مگر کل صبح پھر سے طلوع ہونے کے لیے۔ اُس ایک دن میں اُس نے دنیا بھر کا سفر کیا تھا..... بھانت بھانت کے لوگوں کو گناہ و ثواب کرتے دیکھا تھا۔ کسی کے ظلم اور کسی کے الم پر وہ پوری دوپہر تڑپا تھا۔ کتنے ہی درد، کیسے کیسے رنج اُس کے سینے میں دن بھر اُترتے رہے تھے۔ اور اب کتنا تھک گیا تھا وہ! بے شمار راز اپنے سینے میں دبائے اب شاید وہ رات بھر سمندر کی گود بھگوئے گا اور سمندر اس کے آنسوؤں کا نمک اپنی گہرائیوں میں بھر کر صبح اسے پھر تازہ دَم زندگی بخش دے گا۔

''امی جان! یہ سورج اور چاند سمندر میں کیوں چھپتے ہیں جا کر؟'' میں جب چھوٹی تھی تو اپنی ماں سے بارہا یہ سوال پوچھا کرتی تھی۔ تب وہ بڑے پیار سے مسکرا کر مجھے کہتی تھیں۔

''بیٹا! یہ دونوں ساری دنیا کے غموں کا بوجھ اُٹھاتے ہیں اور سمندر ہی ان کا بوجھ بٹا سکتا ہے اِس لیے یہ دونوں سمندر کی گود میں چھپ کر دنیا کے راز اس سے کہہ دیتے ہیں۔ سمندر چپ چاپ اس کے غم اپنے اندر اُتار لیتا ہے اور یہ دوبارہ سے آسمان پر جا کر دنیا کو جھانکنے لگتے ہیں۔ نہ یہ کسی اور سے کچھ کہتے ہیں نہ سمندر۔ دونوں کے دل بہت بڑے ہیں۔''

امی جان کی باتیں اُس وقت تو مجھے سمجھ نہ آتی تھیں مگر آج خوب سمجھ آ رہی تھیں۔ سورج، چاند، سمندر ایک تکون کی طرح میرے سامنے کھڑے تھے، اور میں اس کے کونوں میں اپنے گناہ ثواب ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ گناہ اور ثواب جنہیں یہ جانتے تھے مگر اپنے سینے میں راز کی طرح چھپائے تھے۔ میں پل بھر میں ہی ندامت کے پہاڑ تلے آ گئی۔

''احمد! اب واپس چلیں گے۔'' میں نے اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں ہلاتے ہوئے کہا۔

''واپس۔'' وہ ایک دم سے چونکے جیسے کسی گہرے خواب میں گم ہوں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اچھا چلو.....'' کچھ دیر بعد وہ سمندر کے طلسم سے خود کو چھڑا کر چل پڑے۔

''کیا ہوا آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے.....؟'' میں نے اُن کا بجھا بجھا سا چہرہ دیکھ کر پوچھا۔

''ہاں طبیعت تو بالکل ٹھیک ہے۔ بس ذرا دل اُداس سا لگ رہا ہے۔'' انہوں نے اپنی دلی کیفیت پوری سچائی سے بتا دی۔

''ہاں میری کیفیت بھی کچھ آپ سے جُدا نہیں ہے۔ جانے کیوں؟'' میں نے اپنی اُداسی کا اقرار کیا۔

''شاید یہ اِس منظر اور یہاں کے موسم کا اثر ہے۔ کہتے ہیں کہ ساحل سمندر پر سورج ڈوبنے کا منظر حساس لوگوں کو بے حد اُداس کر دیتا ہے اور ان کے جذبات میں بالکل ویسے ہی مدّ و جزر اُٹھنے لگتے ہیں جیسے اس کی لہروں میں ہوتے ہیں۔''

وہ کھوئے کھوئے سے بولے۔ ہم دونوں ساحل سمندر پر ننگے پاؤں چل رہے تھے..... اپنے جوتے ہاتھوں میں اُٹھائے.....

''احمد! ہم نے واپس جانا تھا۔'' میں نے انہیں سمندر کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

''آں..... ہاں.....'' وہ یوں بولے جیسے اُنہیں کوئی نادانستہ طور پر گھیر کر اُدھر لے جا رہا ہو۔ شاید سمندر کا سحر۔

''اچھا چلو آؤ ذرا آگے پانی تک چلیں۔'' وہ اُسی طرح سحر زدہ سے چلتے جا رہے تھے۔

''اِس وقت۔ نہیں احمد! اِس وقت تو لوگ سمندر سے واپس جا رہے ہیں اور وہ دیکھیں سیکورٹی گارڈ بھی لوگوں سے واپسی کا کہہ رہے ہیں۔'' میں نے دیکھا وہ آدھا سورج بھی سمندر کی گود میں اُتر چکا تھا اور اب وہ تانبے کی روشنی بھی جیسے آخری سانسیں لے رہی تھی۔ سرمئی آسمان پر اندھیرے کا غلاف چڑھ رہا تھا۔ ایسے میں ٹھاٹھیں مارتا سمندر مجھے بے حد ہیبت ناک اور بپھرا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر احمد کو تھام لیا۔

''احمد! واپس چلیں۔'' میری آواز قدرے بلند تھی۔ اردگرد کے لوگوں نے بھی گردنیں موڑ کر ہمیں دیکھا تھا۔

''واپس..... اچھا چلو۔ کل آئیں گے تو آگے تک چلیں گے۔''

انہوں نے سمندر کو عجیب حسرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ مجھے اس گھڑی سمندر ایک عامل دکھائی دیا اور احمد معمول.....! میں اور بھی ڈر گئی اور احمد کا ہاتھ کھینچتی ہوئی انہیں زبردستی واپس لے آئی۔

احمد چپ چاپ سے میرے ساتھ واپس آ گئے اور راستے میں بھی ویسے ہی رہے مجھے ان کے پیلے زرد چہرے اور اس گہری چپ سے سخت گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔

''احمد! مجھے بھوک لگی ہے.....'' میں نے راستے میں ایک ریستوران کو دیکھ کر فوراً کہہ دیا۔

''تو کھانا کیا یہاں کھاؤ گی؟ تم تو کہہ رہی تھیں کہ تم نے صدر سے نہاری کھانی ہے۔'' وہ مجھے یاد کراتے ہوئے بولے۔

''صدر سے نہاری۔ ہاں نہاری ہی کھاتے ہیں۔'' میں نے یاد آنے پر کہا۔ وہ میری طرف دیکھ کر ذرا مسکرائے۔

''دیکھ لو! زیادہ بھوک تو نہیں لگ رہی صدر پہنچنے میں کچھ دیر لگ جائے گی.....'' انہوں نے ٹریفک کے اژدھام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''خیر ہے آپ چلیے۔'' میں نے انہیں مسکراتے دیکھ کر سکون کا سانس لیا کچھ دیر بعد وہ اُداسی اور چپ کے اس خوفناک خول سے باہر نکل آئے تھے اور مجھ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے انجوائے کر رہے تھے، اور میں انہیں خوش دیکھ کر دل میں سوچ رہی تھی کہ کل تو ہرگز بھی ہم سمندر کی سیر کو نہ جائیں گے۔

❀❀❀

ہمیں کراچی آئے ہوئے یہ تیسرا دن تھا۔ پہلے دو روز تو ہمیں حنا ممانی نے ہی کہیں نہ جانے دیا تھا۔ یہ احمد کی بڑی ممانی تھیں جو احمد کے ساتھ ساتھ مجھے بھی بے حد چاہتی تھیں۔ بس پہلے روز شام کو ہم لوگ ممانی سے آغا خان ہسپتال کا کہہ کر گھر سے نکلے اور والٹن میں اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ ہم لوگ گھر سے اسی پروگرام کے تحت کراچی آ گئے تھے۔ یہ بھی میری ضد تھی اور میں احمد کو یہ سمجھا کر لے آئی تھی کہ اس طرح گھر والے ہمیں بار بار پوچھیں گے بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں کہ کراچی کیوں نہیں گئے؟ اور سب مطمئن بھی ہو جائیں گے کہ چلو ہم نے اپنا علاج شروع کرا دیا ہے۔ کراچی آ کر اب ایک مشکل یہ تھی کہ حنا ممانی کے بیٹوں کا آغا خان میں خاصا میل ملاپ اور اثر و رسوخ تھا۔ وہ بضد تھے کہ ہم لے چلتے ہیں۔ احمد نے انہیں بڑی مشکل سے ٹالا تھا یہ کہہ کر کہ خود اُن کے بہت سے دوست ڈاکٹر ہیں جو یہاں پر جاب کر رہے ہیں۔ یوں بات کچھ بن گئی تھی اور ہم گھر سے باہر گھوم گھام کر وہاں کہہ چکے تھے کہ چیک اَپ تو ہو گیا ہے بس رپورٹیں دو روز بعد ملیں گی۔

حنا ممانی نے بڑی ہی محبت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دعا دی تھی۔

''اللہ! تیری گود میں چاند سا بیٹا دے.....'' اور میں نے دیکھا تھا اس وقت کھاتے کھاتے احمد کو ایک دم سے پھندا لگ گیا تھا اور پھر کتنی دیر وہ کھانستے رہے یہاں تک کہ ان کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔ میں اُن کی کمر کو ہولے ہولے سہلا رہی تھی اور ممانی ان کو دیکھ کر اس قدر پریشان ہو گئی تھیں کہ ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ وہ کبھی انہیں پانی پینے کو کہہ رہی تھیں تو کبھی ذرا سی چینی منہ میں ڈالنے کو۔

''میں ٹھیک ہوں ممانی جان.....'' احمد نے انہیں بے چین دیکھ کر تسلی دینے کو کہا تھا حالانکہ انہیں واقعی بہت بُرا پھندا لگا تھا۔

''آئمہ! مجھے ذرا سی سونف لا دو اور تھوڑا قہوہ بنا دو۔ بس اب کھانا نہیں کھایا جائے گا.....''

وہ اپنی لال ہوتی آنکھیں میری طرف اُٹھا کر بولے تو مجھے لگا وہ آنکھیں نوالے کا پھندا لگنے سے لال نہیں ہوئی تھیں بلکہ وہ تو اس دُھویں سے ایسی پانی بھری ہو گئی تھیں جو ان کے اندر لگی آگ سے اُٹھ رہا تھا..... احساسِ محرومی کی آگ..... اپنے نامکمل اور ناکام ہونے کے احساس کی آگ..... وہ آگ جسے سلگانے والی میں تھی..... میں آئمہ! احمد حسن کی شریکِ حیات۔ اُن کی زوجہ۔ اُن کے وجود کا آدھا حصہ.....!

شرم سے میری نگاہیں جھک گئیں، اور میں تیزی سے اُن کے لیے سونف لینے کچن کی طرف لپکی حالانکہ ممانی جان آوازیں دیتی ہی رہیں کہ آئمہ تم رہنے دو، فضل دین سونف لا رہا ہے مگر میں تو احمد سے آنکھیں چُرانا چاہتی تھی..... اب میری آنکھوں میں اتنی سکت رہی کہاں

تھی کہ میں احمد کی طرف اُنہیں اُٹھا لوں تو ٹکا کر تکتی بھی رہوں۔ میں تو خود اپنی ذات کے کٹہرے میں کھڑی رہنے لگی تھی۔ ایک چور کی حیثیت سے۔ ایسے چور کی حیثیت سے جس نے کسی کی قیمتی متاع برملا چُرا تو لی تھی مگر وہ اقرارِ جرم کرنے سے صاف انکاری تھا۔ نہ اپنے سامنے نہ اُس کے سامنے جس کا وہ چور تھا۔

تیسرے دن حنا ممانی کے بے حد اصرار سے روکنے کے باوجود احمد ہوٹل میں شفٹ ہو گئے۔ وہ تو پہلے ہی ہوٹل جا رہے تھے کہ کسی کے گھر پر وہ مہمان بن کر رہنے میں سہولت محسوس نہ کیا کرتے تھے مگر اس بار اماں جان کی خاص تاکید تھی کہ ہم لوگ ماموں جان کے گھر لازماً جائیں۔

''او تھینکس گاڈ! ہم وہاں سے چھوٹے.....'' ہوٹل میں آ کر احمد نے آرام سے نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔

''بُری بات احمد! ممانی جان ہماری مہمان داری کس قدر محبت سے کر رہی تھیں'' میں نے انہیں پیار سے ڈانٹا۔

''محبت سے یا تکلفات سے.....؟ تمہیں پتہ ہے نا مجھے تکلف اور تصنع دونوں ہی نہیں بھاتے۔'' وہ قریب پڑے میگزین کو اُٹھا کر ورق گردانی کرتے ہوئے بولے۔

''اچھا بابا! جیسے آپ کی مرضی.....'' میں نے بھی خود کو آرام کرسی پر گرا لیا۔ واقعی مجھے بھی یہاں آ کر کچھ سکون محسوس ہو رہا تھا۔ ہم دونوں ہی تو ایک جیسے تھے..... لوگوں سے دُور رہنے والے۔ دوسروں کی محبتوں سے گھبرا جانے والے اور اپنے آپ میں مگن رہنے والے۔ حالانکہ اماں اِسی بات پر اکثر ہمیں اچھا خاصا ڈانٹا کرتی تھیں کہ ''تم لوگ آدم بیزار کیوں ہو؟ بیٹا! لوگوں سے ملا جلا کرو اس سے اِنسان کو نہ صرف خوشیاں میسر آتی ہیں بلکہ اُس کے دکھ سکھ بانٹنے والوں کا حلقہ بھی بڑھتا ہے۔ انسان اک دوجے سے بہت کچھ سیکھتا ہے۔''

''اماں جان! ہم کب دوسروں سے نہیں ملتے۔ ہمارا تو اتنا وسیع حلقۂ احباب ہے۔'' میں نے اماں جان کو یاد کرانا چاہا۔

''ہاں وہ تمہارا حلقۂ احباب.....'' انہوں نے مجھے ذرا ترچھی نگاہوں سے دیکھا اور پھر مزید بولیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''جن کے ہونٹوں پر پھیکی اور مصنوعی مسکراہٹیں مگر دلوں میں حسد اور کینہ بھرا ہوتا ہے۔ اِک دوجے کو ٹانگ کھینچ کر گرانے اور اُس کی جگہ خود کو لانے کے جذبات سینے میں چھپائے۔ منہ سے ہیلو ہائے اور ہاؤ آر یو کہنے والے دورُخے لوگ.....ارے اپنوں سے ملو۔ جن کے اخلاص میں اگر کبھی کچھ ملاوٹ ہوتی بھی ہے تو کسی وقتی غصے، گِلے یا شکایت کی وجہ سے ہوتی ہے اور جو مل کر کہہ دینے سے ختم ہو جاتی ہے۔ مگر تم تو رشتہ داروں سے جانے کیوں دُور بھاگتے ہو۔''

''اے موی! کیا سوچنے لگیں.....؟'' مجھے خیالات میں گم پا کر احمد پوچھنے لگے۔

''بس ایسے ہی اماں جان کی کچھ باتیں یاد آ گئی تھیں۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ آج کل میں سچ زیادہ بولنے لگی تھی۔ اپنے دلی جذبات کا بَرملا اور کھرا اظہار نادانستہ ہی کر دیا کرتی تھی۔

''اماں جان تو مجھے بھی بہت یاد آ رہی ہیں۔'' وہ اُداس لہجے میں کہنے لگے۔ ''آئمہ! پتہ نہیں کیوں آج کل مجھے اماں جان بہت یاد آ رہی ہیں حالانکہ پہلے تو میں ہفتوں گھر سے بلکہ ملک سے بھی باہر رہا ہوں مگر وہ مجھے یوں کبھی یاد نہیں آئیں۔''

''تو آپ فون کر لیں۔'' میں نے موبائل اُن کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔'' وہ جلدی سے نمبر ملانے لگے۔

''السلام علیکم اماں جان! کیسی ہیں آپ؟'' وہ بے تابی سے پوچھ رہے تھے۔

''وعلیکم السلام میرے بچے جیتے رہو۔ میں الحمدللہ بالکل ٹھیک ہوں بس تم لوگوں کے بغیر گھر سُونا سُونا لگ رہا ہے۔'' وہ محبتوں میں ڈوبے لہجے میں بولیں۔ احمد نے موبائل کا سپیکر آن کر لیا تھا اِس لیے ہم دونوں ہی ان سے گفتگو کر رہے تھے۔

''اماں! میں بھی آپ کے بغیر بے حد اُداس ہوں۔'' احمد کی آواز گلوگیر ہو گئی۔

''میں صدقے میری جان! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟'' وہ تڑپ کے پوچھ رہی تھیں۔

''اماں جان! میری طبیعت ایک دم سے ٹھیک ہے۔ بس ایسے ہی دل کچھ اُداس ہے۔''

''اور آئمہ کیسی ہے؟'' انہوں نے میرا پوچھا تو میں نے فٹ انہیں سلام عرض کر دیا۔

''السلام علیکم اماں جان! میں بالکل عافیت سے ہوں.....''

''اللہ اپنی امان میں رکھے۔ اچھا بتاؤ ڈاکٹروں نے کیا کہا؟''

وہ مجھ سے اصل بات پوچھنے لگیں۔

''ڈاکٹروں نے.....؟'' میں تو ایک دم سے بوکھلا ہی گئی۔

''ہاں ہاں کیا کہا۔ خیر تو ہے۔ دیکھنا بچی کوئی اچھی خبر سنانا۔ میرا تو جی بیٹھا جا رہا ہے۔''

وہ سچ مچ پریشان ہو گئی۔

''ارے۔ اماں! پریشان نہ ہوں سب ٹھیک ہے۔ ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔'' میری جگہ احمد نے بات کو سنبھال لیا۔

''اچھا اللہ نہ کرے کہ کوئی فکر والی بات ہو۔ اللہ تمہارے مقدروں میں ہنستے بستے دراز عمروں والے بچے لکھ دے۔'' انہوں نے بڑی محبت سے، پورے دل سے ہمیں دُعا دی۔

''میں تو کہتی ہوں یہ سفر آئمہ کے لیے مبارک ہی ثابت ہو اور وہ آتے ہی مجھے خوش خبری سنائے۔'' اماں جان تو جیسے بے صبری ہوئی بیٹھی تھیں۔

''اچھا اماں جان گھر میں باقی لوگ کیسے ہیں؟'' احمد نے جلدی سے بات بدلی۔

''سب ٹھیک ہیں۔ عمید تمہیں بہت یاد کرتا ہے۔'' وہ عمید کی باتیں بتانے لگیں تو احمد کے اُداس چہرے پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

''اماں اُس کو گود میں لے کر میری طرف سے پیار کرنا۔'' احمد نے تصور ہی تصور میں اُسے خود سے چپکا کر بھینچتے ہوئے کہا۔

''اچھا اماں جان اپنا خیال رکھیے گا ہم پھر فون کریں گے۔'' میں نے جلد ہی انہیں خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا کہ مبادا وہ پھر کچھ اور پوچھنے نہ لگیں جس کا جواب نہ میرے پاس تھا اور نہ ہی اب احمد کے پاس۔

''آئمہ! اِس بار کراچی مجھے بہت بور لگ رہا ہے جی چاہ رہا ہے فوراً واپس چلے جائیں۔'' رات کے کھانے کے بعد ہم صدر سے لوٹ رہے تھے تو احمد نے کہا۔

''Same here'' میں نے اُن کی طرف دیکھ کر اُداسی سے جواب دیا۔

''تو پھر کرا لوں کل کی بکنگ؟'' وہ ایک دم جذباتی ہو گئے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''کل کی تو نہیں ابھی ہمیں دو روز مزید یہاں رہنا پڑے گا۔ بھئی آغا خان والا ڈرامہ ابھی پورا نہیں ہوا۔'' میرے منہ سے یونہی نکل گیا جس پر نہ صرف احمد کا منہ لٹک گیا بلکہ میں خود بھی شرم سے پانی پانی ہوگئی۔

''ہاں ڈرامہ۔ اب تو یہ ڈرامہ ہمیں عمر بھر رچانا پڑے گا۔ یا شاید اس وقت تک جب تک کہ تم چاہو گی اور میرا ساتھ دو گی۔'' وہ بے حد غمگین ہو گئے۔

''احمد! پلیز میں ہوں ناں آپ کے ساتھ.....'' میرا دل اُن کے اِس انداز پر تڑپ اُٹھا۔

''ہاں ایک تم ہی تو ہو۔ میری سب سے عزیز دوست۔ میری ہم راز اور دم ساز۔'' وہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر بے حد محبت سے بولے۔

اور میرے دل و دماغ میں بہت سی آوازیں چلّانے لگیں۔ جیسے آندھیاں چل رہی ہوں۔ دھوکے باز۔ بے ایمان۔ چور۔ چور۔ چور.....''

احمد وہ آوازیں سن نہ لیں اِس ڈر سے میں اُن سے اپنا ہاتھ چھڑا کر باتھ رُوم میں جا گھسی اور واش بیسن کی ٹونٹی کو پورا کھول دیا۔ مگر اتنے سے پانی کا شور میرے اندر کے شور کو دبانے کے لیے کم تھا۔ ''دغا باز..... بے وفا..... یار مار۔''

بہت سی آوازیں مجھے گالیاں دے رہی تھیں۔ اور میں آئمہ احمد اپنے کانوں پر دونوں ہاتھ رکھے پھر بھی کہہ رہی تھی۔

''نہیں نہیں میں ایسی نہیں ہوں۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا!!''

کراچی میں یہ ہمارا آخری دن تھا۔ ہمیں اگلی صبح کی فلائٹ سے واپس لاہور جانا تھا۔ اگرچہ ہم نے یہ چھ روز کراچی میں محض مجبوری اور بے دلی کے ساتھ ہی گزارے تھے پھر بھی جانے کیوں اب واپس جاتے ہوئے ہم دونوں ہی اُداس تھے۔ جو کیفیت میری تھی وہی احمد کی بھی تھی۔ وہ بھی یہی کہہ رہے تھے۔

''میں نے اگر کل صبح کی ٹکٹیں کنفرم نہ کروائی ہوتیں تو ہم ایک روز اور کراچی رہ لیتے۔''

''اچھا تو آپ اب فون پر کل کی بجائے پرسوں کی سیٹیں کروالیں.....'' میں نے انہیں اُداس دیکھ کر کہا۔

''نہیں اب تو نہیں۔ اب تو چلتے ہیں پھر کچھ دنوں کے بعد آجائیں گے۔'' وہ اُسی کھوئے کھوئے انداز میں بولے جیسے ان کا کچھ کراچی میں رہ گیا ہو جسے وہ بعد میں لینے آئیں گے۔

''لگتا ہے آپ کو کراچی بہت پسند ہے۔'' میں فریج میں سے ٹھنڈے جوس کی بوتل اور گلاس اُن کے پاس لے آئی۔

''ہاں مجھے کراچی بہت پسند ہے اور اس سے بھی بڑھ کر سمندر.....'' انہوں نے جوس کا گلاس ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

''مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ آپ کو سمندر کتنا بھاتا ہے۔'' میں نے بھی جوس سے لطف اندوز ہوتے ہوئے جواب دیا۔

''اگلی بار جب ہم کراچی آئیں گے تو وہیں ساحلِ سمندر پر کوئی ہٹ لے لیں گے اور.....اور اسٹیمر بھی۔ میں خود تمہیں سمندر کی وسعتوں تک لے چلوں گا۔ وہ میرا دوست طاہر واسطی ہے ناں.....وہ جو نیوی میں میجر ہے.....؟''

''جی.....جی مجھے یاد ہے۔''

اُس سے میں پہلے سے ہی کہہ دوں گا وہ رہنے کے لیے ہٹ اور سمندر کی سیر کے لیے اسٹیمر کا انتظام کر دے گا.....'' احمد ابھی کراچی سے گئے نہیں تھے اور دوبارہ آکر رہنے کا پروگرام ترتیب دے رہے تھے۔ بالکل اُس چھوٹے بچے کی طرح جو گرمیوں کی چھٹیاں گزار کر پھر سے اگلی چھٹیوں کا انتظار کر رہا ہو۔

''اچھا بابا جیسے آپ کا دل کرے ویسے ہی کر لیں گے اب تو چلیں.....'' میں نے انہیں یاد کروایا کہ ہم نے گھر والوں کے لیے کچھ شاپنگ کرنے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔

''ارے ہاں میں تو بھول گیا تھا۔ چلو جلدی کرو۔'' وہ اُٹھ کر باتھ روم میں گھس گئے اور میں وہاں سے چیزیں سمیٹنے لگی۔

❀❀❀

''آئمہ! یہ دیکھو یہ پرنٹ کیسا ہے؟''

''ہاں۔ بے حد خوبصورت۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اور یہ کلر اسکیم اور کپڑا.....'' وہ ایک کھلے ہوئے تھان کا سرا اپنے ہاتھ میں تھامے بیٹھے بڑے ہی شوق سے اِسے دیکھ رہے تھے۔

''یہ پرنٹ..... یہ کلر اسکیم اور اس کپڑے کی کوالٹی واقعی بہت اعلیٰ ہے۔ آپ یہ کس کے لیے لینا چاہ رہے ہیں؟'' میں نے ذرا تجسس سے پوچھا۔

''اماں جان کے لیے اور بھلا کس کے لیے.....''

''ہاں انہیں یہ بہت پسند آئے گا اور اُن پر جچے گا بھی خوب۔''

انہوں نے وہ سوٹ اپنی اماں جان کے لیے خریدا۔ پھر اُن کے لیے شفون کے چند دوپٹے لیے۔ وہ یہ خریداری کرتے ہوئے بڑی ہی احتیاط اور جانچ پڑتال سے کام لے رہے تھے بالکل اس طرح جیسے کوئی بڑی ہی سگھڑ بیٹی اپنی ماں کے لیے خریداری کرے۔ میں کچھ حیران بھی تھی کہ میں نے انہیں اِس طرح لگاؤ سے خالص خواتین کے لیے کپڑا خریدتے پہلی بار دیکھا تھا۔ اُن کو دیکھ کر میں نے بھی وہی سُوٹ اپنی امی جان کے لیے خرید لیا ورنہ پہلے تو میں نے جب بھی کبھی اپنی امی کے لیے تحفہ خریدا تو سویٹر یا شال ہی خریدی تھی۔

''تم اپنے لیے بھی لے لو.....'' احمد مجھے ایک اور پرنٹ دکھاتے ہوئے بولے۔ سُرخ اور کالے رنگ کے کنٹراسٹ میں بے حد نفیس پرنٹ تھا جس کا دوپٹہ تو بہت ہی حسین تھا۔

''آپ کو پسند ہے تو آپ خود لے کر دیں۔'' میں نے ذرا لاڈ سے کہا جس پر احمد نے وہ سُوٹ اور پھر اپنی پسند سے دو سُوٹ اور میرے لیے خریدے۔ اِس کے علاوہ مجھے جوتے، پرس جیولری سب کچھ لے کر دیا اور اِس بار احمد نے ہر چیز اپنی پسند سے خریدی۔ میں تو بس خاموشی سے مسکراتی نظروں کے ساتھ انہیں ایسا کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ احمد بڑے خوش دل اور شاہ خرچ تھے۔ مجھ پر خرچ کر کے خوش ہوتے تھے۔ پہلے ایسا ہوتا تھا کہ وہ مجھے شاپنگ کے لیے اچھی خاصی رقم دے دیتے تھے اور کہتے تھے جاؤ جو لینا ہے لے لو۔ مگر اِس بار وہ مجھے لے لے کر دے رہے تھے اور خوش ہو رہے تھے۔

پھر انہوں نے اپنے گھر والوں کے لیے بھی تحائف لیے۔ بھائیوں بھابیوں اور اُن کے بچوں کے لیے۔ اپنے ڈرائیور اور کھانا پکانے والی ماسی کے لیے بھی..... یہ احمد کی پُرانی عادت تھی وہ چاہے دو روز کے لیے بھی کہیں جاتے کچھ نہ کچھ سب کے لیے ضرور لاتے تھے۔

اُنہیں اپنے گھر والوں کے ساتھ خصوصی محبت تھی جس پر میں بہت کڑھتی اور اکثر احمد کے ساتھ اُلجھ بھی پڑتی تھی مگر اِس بار مجھے اُن کے ایسا کرنے پر ذرا بھی غصہ نہ آیا نہ ہی میں نے انہیں روکا۔ عمید کے لیے احمد نے سب بچوں سے زیادہ چیزیں خریدیں۔ کھلونے، کپڑے، جوگر، ٹافیاں، چاکلیٹ..... اور ہر ہر چیز خریدتے ہوئے والہانہ انداز میں کہا۔

''دیکھو آئمہ! یہ عمید کے لیے کیسی ہے۔ یہ رنگ دیکھو اس پر کیسا کھلے گا؟ اِس ریموٹ کنٹرول کار کو دیکھ کر وہ کتنا خوش ہوگا۔ اور..... اور یہ سارے چاکلیٹ میں اسے یونہی تھوڑا دے دوں گا۔ بلکہ ایک چاکلیٹ پر اُس کے کئی بوسے لوں گا۔ تھوڑا اُسے ستاؤں گا تنگ کروں گا اور جب وہ میرے گلے میں بانہیں ڈال کر کہے گا..... بابا جان! پلیز چاکلیٹ دے دیں ناں..... تب دوں گا.....''

وہ عجب دیوانگی سے کہہ رہے تھے۔ اس وقت اُن کے چہرے پر ایک انوکھی سی چمک تھی جس کے ہالے میں ان کا چہرہ بڑا ہی جاذب اور معصوم دکھائی دے رہا تھا۔

''چلیں احمد! اب بس کریں ہمیں دیر ہو رہی ہے۔ ابھی جا کر پیکنگ بھی کرنی ہے۔''

میں نے اِنہیں ایک دم سے ٹوک دیا جس پر اُن کے چہرے کے گرد دمکتا ہوا روشنی کا وہ ہالہ فوراً ہی ماند پڑ گیا۔

''ہاں..... ہاں مجھے تو خیال ہی نہیں رہا واقعی بہت دیر ہو گئی۔'' وہ بجھے بجھے لہجے میں بولے۔ انہوں نے جلدی سے دکاندار کو بل کی ادائیگی کی اور شاپر اُٹھائے باہر آ گئے۔

''ٹیکسی.....'' وہ مجھ سے نظریں چُرائے کھڑے تھے۔ رات ہم لوگوں نے احمد کے ماموں زاد بھائی کی گاڑی واپس بھجوا دی تھی اِس لیے آج ہم ٹیکسی کے محتاج تھے۔ ہم لوگ طارق روڈ پر کھڑے تھے اور یہاں پر ٹیکسی والے سڑک پر سفر کرنے کی بجائے آسمان پر اُڑتے ہیں۔ بڑی مشکل سے کسی کو دیکھ کر ٹھہرتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے انتظار اور کوشش کے بعد ایک ٹیکسی والا ہم پر مہربان ہو ہی گیا۔

''کہاں چلیں گے صاحب؟'' وہ کھڑکی سے باہر سر نکال کر پوچھ رہا تھا۔

''بولو آئمہ کہاں چلنا ہے۔'' احمد مجھے پوچھ رہے تھے مگر اُن کی نظریں مجھ پر نہ تھیں۔

''واپس ہوٹل اور کہاں؟'' میں نے ٹیکسی کا دروازہ کھول کر اندر شاپنگ بیگ ڈالتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئے کہا۔ احمد نے ٹیکسی والے کو ہوٹل کا نام و پتہ بتایا اور باقی سامان آگے کی سیٹ پر ڈال کر پیچھے آ بیٹھے۔

آتے ہوئے جس قدر ہم دونوں باتیں کر رہے تھے واپسی پر اتنے ہی چپ تھے۔ کچھ دیر پہلے بات بے بات ہنستے مسکراتے اور مجھ پر شوخ نگاہیں ڈالتے احمد سارے راستے خاموشی سے باہر دیکھتے رہے اور میں دل ہی دل میں بے حد شرمندہ یہ سوچتی رہی کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟

اور یہ میں نے پہلی بار تو نہیں کیا تھا۔ احمد نے جب بھی عمید کے لیے اپنی وارفتگی ظاہر کی میں نے ایسے ہی بُرے رویے کا اظہار کیا تھا۔ میں اس چھوٹے سے معصوم بچے کے ساتھ بھی اکثر ایسی ہی سرد مہری دکھا جایا کرتی تھی جس پر وہ بڑی ہی حیرانی کے ساتھ مجھے دیکھتا اور پھر وہاں سے چلا جاتا تھا۔ مجھے بعد میں بڑا افسوس بھی ہوتا تھا کہ میں ایسے کیوں کرتی ہوں مگر نہ چاہتے ہوئے بھی پھر دوبارہ میں وہی حرکت کر جاتی تھی۔ عمید کو دیکھ کر میرا دل بے چین ہو جاتا تھا۔ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ مجھے عمید سے حسد محسوس ہوتا تھا۔ وہ مجھے اچھا بھی لگتا تھا اس پر مجھے پیار بھی آتا تھا مگر میں اُسے زیادہ دیر برداشت نہ کرتی تھی۔

''اُترو آئمہ! ہوٹل آ گیا ہے۔'' احمد نے مجھے آواز دی تو میں چونکی۔ ڈھیر سارے شاپنگ بیگ احمد تنہا ہی اُٹھا کر کمرے تک لائے۔ میں نے تو سیدھا کمرے میں آ کر ہی سانس لیا تھا۔

❀❀❀

رات کا کھانا بھی احمد نے کمرے میں ہی منگوا لیا تھا جسے نہ احمد نے رغبت سے کھایا اور نہ ہی میں کھا سکی۔ میں اور احمد دونوں ہی ایک دوسرے سے نظریں نہ ملا رہے تھے حالانکہ ایسا تو کچھ بھی نہ ہوا تھا جس پر ہم دونوں اتنے اُداس یا ایک دوسرے سے خفا ہوتے۔ پر ہمارے دلوں کو کسی نے چٹکی میں بھر لیا تھا۔ شاید ہمارے اندر کے چور نے..... ہم دونوں کے سینوں میں گھٹن تھی اور آنکھوں میں دُھواں..... اِسے ہم دونوں ہی خارج کرنا چاہتے تھے مگر اِک دوسرے سے چھپ کے.....

''اوہ مجھے یاد آیا مجھے تو کچھ ضروری انٹرنیشنل کالز کرنی تھیں۔ میں ذرا نیچے PCO تک

جا رہا ہوں۔ بس ابھی چند منٹوں میں واپس آ جاتا ہوں۔''

احمد نے بیٹھے بیٹھے یوں چونکتے ہوئے کہا جیسے اُنہیں واقعی ایسا کرنا ہو۔ یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئے، اور میں اُن کے جاتے ہی بستر پر اوندھی پڑ گئی۔ ''میں آئمہ احمد حسن جسے اپنے مضبوط اعصاب پر بڑا مان تھا اور جو رونے کو بڑی کمزوری سمجھتی تھی..... آج کل بات بے بات رو پڑتی تھی۔ حالانکہ میں تو دن میں عام طور پر کئی جھوٹ بول لیا کرتی تھی مگر جھوٹ کے صرف اک احساس نے مجھے خود اپنا مجرم بنا دیا تھا۔ میں جسے گناہ اور ثواب کی کچھ حقیقی تشریح بھی معلوم نہ تھی لیکن اپنے شوہر کو مورد الزام ٹھہرانے والا عمل گناہ کے تمام تر معنوں کے ساتھ میرے دماغ میں گڑ گیا تھا..... اِس نے تو میرے سارے اعصاب کو ہی شل کر ڈالا تھا..... ابھی اِس جھوٹ کے کھیل کو چند ماہ ہی گزرے مگر سزا کی بازی میرے احساسات پر جمنے لگی تھی۔ میں تو ابھی سے اُلجھنے لگی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ احمد کو سب سچ سچ بتا دوں..... وہ مجھ سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ مجھے معاف کر دیں گے..... مگر میں سدا کی اپنی اَنا کے خول میں رہنے والی بھلا کب اس سے باہر آ سکتی تھی..... میں تو اپنے اس خول میں کوئی کروٹ کوئی شکن تک نہ آنے دیتی تھی کہ مبادا وہ چٹخ جائے۔

''میں بہت بُری ہوں۔ میں اچھی بیوی نہیں ہوں..... میں تو اچھی دوست بھی نہیں ہوں۔''

میں نے اپنے آپ کو انتہائی معمولی سی لعن طعن کی، چند آنسو بہائے اور اپنا جی ہلکا کر لیا۔ کچھ دیر کے بعد میں بستر سے اُٹھی، واش بیسن میں ٹھنڈے پانی کی ٹونٹی کو کھولا، چہرے اور آنکھوں پر پانی کے چھپاکے مارے۔

''گول آئمہ..... کیوں خود کو ہلکان کرتی رہتی ہو۔ جو ہوا سو ہوا..... اور جو ہوا وہی ہونا تھا۔ تمہاری قسمت کے لکھنے والے نے یہی لکھا تھا، اور احمد کے بھی..... لہٰذا اِس میں تمہارا کیا قصور..... تم خواہ مخواہ خود کو بُرا بھلا مت کہا کرو۔'' میں نے خود کو سمجھایا، اپنی برین واشنگ کی اور قدرے فریش ہو کر باہر آ گئی۔

''پاگل ہو اِس طرح سے پریشان رہ رہ کر تو تم ذہنی مریضہ بن جاؤ گی۔ خوش رہا کرو۔ بھول جاؤ۔'' میں ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہو کر خود سے باتیں کرنے لگی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''موسیقی روح کی غذا ہے۔ انسان کو ذہنی دباؤ سے نکال کر ہلکا پھلکا کر دیتی ہے.....''

اِک پُرانا مقولہ میرے ذہن میں کوندا۔

''ارے ہاں۔ میوزک.....'' میں نے کچھ یاد آنے پر چٹکی بجا کر خود کو داد دی میں جب کالج میں تھی تو مجھے کتنا لگاؤ تھا موسیقی سے۔ یہاں تک کہ میں اپنے امتحانات کی تیاری کے وقت بھی واک مین کانوں سے لگائے رکھتی تھی۔ مجھے لگتا تھا یہ طریقہ اِردگرد سے غافل کر کے انسان کو اُس کے اصل نقطہ حاصل کی جانب یکسو کر دینے میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ پھر مجھے موسیقی سننے کے ساتھ ساتھ سیکھنے کا بھی شوق چُرایا۔ مگر جب امی جان نے یہ بات سنی تو وہ سخت ناراض ہوئیں انہوں نے پاپا کو بھی جانے کیا کیا کہا کہ وہ بھی میرے اس شوق کی تکمیل کے لیے نہ مانے۔ یوں خود گانے کا خواب تو پورا نہ ہو سکا مگر اچھے اچھے سنگرز کی ڈھیروں کیسٹوں اور سی ڈیز سے میری الماری بھر گئی تھی۔ اگرچہ شادی کے کچھ عرصے بعد میرا یہ شوق ذرا ماند پڑ گیا تھا مگر میں اب بھی موسیقی سے شغف رکھتی تھی۔ احمد بھی اچھی موسیقی سنتے تھے فرق صرف اتنا تھا کہ احمد کو صرف غزلیں پسند تھیں جبکہ میں ہر طرح کے گانے سن لیتی تھی بس آواز اور موسیقی اچھی ہونی چاہیے۔

ارے..... ہمارے کمرے میں اتنا جدید سی ڈی پلیئر موجود تھا مگر ہم نے اِسے آن تک نہ کیا..... میں نے سامنے پڑے سی ڈی پلیئر کی طرف بڑھتے ہوئے سوچا۔ ٹی وی ٹرالی کی دراز میں کچھ DVDs بھی پڑی تھیں۔ میں نے ایک کو اٹھا کر لگایا اور آن کر دیا۔

کمرے میں ایک دم سے شور مچ گیا۔ بے ہنگم موسیقی اور کسی انگلش سنگر کی بھونڈی آواز میرے چاروں طرف ناچ ناچ کر جیسے میرا مذاق اُڑانے لگی تھی:

Smack that all on the floor..... Smack that give me Some mor..... Smack that do you ge more.....

میں نے فوراً ہی اسے بند کر دیا۔ توبہ ہے اب کیسے گانے آ رہے ہیں جن کی نہ کوئی شاعری ہوتی ہے نہ سُر..... میں نے اس کے بعد دوسری سی ڈی آزمانے کا خیال ترک کر دیا اور اُٹھ کر پیکنگ کرنے لگی۔

❀❀❀

گھر واپس آئے تو وہاں عید کا سا سماں تھا۔ اماں جان نے دوپہر کے کھانے پر اپنے سب بچوں کو اکٹھا کر رکھا تھا۔ ائیر پورٹ پر بڑے بھائی جان خود ہمیں لینے آئے ہوئے تھے اور بڑی گرمجوشی سے احمد کو گلے سے لگاتے ہوئے بولے تھے۔

''یار! تم نے تو ایک ہی ہفتے میں گھر کو سُونا کر دیا تھا۔ ہم سب تو اُداس ہو گئے تھے۔

''جی! بھائی جان ہم لوگ بھی اُداس ہو گئے تھے اِسی لیے تو واپس جلدی آ گئے۔'' احمد نے میری طرف دیکھتے ہوئے ہم کا صیغہ استعمال کیا جیسے اسے ادا کرتے وقت مجھ سے اجازت طلب کر رہے ہوں۔

''واہ میاں۔ ایک ہفتہ گزار کر آ رہے ہو اور کہتے ہو کہ جلدی آ گئے ہو۔'' بھائی جان نے ازراہِ مذاق سے اور کچھ مان محبت سے احمد کو کہا۔

وہ دونوں بھائی راستہ بھر باتیں کرتے رہے اور میں انہیں دیکھتی رہی۔ گھر آئے تو اماں جان نے احمد سے بھی پہلے مجھے گلے سے لگایا اور میری پیشانی کو چومتی ہوئی بولیں۔

''میرے گھر کی تو رونق اب آئی ہے..... میں تو اُداس ہو گئی تھی۔'' اُن کے انداز میں سچ اور پیار صاف جھلک رہا تھا اِس لیے میں پھر اُن کی گرویدہ ہو گئی۔

''جی اماں جان ہم بھی اُداس ہو گئے تھے آپ کے بغیر.....'' بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا جس پر انہوں نے دوبارہ سے میری پیشانی کو چوم لیا۔

''اور اماں جان میں۔ کیا میں یاد نہیں آیا.....؟'' احمد نے ہم ساس بہو کو لپٹا دیکھ کر مداخلت کی جس پر سب ہنس دیئے۔

''میرا بچہ۔ میری جان..... تُو تو میرا کاکا ہے۔ کاکا.....'' انہوں نے احمد کے لیے اپنی بانہیں وَا کر دیں جس میں احمد ایک چھوٹے بچے کی طرح جا سمائے۔ احمد اپنی ماں کے سینے سے لگے تو میرا سینہ بھی نہ جانے کیوں ہُمک اٹھا۔ میری بانہیں نادانستہ ہی وَا ہو گئیں اور میری خالی نظریں اِدھر اُدھر بھٹکنے لگیں۔ اتنے میں عمید بھاگتا ہوا اور ''چھوٹے بابا آ گئے، چھوٹے بابا آ گئے'' کہتا ہوا آ کر احمد کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

''او میرا شہزادہ آ گیا..... میرا جگر آ گیا.....'' احمد نے لپک کر اُسے اُٹھایا اور اپنے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ میری خالی نگاہیں اُن دونوں پر جم گئیں اور میری وَا ہوئی بانہیں ڈھیلی ہو کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خود میرے ہی گرد حائل ہو گئیں۔

❀❀❀

ہمیں کراچی سے آئے کوئی چھ ماہ کا عرصہ گزر گیا تھا۔ اِس چھ ماہ میں احمد بے حد اُداس رہے اور قدرے خاموش بھی۔ جبکہ میں بہت زیادہ باتیں کرنے لگی تھی اور ہنستی بھی خوب تھی۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ گنگناتی رہتی۔ میں نے پھر سے اپنی ایک میوزک لائبریری بنالی تھی۔ بے حد جدید قسم کے ساؤنڈ سسٹمز اکٹھے کر لیے تھے۔ میرے پاس کلاسیکل، پاپ، راک اینڈ رول کے علاوہ پاک و ہند کے معروف گلوکاروں اور گلوکاراؤں کے بے شمار البمز اور طربیہ البم تھے اور اِس کے ساتھ ساتھ غزلوں کے بہترین انتخاب بھی۔ مجھے لگتا تھا موسیقی نے میری بے چینی اور بے کلی کو سکون اور سرور میں بدل دیا تھا۔ میری تنہائی کو بڑا سہارا مل گیا تھا۔ اب میں ذہنی کشمکش اور ذہنی دباؤ یا تناؤ کا شکار نہیں ہوتی تھی بلکہ اکثر میں احمد کو بھی چھیڑتی.....

''احمد! آپ کیا ہر وقت اُداسی کی شکل بنائے رہتے ہیں۔ جو ہونا تھا ہو گیا..... چھوڑیں دفع کریں اور زندگی سے لطف اندوز ہوں۔ زندگی! جو ساز ہے سُر ہے گیت ہے۔ زندگی جو ایک ہی بار ملتی ہے۔ کیا ہم اِسے ایک چھوٹی سی چیز کے نہ ملنے پر یوں اُداس رہ کر ضائع کر دیں؟ آئیں احمد! باہر چلتے ہیں۔ ایک لمبی ڈرائیو پر۔ جہاں ہوا ہو، سبزہ ہو..... اور گیت ہوں.....''

وہ میری طرف کھوئی کھوئی سی نظروں سے دیکھتے اور اِک آہ بھرتے۔ ''زندگی میں کمی؟ بظاہر تو میری زندگی میں کوئی کمی نہیں۔ مگر میں اس کے خالی پن سے اُداس ہوں۔ تمہارے لیے زندگی گیت ہے..... اور میں..... میں اس کے سناٹے میں ایک کلکاری، ایک معصوم سی ہنسی اور چھوٹی چھوٹی شرارتوں کو ترس رہا ہوں، اور یہ کمی اتنی بھی چھوٹی نہیں ہے جسے میں یوں نظر انداز کر دوں کہ دفع ہی کر دوں۔''

ایک دن انہوں نے اِتنے سپاٹ اور اُداس لہجے میں مجھے جواب دیا کہ میں لمحہ بھر کو تو پریشانی سے چکرا کر ہی رہ گئی۔ مجھے لگا احمد کے اندر کا سناٹا انگڑائی لے رہا ہو اور اُن کے چہرے پر دراڑیں نمودار ہو رہی ہوں۔ اُس وقت مجھے خوف سے جھرجھری آ گئی۔ اُس خوف سے جو میرے اندر بُکل مارے بیٹھا تھا اور وقتاً فوقتاً اپنا سایہ میرے دل و دماغ پر بڑھاتا رہتا تھا۔ پھر اس کے بعد میں نے کبھی احمد سے یہ نہ کہا تھا کہ آپ اُداس کیوں رہتے ہیں یا کچھ بھی اور.....

البتہ باہر جاتے ہوئے میں اُنہیں لازمی بڑے ہی پیار اور اخلاق سے پوچھ لیا کرتی تھی۔

''احمد! میں فلاں جگہ جا رہی ہوں آپ بھی میرے ساتھ چلیں گے.....؟'' یا پھر خود میں فرمائش کر ڈالتی..... احمد! آج تو میرا جی چاہ رہا ہے فلاں جگہ چلیں وہاں کھانا کھائیں۔ وغیرہ وغیرہ..... اور وہ میرا کہا کبھی نہ ٹالتے تھے فوراً ہی میرے ساتھ چل پڑتے۔ اگرچہ احمد کے مزاج میں خاصی سنجیدگی اور خاموشی آ چکی تھی مگر وہ میرا خیال پہلے سے بھی زیادہ رکھنے لگے تھے یہاں تک کہ انہوں نے مجھے خود کہہ دیا تھا۔

''آئمہ! تم میں بہت قابلیت ہے اگر تم کوئی جاب یا اپنا بزنس کرنا چاہو تو کر سکتی ہو۔''

اُس روز تو میں احمد کی یہ بات سن کر حیران ہی ہو گئی کہ کہاں وہ عورتوں کی نوکری کے اتنے خلاف تھے کہ اس موضوع پر بات تک کرنا پسند نہیں کرتے تھے اور کہاں مجھے خوشی سے اِجازت بھی دے رہے تھے اور اس سلسلے میں میری ہر طرح سے مدد کرنے کو بھی تیار تھے۔

''احمد! یہ آپ کہہ رہے ہیں؟'' مجھے یقین ہی نہ آ رہا تھا۔

''یہ میں ہی کہہ رہا ہوں۔'' وہ بولے۔ ''ایسا کرو کوئی بوتیک وغیرہ بنا لو۔ بڑی بڑی نمائشیں لگاؤ دوسرے ممالک میں جاؤ۔ تمہارا امپورٹ ایکسپورٹ کا ویزا وہ بھی For ever میں لگوا دوں گا۔ یوں۔ منٹوں میں.....'' انہوں نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

''بوتیک.....! نہیں۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ بوتیک میں میری دلچسپی صرف خریداری تک ہی محدود تھی۔ ویسے بھی ذمہ داری والے کام تو مجھے ہمیشہ سے جھنجھٹ ہی لگتے تھے۔

''تو پھر جاب کر لو..... بلکہ چھوڑو جاب کو اس بار الیکشن کی تیاری کرو اور سیدھی سیدھی اسمبلی کی ممبر بنو..... عورتوں کے حقوق پر سیاست کرو اور انجوائے کرو..... جیسے ہمارے ملک کی ممبرانِ صوبائی و قومی اسمبلی کیا کرتی ہیں۔'' وہ بڑے خوشگوار مگر سنجیدہ موڈ میں تھے۔

''میں اور سیاست.....؟ توبہ کریں احمد آپ کو کیا ہو گیا ہے۔'' میں نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

کیوں سیاست کون سا مشکل کام ہے یا اس کے لیے کسی قسم کی خاص تعلیم و تربیت کی ضرورت ہوتی ہے؟'' وہ ہنستے ہوئے بولے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''آپ کا مطلب ہے جو کام اس ملک کا نالائق ترین بندہ کرسکتا ہے وہ مجھے کر لینا چاہیے۔'' میں ذرا بُرا مناتے ہوئے بولی۔ ''اور پھر آپ تو جانتے ہیں مجھے چاپلوسی کرنا اور کروانا دونوں ہی سے نفرت ہے۔''

''تو پھر تم کیا کرنا چاہتی ہو.....؟'' وہ سیدھے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے۔

''میں نے آپ سے کب کہا کہ مجھے کچھ کرنا ہے؟'' میں نے بڑے اعتماد سے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جس پر وہ جانے کیوں گڑبڑا گئے اور مجھ سے نظریں چُرا گئے۔ عجیب بات تھی پہلے میں اُن سے نظریں چُرایا کرتی تھی۔ اُن میں بلا کا اعتماد تھا اب وہ مجھ سے کترا جاتے تھے گھبرا کر نظریں چُرا جاتے تھے۔ اُن کی آنکھوں میں اب اعتماد کی جگہ کمپلیکس جھلکتا رہتا تھا۔

اس کا جواب میں اچھی طرح سے جانتی تو تھی مگر جاننا نہ چاہتی تھی۔ جاب یا پھر کوئی بزنس کرنے کے خیال سے میرا جی احمد کے ساتھ متفق نہ ہوا۔ البتہ میں نے دوبارہ سے اپنی مصروفیات میں حقوقِ نسواں کے لیے جدوجہد کو شامل کرلیا۔

❁❁❁

''احمد!'' میں نے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے کھڑے انہیں پکارا۔ اس وقت میں اپنے چہرے کی کلینزنگ کر رہی تھی۔

''ہوں.....'' انہوں نے ٹی وی پر نظریں جمائے جمائے کہا۔ وہ اِس وقت کرکٹ میچ دیکھنے میں منہمک تھے۔

''آپ کو پتہ ہے ''منی بیگم'' آئی ہوئی ہے۔'' میں نے اطلاع دیتے ہوئے کہا۔

''اچھا؟'' اپنی پسندیدہ گلوکارہ کا نام سن کر احمد نے ٹی وی پر سے نظریں ہٹالیں۔

''کیا ٹی وی پر اُس کا کوئی خاص پروگرام آرہا ہے۔'' احمد کی توجہ اب کرکٹ میچ سے ہٹ کر میری طرف تھی بلکہ منی بیگم کے ذکر کی طرف تھی۔

''ٹی وی پر بھی اُس کے مختلف شوز آرہے ہیں مگر آپ کے لیے خوشی کی خبر یہ ہے کہ ہم نے اپنے کلب کی طرف سے ایک شامِ غزل منانے کا پروگرام بنایا ہے۔'' میں بھی اُن کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

''شامِ غزل'' احمد خوش ہوگئے۔ ''کب؟'' اُن کی دلچسپی بڑھ چکی تھی۔

''پیر کی شام چھ بجے.....اور یہ رہا آپ کا دعوت نامہ.....'' میں نے اپنے بیگ میں سے ایک سنہری حروف والا کارڈ نکال کر انہیں تھما دیا جسے دیکھ کر وہ مسکرا دیئے۔

''یہ تو ایک اچھا فنکشن ہوگا تمہارے کلب کی طرف سے.....''

''اور اِس لحاظ سے اور بھی اچھا کہ اتنی گرمی اور حبس کے موسم میں ہم نے اِسے شہر کے سب سے خوبصورت اور بہترین ایئر کنڈیشنڈ ہال میں رکھا ہے۔'' میں نے ذرا اِتراتے ہوئے بتایا۔

''اتنی بڑی فنکارہ کے اعزاز میں اتنا تو ہونا ہی چاہیے تھا۔''

''اور جناب آپ کی اطلاع میں ایک اور اضافے کے لیے عرض ہے کہ اس شام کی شان بڑھانے کے لیے گورنر صاحب تشریف لا رہے ہیں۔'' میں نے اور زیادہ اِترا کر بلکہ اِٹھلا کر کہا۔

''یعنی ایک میان میں دو تلواریں۔ کہیں مصیبت نہ پڑ جائے تمہیں۔'' احمد نے ذرا سنجیدہ شکل بنائی۔

''دو کون.....؟'' میں پریشان ہوگئی۔

''بھئی ایک آپ کے صوبائی گورنر صاحب اور دوسرے آپ کے ہوم منسٹر صاحب.....'' انہوں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''احمد! آپ بھی ناں!''

ہم دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ بہت دنوں کے بعد ایک خوشی کا ترنم سنائی دیا۔ بہت دنوں کے بعد ہم دونوں نے اک دُوجے کو غور سے دیکھا۔ بہت دنوں کے بعد ہمارے دل ایک ہی لَے پر دھڑکے.....اور بہت دنوں کے بعد ہمیں لگا کہ ہم اک دوسرے کے وجود کا حصہ ہیں۔

❁❁❁

وقت جیسے جیسے گزرتا جا رہا تھا میں اور احمد اِک دوسرے سے دُور ہوتے جا رہے تھے۔ بظاہر نہیں، بلکہ میرے احساسات پر اکیلا پن چھاتا جا رہا تھا۔ احمد جس قدر نرمی، محبت اور خیال

والا رویہ رکھتے میرے اندر اُن کے لیے اتنا ہی منفی احساس پیدا ہوتا اور مجھے لگتا یہ سب مصنوعی پن ہے، احمد یہ سب جان بوجھ کر سوچ کر کرتے ہیں۔ اگر محبت میں دانستگی دکھائی دینے لگے تو اس کے معنی مشکوک ہونے لگتے ہیں۔ محبت کے بارے میں میرا فلسفہ ''کرنے'' کا نہیں بلکہ ''ہونے'' کا تھا۔ مجھے محبت میں اظہار کے لیے لفاظی سے نفرت تھی۔ محبت تو محسوس ہوا کرتی ہے۔ اِسے دیکھا نہیں جا سکتا..... چھوا بھی نہیں جا سکتا۔ البتہ جب یہ دلوں کو چھوتی ہے تو لہو میں حرارتوں کی طرح پھیل جاتی ہے۔ دھڑکنوں کی لَے بن جاتی ہے۔ دماغ پر چھا جاتی ہے۔ روح کو شانت کرتی ہے۔ یہ انسانی جبلت کی خودسری اور سرکشی کو اپنے قابو میں کر لیتی ہے اور زندگی کے ہونے کی شرط بن جاتی ہے۔ میں اپنے اندر بہت بڑا خلا محسوس کر رہی تھی۔ مگر احمد.....! احمد غافل سے ہوتے جا رہے تھے۔ ہم اک دوسرے کے ساتھ رہ کر بھی کوسوں کے فاصلے پر تھے اور اس بات نے مجھے ڈپریشن کا شکار بنا دیا تھا..... میں خود اپنے منہ سے کچھ بھی نہ کہہ سکتی کہ ایک عورت تھی۔ عورت جسے قدرت نے خودداری وصف کی تھی۔ جو کسی کے لیے تو ٹوٹ کر ریزہ ریزہ بھی ہو سکتی تھی۔ اپنی اَنا اور خودی کو مٹی بھی کر سکتی تھی مگر اپنے لیے..... وہ بھی محبت کے معاملے میں، مانگنا اور بتانا، کہہ کر لینا..... یہ محبت کا انداز نہیں ہوتا۔ میں..... آئمہ احمد حسن، جتنی بھی ماڈرن، بولڈ اور منہ پھٹ سہی، مگر میں احمد سے محبت کرتی تھی۔ بے حد محبت..... یہ میرا دعویٰ تھا، اور احمد بھی مجھ سے محبت کرتے تھے یہ میرا غرور تھا۔ میں نے خود کو اس کی ضرورت بنا دیا تھا۔ میں نے احمد کو اتنی محبت دی تھی کہ وہ میرا محتاج ہو کر رہ گیا تھا۔ یہی میرا نظریۂ محبت تھا۔ اپنے لیے ایک کامیاب عورت اور خوش بخت بیوی کے لیے۔ میرا یہ یقین تھا کہ اگر عورت کو مرد پر حکومت کرنی ہے تو وہ اس کا دل اپنی مٹھی میں کس لے۔ اُسے باور کرا دے کہ وہی دنیا میں ایک ایسی عورت ہے جو اسے حقیقت میں چاہتی ہے..... اور وہ ہی وہ عورت ہے جس کی محبت کے بغیر اس کا زندہ رہنا محال ہے۔ یہی میں نے کیا تھا۔ احمد کو میں نے اِسی طرح سے اپنا کیا تھا، اور اِسی نظریے کی طاقت پر میں احمد کے دل و دماغ پر حکومت کر رہی تھی۔ مگر میں یہ بھول گئی تھی کہ محبت بھی تو ایک عمل ہے اور یہ بھی تو مکافاتِ عمل رکھتی ہے۔ کل تک میں احمد کو قابو کرنے کے گُر اپناتی رہی اور بھول گئی کہ میں بھی تو احمد کی گرفت میں ہوں، اور آج مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ احمد کی توجہ سے زیادہ احمد کی محبت میری طلب ہے۔ وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طلب جس کی آبیاری سے میرے دل کو نمو ملتی تھی۔ جو میری زندگی کو سینچ رہی تھی۔

آج کی شامِ غزل کے ماحول نے میرے اِس احساس کو اور بھی ہوا دے دی تھی۔ منی بیگم کی پُرسوز آواز اور ایک سے بڑھ کر ایک غزل۔ اِک سماں سا بندھ گیا تھا۔ لوگ بے خودی سے جھوم رہے تھے۔ اِک سرور اک خمار کی کیفیت تھی۔ احمد بھی اس محفل سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہے تھے اور اپنی پسندیدہ فنکارہ کو خوب داد دے رہے تھے۔ جبکہ ہر غزل کا ہر شعر میرے اندر عجب بے قراری اور بے چینی پیدا کر رہا تھا۔ قربت اور فرقت کے احساسات میں اک شدت تھی جو میرے جی کو چیرتی جا رہی تھی۔ ہم دونوں دریا کے کناروں کی مانند ساتھ ساتھ تھے اور بیچ میں حالات کا دریا رواں دواں تھا۔ ماحول بڑا ہی کلاسیکل تھا۔ بڑا ہی پُراثر مگر افسردہ۔ ہر چہرے پر بظاہر مسکراہٹ تھی مگر مغنیہ کی آواز کا درد اور شاعری کا فسوں دلوں کو اُداس کیے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں شاعری اور موسیقی کے ملاپ سے وجود پانے والے نغمے خواہ وہ المیہ ہوں یا طربیہ۔ ٹھمری ہو یا غزل۔ وہ اتنے سحر انگیز کیوں ہو جاتے ہیں۔ مجھے خود یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ موسیقی میرے لیے اِک نشے کی حیثیت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ میں کلاسیکل سنتی تو میرا سَر خود بخود ہلنے لگتا، اور میرے روم روم میں اس کا جادو سرسرانے لگتا..... اِک نشے کا لطف مجھ پر چھانے لگتا۔ اِس وقت بھی میری یہی کیفیت تھی۔ میں اک سحر میں گرفتار تھی۔ میرے وجود کا انگ انگ موسیقی میں گم تھا۔ گنگنا رہا تھا۔ مگر اِس کے ساتھ ساتھ میرے اعضاء پر اک بے قراری اور بے چینی طاری تھی۔ وہ پھر بھی ٹوٹ رہے تھے۔ شاید اُن کی طلب اِس وقت کی رسد سے کہیں زیادہ تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میرے قویٰ معطل ہو رہے ہیں اور میری طلب، میری پیاس نے میرا احاطہ کر لیا تھا۔ یہاں تک کہ باہر کے ہلکے پھلکے اور خمار آلود ماحول میں بجتی دھیمی دھیمی ہارمونیم کی آواز اور گلوکارہ کے گلے کا ترنم سب بدل گئے، اور میرے اردگرد صرف شور رہ گیا۔ میری سوچیں میری دھڑکنیں۔ میرا دل میری روح۔ سب کی تشنگی بڑھ گئی۔

''احمد!.....'' میں نے نادانستگی میں احمد کو بلند آواز سے پکارا۔

''کیا ہوا..... کیا ہوا.....؟'' احمد کے ساتھ ساتھ کئی اور آوازیں اردگرد سے اُبھریں۔

''احمد! گھر چلیں'' میں نے خفیف ہو کر دھیمی آواز میں کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ابھی سے..... ابھی تو پروگرام شروع ہوا ہے۔'' احمد کو میری اس بات پر کچھ حیرت ہوئی اور شاید انہیں بُرا بھی لگ رہا تھا۔ ''کیوں خیر تو ہے؟'' وہ سرگوشی کے انداز میں مجھ سے پوچھ رہے تھے تاکہ اردگرد کے لوگ ڈسٹرب نہ ہوں۔

''احمد! پلیز گھر چلیں میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔'' میں نے منت کرتے ہوئے کہا کیونکہ سچ مچ ہی میری طبیعت خراب ہو رہی تھی۔

''اچھا چلو۔ لیکن ابھی تو محفل کا لطف آنے لگا تھا۔'' وہ ذرا بے دلی سے بولے۔

''اچھا میں چلی جاتی ہوں آپ بعد میں آجایئے گا.....'' میں نے اُنہیں دل سے وہاں رہنے کی اجازت دیتے ہوئے کہا مگر وہ اُٹھ ہی گئے یہ کہتے ہوئے کہ..... ''جب تم نہیں ٹھہر رہیں تو میں تنہا کیا کروں گا.....''

وہ مجھے لے کر وہاں سے چل تو پڑے مگر اُن کا موڈ راستے بھر میں اچھا نہ رہا۔ میں بھی شرمندگی سے بیٹھی رہی گھر واپس آکر وہ تو فوراً ہی بستر پر لیٹ گئے، انہوں نے کپڑے بھی تبدیل نہ کیے تھے۔ جبکہ میں بہت دیر تک ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی رہی۔ بظاہر تو میں اپنی جیولری وغیرہ اُتار رہی تھی مگر میری تمام تر توجہ احمد کی طرف مبذول تھی۔

''احمد!.....'' میں نے ڈرتے ڈرتے انہیں پکارا۔ مگر وہ چپ رہے۔ میں نے دوبارہ پکارا۔

''احمد!''

''ہوں.....'' وہ آنکھوں پر ہاتھ دھرے دھرے بولے۔

''کافی پئیں گے۔ بنا لاؤں.....'' میں اُن کا موڈ بہتر کرنے کے لیے اُن کے ساتھ بیٹھنا چاہتی تھی۔

''نہیں مجھے نیند آرہی ہے۔'' وہ بدستور اسی انداز میں بولے۔

''اچھا تو پھر دودھ لے آؤں۔ آپ نے تو کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھایا تھا۔''

''مجھے بالکل بھی بھوک نہیں ہے۔ بس تم یہ کردو کہ کمرے کی روشنی ہلکی کردو۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔''

''احمد! پلیز کپڑے تو تبدیل کرلیں.....'' میں روہانسی ہوگئی۔

''ابھی میں کچھ دیر بعد اُٹھوں گا باتھ روم جانے کو..... تب تبدیل کرلوں گا.....'' انہوں نے سپاٹ سا جواب دیا۔ میں نے پھر اُن سے کوئی سوال کیا نہ بات۔ لائٹ بند کر کے لیمپ روشن کیا اور خود باتھ روم میں گھس گئی۔ فل شاور کھولا اور دیر تک نہاتی رہی۔ میں فریش ہونا چاہتی تھی مگر جب باتھ روم سے نکلی تو میرے دل و دماغ پہلے سے بھی بوجھل تھے۔ میرا ریشمی پھول جیسا شب خوابی کا لباس بھی کانٹوں کی جھاڑی بنا ہوا تھا۔ میرے سر میں بھی درد تھا اور نیند..... وہ تو میری آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ میں بڑی آہستگی سے آکر بیڈ کی ایک طرف ٹک گئی۔ احمد کروٹ بدلے سو رہے تھے یا سونے کی ایکٹنگ کر رہے تھے۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں انہیں جھنجھوڑ ڈالوں اور کہوں۔

''احمد! مجھ سے باتیں کرو..... دیکھو یوں کروٹ بدل کر مجھ سے بے اعتنائی نہ برتو۔ میرا دل اُداس ہے اُٹھو میری دلجوئی کرو..... میری آنکھوں میں نیند نہیں ہے تم بھی مت سوؤ..... اُٹھو ہم مل کر بیٹھتے ہیں اور آج کی شب اک دوسرے سے حالِ دل کہتے بتا دیتے ہیں۔ اُٹھو احمد! میری سنو اور اپنی کہو..... جیسے تم پہلے کیا کرتے تھے۔ اتنے کٹھور اور بے حس مت بنو۔ تمہاری خاموشی سے میرا دم گھٹتا ہے۔ کچھ بولو.....''

مگر میں کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ چپ چاپ خود بھی کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔ میری آنکھیں بھیگ گئیں اور میرے اندر کا خالی پن اور بھی گہرا ہوگیا۔ بالکل اس اندھے کنویں کی مانند جس کی گہرائی زمین کی آخری حدوں کو بھی جا پہنچے، تب بھی ایک بوند پانی اس کی سطح سے نہ نکلے..... بنجر اور بیکار.....!

❁❁❁

ہمیں کراچی سے واپس آئے تقریباً ڈیڑھ برس بیت چکا تھا۔ بیتے ہوئے ڈیڑھ برس میں بظاہر تو سب کچھ ٹھیک ہی رہا تھا۔ کوئی خاص واقعہ ایسا پیش نہ آیا تھا جس کی وجہ سے میری زندگی میں کچھ تبدیلی ایسی ہوئی ہو جو میرے لیے باعثِ آزار ہو یا جس نے میرے رَچائے ہوئے اس ڈرامے میں کچھ گڑبڑ کی ہو۔ بلکہ اب تو میں خود بھی اپنے لکھے ہوئے جھوٹ کے پلاٹ کا اِک اہم کردار بن چکی تھی اور میں نے اس جھوٹ کو اپنے اُوپر بھی اس طرح سے طاری کرلیا تھا کہ مجھے خود یہی سب سچ لگنے لگا تھا۔ میں نے خود کو آہستہ آہستہ یہ باور بھی کرالیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا کہ اب ہمارے ہاں اولاد ممکن نہیں اور اس ناممکن حالت کی ذمہ دار میں تنہا نہیں۔ احمد بھی ہیں، اور احمد! وہ تو بے چارے سو فیصدی یہ حقیقت تسلیم کر چکے تھے کہ وہ تنہا ہی قصوروار ہیں۔ تبھی تو وہ پچھلے ڈیڑھ دو برس سے میرے ممنون اور مشکور نظر آنے لگے تھے۔ مجھ سے اُن کی محبت میں پہلے جو شدت اور طلب ہوا کرتی تھی اب اس کی جگہ صبر اور شکر نے لے لی تھی۔

انسانی فطرت اور جبلت میں صبر اور شکر کی عادت عام طور پر بہت ہی کم وجود رکھتی ہے۔ اسے اپنانے کے لیے تو بڑی جدوجہد اور تزکیے کی ضرورت ہوتی ہے۔ خاص طور پر مردوں کے لیے اپنے ازدواجی حقوق سے صرفِ نظر کرتے ہوئے محض بیوی سے محبت پر اکتفا کر لینا۔ ایسا اگر کوئی شوہر کرنے لگے تو اُس کی دو ہی وجوہات ہو سکتی ہیں۔

اُس کا کوئی احساسِ محرومی۔

یا پھر رہبانیت کی طرف میلان۔

احمد نے میرے اور اپنے درمیان اس باب کو آہستہ آہستہ بند کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ یقیناً رہبانیت کی طرف مائل نہیں تھے۔ یہ احساسِ محرومی ہی تھا جو اُن کے دل و دماغ پر غالب آتا جا رہا تھا اور جس کے زیرِ اثر انہوں نے اپنے حقوق و فرائض پر صبر کرنا شروع کر دیا تھا اور اپنے اور میرے درمیان محض محبت کے تعلق پر قناعت کر لی تھی۔ کراچی سے واپسی کے دنوں میں اُن کی کیفیات میں جو بے چینی اور بے کلی تھی اب اسے سکون و قرار میسر آ رہا تھا۔ جبکہ میں، میری حالت اِن سے یکسر مختلف ہو گئی تھی۔ اگر وہ قانع دکھائی دیتے تھے تو میں حریص ہو رہی تھی۔

انہوں نے اولاد کی خواہش کو اپنے اندر دبا لیا تھا۔ مگر میں.....!! میرے اندر تو اس خواہش نے اپنی جڑیں اور گہری کر لی تھیں جس کی شاخیں امربیل کی طرح میری رگ و پے میں سرایت کرتی جا رہی تھیں۔

احمد نے اپنی جائے پناہ ٹی وی سکرین اور کتابوں میں ڈھونڈ لی تھی جبکہ میں بے قراری اور تشنگی کے بے آب و گیاہ صحرا میں ماری ماری پھر رہی تھی..... کبھی موسیقی تو کبھی یوگا.....

کبھی انسانی حقوق کی علمبرداری..... حقوقِ نسواں کی سربلندی کے نعرے۔

کبھی سیر سپاٹے..... شاپنگ..... بیرونِ ملک مختلف میلوں ٹھیلوں میں شرکت۔ اپنی سرزمین اور پاکستانی عورت کی ترقی کی نمائش کے لیے تہذیب و ثقافت کے نام پر بہت کچھ۔

میں نے خود کو بہت مصروف کر لیا تھا اور بہت نام بھی کما لیا تھا۔ میرے گرد میرے چاہنے والوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ میرے ڈرائنگ روم میں میری صلاحیتوں کے اعتراف میں ملنے والے ایوارڈ اور میڈل رکھنے کی جگہ بھی تنگ پڑتی جا رہی تھی..... اور اِس سارے پر احمد کو بھی اب کوئی اعتراض نہ تھا وہ تو خود میرے فین اور ویل وِشر تھے۔

مگر میں پھر بھی خوش نہ تھی..... مطمئن نہ تھی۔ تنہائی کا احساس اس قدر ہجوم کے باوجود میرے اندر پھانس بن کر اُتر چکا تھا۔ اور نیند..... وہ تو میری دسترس سے کب کی نکل چکی تھی جبکہ احمد کو اب خراٹے لینے کی عادت پڑ چکی تھی۔ اور آج..... آج تو میری حالت بے جل کی مچھلی کی مانند ہو چکی تھی۔ میرے اعصاب شدید تھکن کا شکار تھے مگر مجھے آرام نصیب نہ تھا۔ احمد ٹی وی پر پاکستان اور انڈیا کے مابین ہونے والا ون ڈے کرکٹ میچ دیکھ کر کب کے سو چکے تھے۔ میں بھی کچھ دیر اُن کے ساتھ یہ میچ دیکھتی رہی تھی۔ وہ میچ دیکھتے ہوئے کس قدر جوشیلے اور جذباتی ہو رہے تھے اُس وقت ان کے اندر پاکستان کی جیت کی خواہش اپنی پوری شدت سے موجزن تھی جس کے اک اک اُتار چڑھاؤ کی تصویر اُن کے تاثرات اور حرکات سے عیاں تھی۔ ہم ابھی کچھ دیر قبل ہی تو احمد کی کزن کی شادی سے واپس لوٹے تھے جس پر میں بے حد اہتمام سے تیار ہو کر گئی تھی۔ میں آئمہ احمد حسن۔ جو آج معمول سے زیادہ بلکہ کہیں زیادہ حسین اور دلکش دکھائی دے رہی تھی۔ جسے تیار دیکھ کر احمد کی آنکھوں میں یکبارگی بڑی چمک پیدا ہوئی تھی اور جو گرمجوشی سے میری طرف بڑھے اور بہت دنوں کے بعد میرے ہاتھ تھام کر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بڑے جذب کے عالم میں بولے تھے۔

''آئمہ! آج تم بے حد خوبصورت لگ رہی ہو۔'' تب اُن کی آواز میں وہی پہلے والی وارفتگی تھی۔

''سچ'' بہت دنوں کے بعد میں نے حیا کے بوجھ سے اپنی پلکوں کو جھکا محسوس کیا تھا۔

''ہاں بالکل سچ!''

تبھی باہر اماں جان کے گلا کھنکارنے کی آواز اور اُن کی پکار سنائی دی تھی۔ ''بھئی احمد جلدی کرو..... دیر ہو رہی ہے۔''

اور پھر احمد کے ہاتھوں سے میرے ہاتھ تو فوراً ہی چھوٹ گئے مگر میرا دل اُسی درجہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حرارت پر دیر تک دھڑکتا رہا۔ یہاں تک میرا بلڈ پریشر بڑھ کر میرے سر درد تک آ گیا۔

اور پھر وہاں پنڈال میں مختلف خواتین کا میری طرف خفیف سے اشارے کر کر کے سرگوشیاں کرنا..... ''لگتا ہے احمد کی بیوی بانجھ ہے۔''

''ہائے کتنی حسین ہے مگر بے اولاد ہے۔''

''اے ہے کیا فائدہ ایسی بیل کا جس کے صرف پتے خوبصورت ہوں مگر اس پر پھول نہ کھلتے ہوں.....''

ان سب خواتین کی کاٹ دار باتوں کی تکلیف ابھی میرے دل پر ہی تھی جب نادرہ آنٹی (احمد کی پھپھو) کے سوالات نے مجھے اور بھی پریشان اور احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیا۔

اس شادی سے واپس آ کر میں کتنی دیر تک ڈپریسڈ رہی تھی۔ احمد کے ساتھ آج میری آنٹی نادرہ کے رویے پر خاصی بحث بھی ہو گئی تھی جسے احمد نے تو سرسری سا لیا اور وہ پاکستان کے میچ جیت لینے پر بڑے خوش اور مطمئن ہو کر یہ کہتے ہوئے سو بھی گئے کہ ''آئمہ ڈارلنگ! اب تم بھی سو جاؤ۔ بہت دیر ہو گئی۔ ویسے بھی آج ہم بہت تھک گئے۔ اب اس موضوع پر کچھ مت سوچو.....''

''کچھ مت سوچو..... ہونہہ کیسے مت سوچوں۔ اِس موضوع نے تو میری خوشیوں کو گھن لگا دیا ہے.....''

میری ذات کے وہ پَر جھڑنے لگے تھے جن کے بَل پر میں بڑی بڑی اُڑانیں بھرا کرتی تھی۔

میری شخصیت پر چڑھے ہوئے ناز اور تکبر کے پرت ہٹنے لگے تھے۔ میری اَنا اور خودی کے خول کو دیمک چاٹنے لگی تھی۔ جس کے اندر نیچے بہت قریب ہی میرا اصل کسمسانے لگا تھا۔ آئمہ احمد حسن کی حقیقت نظر آنے لگی تھی جس میں قوتِ برداشت کی کمی کے ساتھ ساتھ رنگوں اور خوشبو کی بھی بے حد کمی تھی۔

اِس رنگ کی کمی جس کی آمیزش کے بغیر ایک عورت کے خمیر میں کچھ کشش کچھ دلکشی پیدا نہیں ہو سکتی۔ وفا شعاری کا بنیادی رنگ۔ جس کی قلموں میں ایثار اور حسن سلوک کے بڑے ہی دلکش اُودے، نیلے اور نارنجی رنگ چھپے ہوتے ہیں..... جس کے ہونے سے زندگی

نمو پاتی ہے..... وہ خوشبو۔ جس کے بغیر عورت کے وجود کی شناخت ناممکن ہوتی ہے۔ ''محبت'' کی خوشبو۔ جس کے اخلاص سے زندگی کے سارے معاملات مہکتے ہیں..... رشتے تعمیر ہوتے ہیں۔ میں دیکھ رہی تھی میرے اصل میں ان دونوں کی کمی تھی۔ جس کی وجہ سے میں آہستہ آہستہ اپنے اندر اک بدنمائی اور خالی پن محسوس کرنے لگی تھی۔

اور میرے خمیر میں عورت پن کا ایک رنگ سب سے پھیکا تھا..... ممتا کا رنگ۔ جس کی کمی اب دوسروں کو بھی نظر آنے لگی تھی..... اور جسے چھپانا اب میرے اختیار سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔

میں کیا کروں؟

کس طرح یہ معاملہ حل ہو؟

میرے وجود کو یہ رنگ کیسے حاصل ہو؟

ماں کے معنی تو میرے وجود میں تخلیق پا رہے تھے۔

ممتا کے احساس سے ہم آہنگ مجھے ان معنوں نے کر دیا تھا مگر اِس کے مقام پر فائز ہونا میرے اختیار میں نہ تھا۔

یا..... یا پھر میں نے خود اِسے ناممکن بنا لیا تھا؟

کاش! اے کاش میں ایسا نہ کرتی!

میرے جذباتی پن اور جلد بازی نے مجھے کہیں کا نہ رکھا تھا۔

میں اپنی چالاکی کے جال میں خود پھنس گئی تھی جس پر حالات اب مزید گرہیں لگاتے جا رہے تھے۔

میں نے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سے اُٹھتے ہوئے ایک نظر احمد پر ڈالی جو سنبل کے نرم تکیے کو سینے سے لگائے بے خبر گہری نیند سو رہے تھے۔

میں نے غصے سے احمد کو دیکھا جنہوں نے خود کو اِس مصنوعی اور بے جان شے کا محتاج کر لیا تھا اور پھر اس پر مطمئن بھی ہو گئے تھے۔

''آئمہ احمد حسن!''

میرے دائیں پاؤں کے تلوے تلے کچھ کسمساہٹ سی ہوئی۔ میں نے بے اختیار ڈر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے پاؤں اُٹھا دیا اور بائیں پاؤں پر اپنا وزن برقرار نہ رکھ پانے کی بدولت گرتے گرتے بچی..... دوبارہ اسی سٹول پر بیٹھ کر میں نے اپنا پاؤں ٹٹولنا شروع کر دیا۔ اِک بے حد مہین سی پھانس میری اُنگلیوں سے ٹکرائی اور اک جھرجھری، اک سنسنی سی میرے دل کی سبھی شریانوں میں دوڑ گئی۔

''آئمہ احمد حسن!'' اُسی پھانس کو زبان مل گئی۔

میں نے ذرا غور سے سنا تو وہ آواز نادرہ آنٹی کی تھی جو اماں جان سے مخاطب تھی۔

''بھابی! آپ احمد کی دوسری شادی کا کیوں نہیں سوچتیں؟''

''دوسری شادی؟'' اماں نے چونک کر نادرہ آنٹی کی طرف دیکھا تھا۔

''ہاں دوسری شادی۔ اِس میں بھلا حرج ہی کیا ہے؟'' نادرہ آنٹی اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

''نہیں..... نہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے؟'' اماں کا انداز اُن کی رائے سے میل نہ کھا رہا تھا۔

''کیا تم احمد کا گھر سُونا اور اس کی زندگی اِسی طرح سے اُداس اور بے رنگ دیکھنا چاہتی ہو؟''

''نن..... نہیں۔'' اب اماں کچھ پریشان اور خوفزدہ نظر آئیں۔

''تو پھر تمہیں یہ کرنا چاہیے۔'' نادرہ آنٹی کی بات میں اصرار آ گیا تھا۔

''مگر نادرہ یہ آئمہ پر ظلم ہوگا۔ بھلا اس میں اس کا کیا قصور..... یہ تو اللہ کی مرضی ہے کہ دیر ہو رہی ہے۔''

اماں اب بھی میری طرفدار تھیں۔

''دیر ہو نہیں رہی۔ ہو چکی ہے۔ آٹھ برس کچھ کم تو نہیں ہوتے۔ اتنے عرصے میں تو ایک ننھے بیج میں سے نکلی کونپل بھی تناور ہو کر پھل دینے لگتی ہے۔ وہ تو پھر عورت ہے.....؟''

پھر انہوں نے اماں کو مزید پریشان ہو کر سوال نہ کرنے دیے۔ خود ہی دلیلیں دیتی رہیں یہاں تک کہ اماں جان کے کانپتے ہونٹوں سے نکل ہی گیا۔

''اچھا تم کہتی ہو تو میں کل احمد سے بات کروں گی۔''

''ہاں یہ تمہارا استحقاق ہے..... اور احمد کا حق۔ یہ حق قدرت نے احمد کو ودیعت کیا

ہے۔ وہ تو بغیر کسی معذرت کے دوسری شادی کر سکتا ہے یہاں تو اُس کے پاس بڑی جاندار وجہ ہے۔'' نادرہ آنٹی نے بالآخر اماں کو منا ہی لیا۔

''ہاں۔ یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو؟'' اماں میری جگہ پر کسی اور کا سوچنے لگیں۔

''نہیں..... ہرگز نہیں.....''

میں نے تڑپ کر اپنے پیر کو دبا لیا۔ جیسے میں اُس زبان والی پھانس کو مَسل دینا چاہتی ہوں۔ یہ پھانس..... جانے کہاں سے مجھے چبھ گئی تھی۔ بے حد عجیب پھانس تھی۔ چبھی تو پیر کے تلوے میں اور گردش میرے دل کی شریانوں میں کرتی تھی۔ رگڑتی..... اٹکتی..... دھڑکنوں کو رگیدتی۔ سانسوں کو بے ساختہ ''آہ'' بناتی۔ اتنی معمولی کہ دکھائی تو نہ دیتی تھی مگر محسوس بڑی اذیت کے ساتھ ہو رہی تھی۔ رات کے پچھلے پہر میں نرم و گداز گھاس پر چہل قدمی کرتے ہوئے چبھنے والی یہ پھانس میرے لیے ایک خوفناک معمّے کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ جو بولتی بھی تھی اور وہ باتیں کرتی تھی جو حقیقت میں ابھی ہوئی نہیں تھیں۔

نادرہ آنٹی اور اماں جان کے درمیان جو گفتگو اس پھانس کے ہونٹوں سے نکلی اور میں نے ابھی ابھی سنی تھی، وہ اُن کے درمیان درحقیقت ہوئی نہیں تھی مگر دونوں کی آوازیں میرے دل سے صاف سنائی دی تھیں۔ دونوں کے چہرے میری آنکھوں نے واضح دیکھے تھے۔

''یہ کیا ہے؟'' میرے اندر خوف بھر گیا۔

''محض میرا وہم.....؟'' میں نے بہت بہادر بن کر خود کو تسلی دی۔

''وہم نہیں..... وہم بولا تو نہیں کرتے۔ ان کی آواز تو نہیں ہوا کرتی وہ تو بس خیال سا ہوتے ہیں۔''

''تو پھر یہ کیا ہے؟'' میں نے پھر خود سے سوال کیا۔

''آسیب.....'' مجھے خوفناک جھرجھری آ گئی۔

''کیا میں آسیب زدہ ہو گئی ہوں.....؟ میرے اندر کوئی اوپری ہوا داخل ہو گئی ہے؟''

بس باقاعدہ تھر تھر کانپنے لگی۔

''احمد..... احمد.....'' میں نے اپنے پورے زور سے احمد کو پکارا۔ مگر میرے الفاظ بھی ہوا کی ٹھہرے۔ بے آواز اور ساکت۔ میں خود سے ڈر گئی اور زور زور سے رونے لگی۔ میں روتی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہی۔ بچاؤ..... مجھے بچاؤ کی چیخ و پکار مچاتی رہی۔ مگر بے آواز اور بے سُود۔ سامنے سوئے ہوئے احمد بے خبر سوتے رہے، اور میں اپنے تئیں ہاتھ بڑھا بڑھا کر انہیں جھنجھوڑتی رہی۔

❁❁❁

اگلے روز میری طبیعت اچھی نہ تھی۔ پورا جسم درد سے اَٹا ہوا تھا بخار کی کیفیت نے مجھے سُست بنا کر بستر سے اُٹھنے نہ دیا تھا۔ اک تھکن اور گہری اُداسی میرے اعصاب پر مسلط تھی۔ احمد مجھے بیمار دیکھ کر سخت پریشان تھے اور ڈاکٹر کو گھر بُلانے پر بار بار اصرار کر رہے تھے مگر میں اُنہیں منع کر رہی تھی۔

''کیا بات ہے مومی تم اس قدر ڈپریسڈ کیوں ہو؟'' وہ شاید میرے اُترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر میری اندرونی کیفیات کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔

''ڈپریسڈ..... نہیں تو.....'' میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ حالانکہ احمد کی اپنے لیے فکرمندی اور پریشانی دیکھ کر میرا دل رونے کو چاہ رہا تھا۔

''اچھا پھر اُٹھو..... ناشتہ کرو اور دوا لے لو.....''

وہ بڑی محبت سے کہتے ہوئے میرے سرہانے بیٹھ گئے۔

''احمد!.....'' اُن کا اپنے سر پر دھرا ہاتھ اُٹھا کر میں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''احمد! میں ڈر گئی ہوں۔'' میں نے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔

''تم ڈر گئی ہو..... مگر کس سے؟''

''حالات سے..... لوگوں سے.....'' میں اپنے بہتے ہوئے آنسوؤں کو بھی نہ روک سکی۔

''مومی کیا کر رہی ہو..... کیا ہو گیا ہے تمہیں؟'' مجھے روتا دیکھ کر وہ بے حد پریشان ہو گئے۔ ''حالات ٹھیک ہیں۔ حالات کو کیا ہوا..... اور یہ تم لوگوں کی پروا کب سے کرنے لگیں۔ دفع کرو لوگوں کو..... ہمیں اُن سے کیا لینا دینا۔''

''اگر ان لوگوں نے آپ کو مجھ سے چھین لیا تو..... تو..... میں.....'' میں اس قدر جذباتی ہو گئی کہ بھربھری ہو کر اُن کے دامن میں گرنے لگی۔ ایک منت، اِک التجا کی طرح اُن کے حضور گڑگڑانے لگی۔

''احمد! میں آپ کے بغیر جی نہ سکوں گی..... مجھے..... مجھے تنہا نہ.....'' میری رُندھی

ہوئی آواز میں اتنا نمک آ گیا کہ میں آگے کچھ بول ہی نہ سکی۔

''آئمہ..... ایمی..... دیکھو مت کرو ایسے..... کیا ہو گیا ہے تمہیں۔'' وہ مجھے بے حد محبت سے سنبھالنے لگے اور وہ جتنا مجھے سنبھال رہے تھے میں اُسی قدر بکھرتی گئی یہاں تک کہ میرے پاس اپنے جذبات کے اظہار کے لیے سوائے ہچکیوں کے کچھ نہ بچا۔ احمد خاموش تھے مگر ان کا وجود میرے لیے چادر کی طرح تھا..... تسلی اور حوصلوں کی حرارت سے بھرپور چادر۔ محبت اور وعدوں کی تاروں سے بنی ہوئی چادر۔ جس میں بدنیتی کا ایک بھی چھید نہ تھا۔ جس میں مجھے زمانے کی گرم سرد ہواؤں سے بچانے کی بھرپور صلاحیت تھی۔ جس میں میرے کمزور اور ناتواں وجود کو ڈھانپ لینے والا طول و عرض بھی تھا۔

اس کی بُکل میں آ کر میرا سارا خوف اور سارے وہم دُور ہو گئے اور مجھے اپنے محفوظ ہونے کا احساس یقین کی حد تک ہو گیا۔

❁❁❁

مجھے اگرچہ یہ یقین تو تھا کہ احمد مجھے خود سے کبھی جُدا نہ کریں گے مگر پھر بھی نادرہ آنٹی اور اماں جان کے درمیان ہونے والی اس خیالی گفتگو نے مجھے ایک فکر لگا دی تھی۔ میں لاکھ خود کو باور کراتی کہ وہ محض ایک بُرا خیال تھا ایک خود ساختہ وہم تھا اور کچھ نہ تھا۔ اماں جان میرے لیے ایسا کبھی بھی نہ سوچیں گی۔ پھر بھی اک خوف میرے دماغ سے چمٹ کر رہ گیا تھا اور اِس نے میرے اندر کی بے کلی اور اس بے کلی کی وجہ کو ہیولے بنا کر میرے سامنے کھڑا کر دیا تھا۔ یہ ہیولے مختلف وقت میں مختلف لوگوں کی شکلیں اختیار کر کے مجھے ڈرانے لگے تھے۔

''کیا میں نفسیاتی مریضہ ہو گئی ہوں.....؟'' ایک ہیولے نے میری ہی شکل بنا کر مجھ سے پوچھا۔

''نفسیاتی مریضہ..... یعنی پاگل پن کا آغاز.....'' میں سر سے پاؤں تک ہول کھا گئی۔

''یا پھر تم پر سچ مچ آسیب آ گیا ہے۔''

دوسرے ہیولے نے آسیب کی شبیہہ اختیار کر کے مجھے ڈرایا۔

''نہیں..... نہیں.....'' میں نے اپنی تمام تر Will Power جمع کر کے خود کو جھٹلایا اور ان دونوں ہیولوں کو ہاتھ مار کے منتشر کرنا چاہا۔ اک سیاہ اور سفید دُھواں میرے چاروں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طرف پھیل گیا جس میں میرا دم گھٹنے لگا۔

اگر ان دونوں میں سے ایک بھی بات سچ ہونے جا رہی ہے تو میں ایسا نہیں ہونے دوں گی..... میں فوری طور پر اپنا معائنہ کراؤں گی اور پھر علاج بھی.....

مجھے پاگل نہیں ہونا۔

اور نہ ہی بے بس اور آسیب زدہ.....

❁❁❁

فرحت میری بیسٹ فرینڈ میرے ہر دکھ درد کی ساجھی تھی۔ سوائے اِس ایک راز کے جو میری کم عقلی نے اپنے بچاؤ کے لیے تخلیق کر لیا تھا اور جو وقت کے ساتھ ساتھ اک ہیبت ناک شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ فرحت سے جب میں نے یہ ذکر کیا کہ مجھے عجیب عجیب وہم آنے لگے ہیں اور مجھے ان سے ڈر لگنے لگا ہے تو وہ مجھے مسز بدر کے پاس لے آئی۔ مسز بدر یوگا کے ذریعے نفسیاتی بیماریوں کا علاج کرنے کی ماہر تھیں۔ انہیں روحانی علاج میں بھی کمال حاصل تھا۔ انہوں نے مختلف ممالک سے ایسے بے شمار کورسز کر رکھے تھے ''اِنسانی نفسیات، بیماریاں اور علاج'' کے موضوع پر انہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی تھی پھر اِنڈیا میں کئی برس تک یوگا کی تعلیم دی اور اس پر ریسرچ بھی کی۔ اب پچھلے چند سالوں سے وہ پاکستان میں اپنی خدمات انجام دے رہی تھیں۔ مختلف شہروں میں انہوں نے یوگا اور روحانیت کے بڑے بڑے مراکز اور ہسپتال قائم کیے تھے۔ فرحت نے میرے لیے اُن سے بڑی کوششوں اور سفارشوں کے بعد وقت لیا تھا۔ آج ہم دونوں اپنے لیے ہوئے وقت سے بھی پہلے وہاں موجود تھیں۔ میرا دل جانے کیوں خوف اور وسوسوں سے لبریز تھا کہ پتہ نہیں وہ میرے بارے میں کیا کہیں، ان کی تشخیص کے بعد میری ذات سے جانے کون سی خطرناک بیماری برآمد ہو..... اور جانے وہ قابلِ علاج بھی ہو یا نہیں۔ اور اس انتظار میں مجھ پر اک اک ساعت کڑی قیامت بن کر بیت رہی تھی۔ ہر آہٹ پر لگتا اب میرا نام ہوگا، اب میری باری ہوگی فرحت میری اس حالت کو سمجھتے ہوئے میری ڈھارس بندھا رہی تھی اور میرے یخ ہوتے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں کی حرارت سے تقویت اور مجھے حوصلہ دے رہی تھی۔

فرحت میرے لیے کس قدر مخلص اور بے لوث ہے اس کا احساس اب مجھے ہو رہا تھا۔

ورنہ کون کسی کے لیے ایسا کرتا ہے۔ وہ پچھلے کئی روز سے میرے ساتھ تھی۔ اپنا گھر، اپنے بچے اور اپنا سخت مزاج سا شوہر چھوڑ کر مجھے وقت دے رہی تھی۔ اس کا شوہر۔ وہ سڑیل اور بدمزاج تو خود کوئی نفسیاتی کیس ہی لگتا تھا۔ میں ابھی یہ سوچ رہی تھی کہ فرحت کو مشورہ دوں کہ وہ اپنے میاں جی کو بھی یہاں لے کر آئے، جب میرا نمبر آ گیا۔

''بیگم احمد حسن.....'' بڑی سمارٹ اور خوبصورت سی نرس نے آ کر بڑے مؤدب انداز میں پکارا۔ میں اپنے دھڑ دھڑ کرتے دل کو سنبھالتی اُس کے ساتھ چل دی۔

❁❁❁

مسز بدر کے ساتھ پہلے دو سیشن تو اُن سوالات پر مبنی رہے جن کے ذریعے وہ میری شخصیت کو جانچنے کی کوشش کرتی رہیں اور پھر انہوں نے میری تحلیلِ نفسی کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ وہ میرا علاج یوگا سے کریں گی۔ آج وہ مجھے یوگا کی اہمیت وافادیت پر لیکچر دے رہی تھیں جسے سن کر مجھے لگ رہا تھا کہ اب یقیناً میرا کھویا ہوا سکون اور چین بحال ہو جائے گا اور میرے اندر بسنے والے خوف کے سارے ہیولے ہوا ہو کر میرے اندر سے نکل جائیں گے..... کیونکہ

یوگا ایک پُراسرار قوت کا نام ہے۔ اس قوت سے دنیا کو ہلایا جا سکتا ہے۔ تمام انسانی بیماریوں اور کمیوں کو دُور کیا جا سکتا ہے خواہ وہ جسمانی ہوں یا روحانی۔

مجھے مسز بدر کے تفصیلی لیکچر کے بعد یہ بات بھی سمجھ آ گئی تھی کہ آدمی جنون میں خدا جانے کیا کیا بڑبڑاتا رہتا ہے اور کبھی کسی درخت کو جن یا بھوت سمجھ کر اُس سے ڈرنے لگتا ہے تو کبھی اپنے اندر کے احساسِ کمتری کو خود پر اتنا سوار کر لیتا ہے کہ اس کے ہیولے بنا لیتا ہے۔ مختلف شکلیں تخلیق کر کے اُن کی آوازیں بھی سنتا ہے۔ یہ سب اس کے اعصاب میں بے جا تھکن پیدا کرتا ہے اور حد سے زیادہ پریشان ہونے پر اعصاب کے کمزور پڑ جانے سے بھی ایسا ہونے لگتا ہے۔ لیکن جب سائنس اور یوگا کی مشقیں شروع کی جاتی ہیں تو ان کا تعلق براہِ راست اعصاب اور دماغ سے ہو جاتا ہے۔ یوگا کے آسنوں کے ساتھ سانس کی مشقیں اعصاب کو فعال بنا دیتی ہیں جس سے انسانی دماغ کے لاشعوری حصے کے دونوں پُراسرار غدود یعنی پچیوٹری گلینڈ اور پی نیل گلینڈ کی کارکردگی میں احسن اضافہ کیا جا سکتا ہے جس کے نتیجے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں ایک یوگی نہ صرف اپنی تمام جسمانی اور روحانی بیماریوں سے نجات بھی پالیتا ہے بلکہ اس کا شعوری دماغ حیرت انگیز طاقتوں کا بھی مالک بن جاتا ہے۔ میں یہ سب باتیں ذہن نشین کر لینے کے بعد اب روزانہ باقاعدگی کے ساتھ مسز بدر کے آشرم یعنی سکون گھر میں آنے لگی تھی۔

❀❀❀

رات کے آٹھ بجے کا وقت تھا۔ احمد حسبِ معمول ہاتھ میں ٹی وی کا ریموٹ کنٹرول تھامے اس کے سکرین پر نظریں جمائے ہوئے تھے میں نے اُن کے پاس بیٹھ کر نہ صرف چائے پی تھی بلکہ اِدھر اُدھر کی بہت ساری باتیں بھی کر لی تھیں۔ میں نے احمد کو یہ تو بتا دیا تھا کہ میں یوگا سیکھ رہی ہوں مگر کیوں..... یہ نہیں بتایا تھا۔ میں آشرم سے واپس آ کر احمد کو ساری کارکردگی رپورٹ سنایا کرتی تھی۔ احمد نے آج بھی میری ساری باتیں خالی ہوں ہاں کر کے سنی تھیں۔ اُن کی توجہ ٹی۔ وی کی طرف پھر بھی زیادہ تھی۔ میں ڈپریسڈ ہونے لگی تو فوراً وہاں سے اُٹھ گئی اور باہر ٹیرس پر آ کر میں نے کھلی فضا میں کئی سانس کھینچ کھینچ کر اپنے پھیپھڑوں میں بھرے اور پھر آہستہ آہستہ چھوڑے۔ اب میں اپنے دماغ کو پُرسکون کرنے کے لیے نیم کنول آسن جما کے بیٹھ گئی تھی۔ یوگا سائنس میں یہ سب سے زیادہ مستعمل اندازِ نشست تھا جس سے بے پناہ دماغی سکون میسر آتا تھا۔

مجھے اس اندازِ نشست میں کوئی دس منٹ گزر چکے تھے۔ میں اپنے اردگرد کی دنیا سے بے خبر ایک اور ہی دنیا میں داخل تھی۔ سکون اور آرام کی کیفیت سے میرے اعصاب کی ساری تھکن دُور ہو گئی اور میں خود کو بڑا تر و تازہ محسوس کرنے لگی تھی۔ ابھی میرے تمام آسنوں کو دس منٹ کے دورانیے پر ہی رکھا گیا تھا۔ ٹھیک دس منٹ کی اس مشق کے بعد میں دوبارہ اٹھ کھڑی ہوئی اور ٹیرس پر ہولے ہولے چہل قدمی کرنے لگی۔ تبھی مجھے اپنے کمرے میں سے کچھ باتوں کی آواز آئی۔ کوئی احمد سے باتیں کر رہا تھا۔ کون.....؟ میرے تجسس نے سر اُٹھایا۔ میں نے یونہی اپنے کان ان آوازوں کی طرف لگا دیئے۔

''احمد! حقیقت پسند بنو..... اور اپنی زندگی کو خواہ مخواہ جہنم مت بناؤ۔'' یہ نادرہ آنٹی کی آواز تھی۔ جسے سنتے ہی میرے پاؤں کے تلوے میں اک سُوئی سی چبھی اور میرے دل کی ہر شریان میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ ''ہاں بیٹے اب تمہیں دوسری شادی کے بارے میں سوچ لینا

چاہیے۔'' وہ سنسناہٹ اماں جان کی آواز میں بدل گئی اور میرے تلوے سے دل میں گردش کرتا ہیولا باقاعدہ شکل میں آ کر بولنے لگا۔ ''یہ تمہارا حق ہے۔ جو تمہیں قانونِ قدرت اور سنتِ محمدی کا ودیعت کردہ ہے۔'' دھڑ دھڑ..... دھڑ رررڑ.....

میرے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تازہ تازہ سکون کی ساری اینٹیں ایک ساتھ گر گئیں اور میں بے دم ہو گئی۔

نادرہ آنٹی اور اماں جان بہت دیر تک احمد کو سمجھاتی رہیں کہ اُنہیں دوسری شادی کر لینی چاہیے۔ اُن کے پاس بہت سی مثالیں تھیں، بہت سی دلیلیں تھیں۔ وہ دین اور دنیا دونوں حوالوں سے احمد کو قائل کرنے پر مُصر تھیں اور احمد دونوں حوالوں کو ماننے کے ساتھ ساتھ بس ایک ہی جواب بار بار دیئے جا رہے تھے۔

''اماں جان! مجھے آپ کے خیالات سے ہرگز بھی اختلاف نہیں نہ ہی میں آپ کے جذبات پر شک کر رہا ہوں۔ یقیناً آپ یہ سب میری محبت میں کرنا چاہتی ہیں۔ آپ کے پیشِ نظر میری خوشی اور میری بھلائی ہی ہے..... مگر میں پھر بھی آپ دونوں کی اِس خواہش کو پورا نہیں کر سکتا.....''

''مگر کیوں میرے بچے..... کیوں؟''

اماں جان سے زیادہ نادرہ آنٹی کو احمد پر پیار آ رہا تھا۔ میں تو پہلے روز سے ہی نادرہ آنٹی کے تیکھے رویے بھانپ کر اُن سے خار کھانے لگی تھی اور اِس وقت تو وہ مجھے زہر لگ رہی تھیں۔ میں ٹیرس پر اپنے کمرے میں کھلنے والی کھڑکی سے لگی کھڑی سلگ رہی تھی۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں پتہ نہیں اُن کے ساتھ کیا کر ڈالتی..... میں نے غصے کے عالم میں اپنی مٹھیاں بھینچتے ہوئے اپنی بے بسی پر قابو پانے کی کوشش کی.....

''میں اپنی تقدیر پر قائم ہوں..... اور مجھے اپنی تقدیر کا لکھا بہرحال قبول ہے۔'' احمد کی سنجیدگی سے بھرپور آواز آئی..... جسے سن کر مجھے کچھ ڈھارس بندھی۔

''سیدھی طرح یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم آئمہ کی محبت میں بُری طرح گرفتار ہو اور اُس کے غضب سے ڈرتے ہو..... وہ جو ایک خوبصورت بلا کی طرح سے تمہیں چمٹ چکی ہے.....''

نادرہ آنٹی کی زبان پر ایک دم سے کڑواہٹ آ گئی۔ یقیناً وہ میرے لیے اپنے دل میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زہر بھرے ہوئے تھیں جس کا اظہار اب خود بخود ہو رہا تھا۔

''پلیز نادرہ آنٹی بس کریں۔ وہ میری بیوی ہے۔'' احمد نے ذرا بلند آواز میں کہا جس پر وہ بھی خفا ہو گئیں اور اماں جان بھی۔

''احمد! بدتمیزی مت کرو۔ تم بیوی کی طرفداری میں اپنی پھپھو سے اونچا بول رہے ہو۔'' اماں جان کافی سختی سے بولیں۔ جس پر احمد کو اپنی صفائی پیش کرنی مشکل ہو گئی۔

''اماں۔ اماں! آپ لوگ مجھے کیوں مجبور کر رہی ہیں۔ میں دوسری شادی نہیں کر سکتا..... پلیز.....''

احمد کی آواز میں دُکھ تھا..... التجا تھی۔ میں پوری کی پوری پسیج گئی۔ جی چاہا اندر چلی جاؤں اور نادرہ آنٹی سے اچھی طرح دو دو ہاتھ کر لوں۔ وہ ہوتی کون ہیں ہمارے ذاتی معاملات میں دخل دینے والی..... اور یہ انہی نے اماں جان کو بھی الٹی سیدھی پٹیاں پڑھا کر ان کا دماغ خراب کرنا شروع کر دیا ہے۔

''ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی..... اگر تمہیں عمر بھر کے لیے بے اولادی کا دکھ منظور ہے تو اُٹھاتے رہو لمحہ لمحہ..... اور مرتے رہو ہر سانس کے ساتھ۔''

نادرہ آنٹی نے غصے اور طنز سے احمد کو کہا اور تیزی سے کمرے سے باہر چلی گئیں اور پھر اماں بھی احمد سے ناراض ہو کر یہ کہتی ہوئی کمرے سے چلی گئیں۔

''احمد! مجھے تم سے ایسی بدتمیزی کی اُمید ہرگز بھی نہ تھی.....''

اُن دونوں کے جانے کے بعد ابھی میں کمرے میں واپس آنے کے لیے قدم بڑھا رہی تھی کہ احمد کا دھیان بٹا کر انہیں ڈیپریس ہونے سے بچاؤں تبھی میں نے اُن کی شکست خوردہ آواز سنی جس میں بے بسی سے چیختی اُن کی ذات ٹکڑے بن کر پھر سے پیروں تلے آ گئی۔

''اماں میں آپ کو کیسے سمجھاؤں۔ میں کتنا بے بس ہوں..... میں اس نعمت کو نہیں پا سکتا..... یہ میرے نصیب میں نہیں ہے۔ ورنہ میں..... میں شاید آپ کی بات مان ہی لیتا.....''

''اوہ میرے خدایا!.....'' میں درد سے بلبلا کر وہیں زمین پر بیٹھ گئی۔ میری نظروں کے سامنے پھر سے زمین ننھے ننھے دائروں میں ناچنے لگی تھی۔ سرگوشیاں کرتی ہوئی۔

''آئمہ بیگم! سنو تمہارا احمد حسن کیا کہہ رہا ہے.....''

''غور سے سنو وہ جو کہہ رہا ہے وہ ہو بھی سکتا تھا..... اور..... ہو بھی سکتا ہے۔''

''یعنی.....؟'' میں نے تڑپ کر آواز کے دائروں پر ہاتھ مارا.....

''یعنی..... دوسری شادی..... کوئی اور..... آئمہ کوئی اور۔'' وہ دائرے میرے گرد گھیرا تنگ کرنے لگے۔ میرا دم گھٹنے لگا۔

''اور میں؟''

''تم.....!؟'' وہ سارے دائرے ایک دم یکجا ہو گئے۔

''ہاں میں.....؟'' میرا دم گھٹتے گھٹتے آنکھوں میں آ گیا۔

''تم..... بس ختم، محبت کی اس کہانی کی طرح جس کے انجام پر ہیرو کی زندگی میں دوسری محبوبہ آ جاتی ہے۔''

اُن یکجا دائروں نے ایک خاکے کا رُوپ دھار لیا۔ ایک عورت کا خاکہ۔

میری آنکھوں میں گھٹا ہوا میرا دم دُھواں بن گیا۔ میری جھلسی ہوئی اَنا سے اُٹھا ہوا دُھواں۔

''پہلی عورت..... دوسری عورت کے آنے کے بعد..... کیا ہوتی ہے۔ شاید..... شاید یہی جو اِس وقت تمہاری آنکھوں میں ہے.....''

اب وہ خاکہ زبان پا چکا تھا۔ اگرچہ اُس کا کوئی خاص چہرہ نہیں تھا مگر وہ پھر بھی بول رہا تھا۔ میں انجام سے لرز گئی۔

اُس بے چہرہ خاکے نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور پھر سے دائرے بن کر ہوا ہو گیا۔

''نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں ایسا ہونے ہی نہ دوں گی.....'' میں نے اپنی ہتھیلیوں کو دونوں آنکھوں پر رکھ کر زور سے رگڑا۔

میری آنکھوں کو جلاتا ہوا وہ دُھواں اگرچہ پانی بن کر میرے گالوں پہ بہہ گیا تھا مگر میرے دل پر کئی گہری گہری سیاہ لکیریں چھوڑ گیا تھا۔

❀❀❀

پچھلے چار روز سے میں مسز بدر کے بتائے ہوئے سارے گُر آزما رہی تھی۔ میں نے ہر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طرح سے اپنے دماغ سے نادرہ آنٹی اور اماں جان کی باتیں محو کرنے کی کوشش کر لی تھی مگر احمد کے آخری جملے اُن ساری باتوں کو میرے ذہن سے ہٹنے نہ دیتے تھے، اور یہ بات تو میرے دل و دماغ سے چمٹ کر رہ گئی تھی کہ احمد دوسری شادی کر سکتے تھے۔ یہ خیال میرے دماغ میں کرنٹ بن کر دوڑتا اور میرا روم روم تھرا جاتا۔

یوگا کے وہ اینٹی ٹینشن آسن بھی بیکار ہو چکے تھے جنہیں مار کر بیٹھنے سے پہلے میرا دماغ ہلکا پھلکا اور تر و تازہ ہو جایا کرتا تھا۔ اب مجھے اپنی چلی ہوئی چال وقت کی حکمت دکھائی دینے لگی تھی۔ پہلے جو مجھے اس ڈھونگ کے رچائے جانے پر کچھ شرمندگی یا ندامت محسوس ہونے لگی تھی اب وہ کیفیت نہ رہی تھی بلکہ مجھے یہ سب تو اپنی دانش مندی دکھائی دینے لگی تھی۔ اب دوبارہ سے میرا ذہن اسی راہ پہ چل پڑا تھا اور میں پھر پلان کرنے لگی تھی کہ مزید کس طرح سے احمد کو یہ پکا یقین دلا دوں کہ اگر وہ دوسری شادی کر بھی لے تو سب بیکار ہے، وہ اولاد کی نعمت سے محروم ہی رہے گا؟

بہت سی سوچوں نے میرے دماغ کو جکڑ کر بوجھل کر دیا تھا جس کی وجہ سے مسلسل میرے سر میں درد رہنے لگا تھا۔ میں اپنے ڈپریشن کو کم کرنے کے لیے مختلف مصروفیات کا سہارا لیے ہوئے تھی۔ یوگا..... موسیقی..... سیر..... کلب کی سرگرمیاں اور پارٹیز..... لیکن یہ درد تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

''مومی!'' ایک رات احمد کا موڈ بہت اچھا تھا۔ وہ بہت دنوں کے بعد میری طرف سچ مچ متوجہ تھے۔

''ہوں.....'' میں جو ان کے قرب کو پا کر بے حد خوش تھی اُن لمحوں کو گن گن کے سینت رہی تھی۔

''بہت دنوں سے میں ایک بات کرنا چاہ رہا تھا.....''

اور میں تو اس وقت دل سے چاہتی تھی کہ احمد مجھ سے باتیں کریں..... ایک نہیں..... ڈھیروں باتیں۔

''مومی! اگر ہم کوئی بچہ گود لے لیں تو؟'' احمد نے بلا تمہید کہہ دیا۔ اتنی اہم اور اتنی بڑی بات..... میں تو ششدر ہی رہ گئی۔

''دیکھو ناں..... اب اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں۔''

انہوں نے میری آنکھوں سے میرے دل تک کی راہ لی۔ اب ان کی محبت میں سنجیدگی بھی شامل تھی۔ میں تو گنگ ہو کر رہ گئی۔ مجھے لگا میری زبان بھی میرے کانوں سے لگ گئی ہو۔

''آمی! تمہیں پتہ ہے ناں اماں اور پھپھو کیا چاہتی ہیں؟ جانتی ہو ناں کہ اب گھر والے ہمیں ڈسکس کرنے لگے ہیں۔ اندر باہر بے شمار آنکھیں ہیں جو آتے جاتے سوال کرتی ہیں، اور جن کا جواب میرے پاس نہیں ہے.....''

کہتے کہتے اُن کی آواز بھاری ہونے لگی۔ جیسے احساس اُن کے دل پر بھاری ہو کر گرنے لگا ہو۔

''احمد پلیز.....''

میں نے اپنی آنکھیں اُن کی آنکھوں سے چھڑائے بغیر اپنے ہاتھ اُن کے ہاتھوں سے چھڑا لیے۔ میں جو آج خود میں اُن کا بوجھ بٹانے کا حوصلہ نہ پا رہی تھی گھبرانے لگی۔

''آئمہ! میں جانتا ہوں کہ چور میں ہی ہوں۔ تم لاکھ مجھے اس کا احساس نہ ہونے دو۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہارے پاس لوگوں کے ہر سوال کا جواب بھی ہے، اور تمہارے پاس میری بات نہ ماننے کا پختہ جواز بھی ہے۔ لیکن پھر بھی.....''

اُن کے دل پر پڑا وہ بوجھ پہاڑ بن گیا۔ اُن کی آواز رُندھ گئی اور آنکھوں میں کنکر بن کر رگڑنے لگی۔

وہ کیا کہنا چاہتے تھے مجھے سمجھ آ گئی تھی۔

''احمد پلیز.....'' میں نے اپنی ہتھیلیاں اُن کی آنکھوں کے سامنے کٹورا کر دیں میری طرف سے ذرا سی تسلی اُن کے زخم کی تشفی بن گئی۔ وہ میرے کندھے پر سر رکھ کے رو دیئے..... بالکل ایک چھوٹے سے بچے کی طرح۔ جس کی کوئی بے حد پیاری چیز کہیں کھو گئی ہو اور جس کے نہ ملنے کا یقین اُس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جائے۔

''آئمہ! مجھے چھوڑ نہ جانا..... میں تمہارے بغیر نہیں جی سکتا.....''

احمد وہ کہہ رہے تھے جو میں کہنا چاہتی تھی۔ مگر اب کہنے کی بجائے سن کر خوش ہو رہی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''آئمہ! اگر ہم کوئی بچہ گود لے لیں گے تو سارے مسائل حل ہو جائیں گے.....''

وہ دوبارہ اس بات کی طرف آ گئے جسے سننے کو میری سماعتیں فی الحال تیار نہ تھیں۔

''آپ کا کیا خیال ہے ہم کس کو گود لیں.....؟'' میں نے اپنے اندر کی ناگواری کو دباتے ہوئے پوچھا.....

''ہم.....ہم ایسا کرتے ہیں عُمید کو گود لے لیتے ہیں۔ اپنا خون ہے، اور پھر اس پر کسی کو اعتراض بھی نہ ہوگا.....''

انہوں نے ٹھیک وہی کچھ کہا جس کی مجھے سو فیصد توقع تھی کیونکہ پچھلے کئی روز سے میں اُن کا عمید کی طرف حد سے زیادہ جھکاؤ دیکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے اِردگرد ایسی کچھ سرگوشیوں کی بھنبھناہٹ بھی محسوس کر رہی تھی۔

''وہ میرا نہیں آپ کا خون ہے۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لبوں سے نکل ہی گیا جس پر اگلے ہی لمحے احمد نے سیدھے ہو کر مجھے حیرانگی سے دیکھا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

اُن کا محبتوں سے بھیگا لہجہ کچھ خشک ہونے لگا جس پر میں فوراً ہی ڈر گئی۔ میں اندر سے بے حد کمزور اور بزدل تھی، شاید اس لیے کہ اصل چور تو میرے دل میں تھا۔

''میرا مطلب تھا ضروری تو نہیں کہ ہم عُمید ہی کو گود لیں.....''

''کیوں.....کیوں نہ لیں عُمید کو.....'' احمد کو مجھ سے اس بات کی توقع ہرگز نہ تھی۔

''میں تو اِس لیے کہہ رہی تھی احمد کہ مجھے بیٹوں سے زیادہ بیٹیاں اچھی لگتی ہیں۔ میرے دل میں ہمیشہ سے بیٹی کی خواہش اوّل رہی ہے۔'' میں نے اپنا لہجہ دوبارہ سے نرم کرتے ہوئے فوراً سے بات بنائی۔

''بیٹی؟'' احمد کسی سوچ میں اُداسی سے کھو گئے۔

''بیٹیاں تو مجھے بھی بہت اچھی لگتی ہیں۔ تمہیں پتہ ہے موی! میں نے تو یہ تک سوچ لیا تھا کہ اللہ نے مجھے بیٹی دی تو میں اُس کا نام عائش رکھوں گا۔''

''عائش.....'' میں نے بڑی حیرت سے دہرایا۔ ''یہ نام تو میں نے کبھی نہیں سنا.....؟''

''یہ کوئی عام نام نہیں ہے.....یہ تو بڑا ہی منفرد اور مقدس نام ہے۔ کسی عظیم ترین ہستی

کی لازوال محبت کا اظہار۔'' اُن کی آنکھوں میں عقیدت کے جگنو چمک رہے تھے۔

''سرورِ کائناتؐ ام المومنین عائشہ صدیقہؓ کو جب بے حد محبت اور بے تکلفی سے بلایا کرتے تھے تو انہیں ''عائش'' کہہ کر پکارتے تھے۔''

ذکر نبیؐ کے آتے ہی میرے لہو کا قطرہ قطرہ فرطِ انبساط سے مخمور ہو کر جھومنے لگا تھا۔

''عائش.....'' میرے لبوں نے کئی بار بے ساختہ دہرایا اور دل کہنے لگا۔ میں یہی نام اپنی بیٹی کا رکھتی.....بس یہی نام۔

''اِتنا خوبصورت اور منفرد نام۔'' میں اپنے خیالات میں کہیں دُور کھو گئی اور یقیناً احمد کی بھی یہی کیفیت تھی۔ اِس لیے تو ہمارے درمیان اب کوئی آواز نہ تھی۔ سوائے اس کے جو ہمارے دلوں سے آ رہی تھی۔ بڑی ہی مدُھر اور مترنم آواز۔

❁❁❁

گھر میں ایک ڈسکشن شروع ہو گئی تھی۔ ہم کوئی بچہ گود لینا چاہتے ہیں، اِس اِطلاع نے ایک ناقابلِ یقین انکشاف کی صورت اختیار کر لی تھی۔ پہلے کی سوالیہ نظروں میں چھپے شکوک پختہ ہونے لگے تھے۔ میرے لیے تکلیف دِہ بات یہ تھی کہ ہر نگاہ ہر زبان پر جو چبھن تھی وہ میرے ہی وجود کے آر پار ہو رہی تھی اور احمد کی طرف اُٹھنے والی نظروں میں ہمدردی، محبت اور اِس فیصلے پر ستائش تھی۔ لگتا تھا میں ہی مجرم ہوں، میں ہی قصوروار۔ سارے نقص، ساری کمی میرے ہی اندر تھی۔ میں عورت جو تھی.....کمزوری کی علامت۔ خصوصاً اِس نازک معاملے میں تو زمانہ عورت پر ہی ٹیڑھی نظر ڈالتا ہے گویا مرد تو پیدائشی کامل ہوتا ہے۔ گھر والوں میں سب سے زیادہ خفگی اور طنز والا رویہ نادرہ آنٹی اور اماں جان کا تھا۔ وہ باتوں باتوں میں یہ جتلا رہی تھیں کہ احمد نے میری محبت اور ضد کے سامنے ہار مان کے اپنا دوسرا حق ایثار کر دیا تھا ورنہ اُن کے پاس کھلا راستہ تھا وہ اس کے ذریعے اپنی قسمت دوبارہ آزما سکتے تھے۔ بات تھی بھی درست۔ میں اس سارے ماحول سے گھبرا گئی۔ سر درد کے ساتھ ساتھ اِک دردِ دل بھی تھا جس نے مجھے بے کل اور اُداس کر دیا تھا۔

''احمد! اگر آپ اجازت دیں تو میں چند روز کے لیے امی کے ہاں چلی جاؤں؟'' عاجز آ کر میں نے احمد سے کہہ ہی دیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ہاں..... ہاں ضرور''..... وہ تو جیسے تیار ہی بیٹھے تھے۔

میں بغیر مزید کچھ کہے اُٹھی اور بیگ میں اپنے چند جوڑے رکھنے لگی۔ راستے میں احمد مجھے پیار سے سمجھاتے رہے تسلیاں دیتے رہے کہ یہ سب کچھ وقتی ہے جلد ہی ٹھیک ہو جائے گا، اور یہ کہ سب گھر والے تم سے اُسی طرح محبت کرتے ہیں تم اپنے جی میں ان کے لیے کچھ میل مت آنے دو۔ ''اور دیکھو پریشان مت ہو۔ ڈیپریشن سے تمہاری طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔'' اُنہیں واقعی میری بے حد فکر تھی۔

''اچھا تم ایسا کیوں نہیں کرتی ہو کہ نیویارک والا ٹرپ جوائن کر لو۔ تمہارا دل بھی بہل جائے گا اور تمہارے کام کا بھی ہرج نہ ہوگا۔''

انہوں نے مجھے اس کانفرنس میں جانے کی اجازت دیتے ہوئے کہا جس پر وہ پچھلے ہفتے مجھ سے خاصی بحث کر کے صاف انکار کر چکے تھے۔ میں نے حیرت سے احمد کو دیکھا جو بڑے سکون سے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے مسکرا رہے تھے۔ مجھے اچھی طرح سے یاد تھا میں نے جب ان سے اس کانفرنس میں جانے کی بات کی اور بتایا تھا کہ میں چونکہ اپنی فاؤنڈیشن کی آل پاکستان صدر ہو چکی ہوں لہٰذا نمائندگی کے لیے مجھے ہی جانا ہوگا۔ مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا تھا۔

''مگر کیوں احمد؟ میں وہاں تنہا تھوڑی جا رہی ہوں۔ پورا ایک وفد جا رہا ہے۔ نہ صرف وہاں ایک خواتین کانفرنس کا انعقاد ہے بلکہ ایک ثقافتی میلہ بھی ہے۔ بہت سے آرٹسٹ بھی جا رہے ہیں۔'' میں نے اُنہیں قائل کرنے کی کوشش کی تھی۔

''بھلے پورا ملک جا رہا ہو..... میں پھر بھی تمہیں جانے کی اجازت نہیں دوں گا.....''

وہ بے حد اطمینان سے کہہ رہے تھے۔ میں نے غور سے ان کا چہرہ دیکھا تھا وہ نہ تو خفا تھے نہ ہی غصے میں۔

''لیکن کیوں؟'' میں اُن کے سامنے نا اُمید سی بیٹھ گئی۔

''اِس لیے کہ میں نہیں جا رہا۔ میرے بغیر تم کیسے جا سکتی ہو.....'' وہ مسکرا پڑے جس سے مجھے کچھ حوصلہ ہوا۔

''احمد پلیز آپ بھی چلیں ناں..... سچ بہت مزہ آئے گا۔''

''میں بھی نہیں جا سکتا۔'' وہ بدستور مسکراتے ہوئے بولے۔

''یہ کیا بات ہوئی؟'' میں چڑ گئی۔

''مجھے فرصت نہیں ہے کچھ کاروباری مسائل ہیں ان دنوں اور پھر اماں جان کو یہ سب پسند نہیں۔ تم جانتی ہو ناں۔ تم جتنا تم کر رہی ہو یہ میں اپنی ذمہ داری لے کر تمہیں کرنے دیتا ہوں۔ وہ مجھ سے اس پر خفا ہیں۔ میں انہیں مزید خفا نہیں کر سکتا۔''

''اماں جان..... اماں جان..... آخر ہم کب تک اُن کے فیصلوں کے محتاج رہیں گے۔ ہماری اپنی زندگی بھی تو ہے.....'' میں غصے میں آ گئی۔

''وہ زندگی کس کام کی جو بے مہار ہو۔ بزرگوں کا ہاتھ اگر سر پر نہ ہو تو انسان کافی حد تک خود غرض بن جاتا ہے۔ یہ ہمارے والدین ہی تو ہوتے ہیں جو ہمیں زندگی کے اُتار چڑھاؤ سمجھاتے ہیں.....''

میں انہیں لاکھ دلیلیں دیتی رہی مگر اُن کی نہ ہاں میں تبدیل نہ ہوئی، اور آج وہ اتنی آسانی اور سہولت سے مجھے نہ صرف تنہا جانے کی اجازت دے رہے تھے بلکہ اِصرار بھی کر رہے تھے۔ میں جانتی تھی وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ میں نے فقط اِتنا کہا۔

''جی میں سوچوں گی.....''

احمد مجھے امی جان کی طرف چھوڑ کر چلے گئے۔ میں وقت کی اِس نئی کروٹ پر غور کرتی رہ گئی کہ اب کیا ہوگا۔

❁❁❁

امی جان میری طرف سے بے حد فکر مند اور پریشان تھیں۔ وہ مجھے پچھلے دو روز سے مسلسل سمجھا رہی تھیں۔ اُن کا خیال تھا کہ ان سارے حالات کی خرابیوں میں خود میرا حصہ زیادہ ہے۔ میں بھی پچھلے دو روز سے انہیں یہی صفائیاں پیش کر رہی تھی کہ قصوروار میں نہیں ہوں..... مگر وہ ماں تھیں اُن کی آنکھیں میرے چہرے کے بظاہر سکون کو دیکھ کر اعتبار کرنے والی نہیں تھیں وہ تو میرے دل کے اندر تک جھانک لیتی تھیں۔ وہ مجھے اِس بات پر قائل کرنے کی بھرپور کوششوں میں تھیں کہ اگر ہم لوگوں نے کوئی بچہ گود میں لینے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو پھر ''عُمید'' سے بڑھ کر نہ تو کوئی ہمارا بنے گا نہ ہی اس میں بہتری ہوگی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''امی! آپ بھی خواہ مخواہ ہی احمد اور اماں جان کی ہم خیال ہو رہی ہیں۔ عُمید کوئی آخری بچہ تو نہیں جسے ہم گود لیں.....''

مجھے جانے کیوں ''عُمید'' کے ذکر سے چڑ ہونے لگی تھی۔

''میں کوئی بیٹی گود لینا چاہتی ہوں.....'' میں نے اپنی مرضی انہیں بتائی۔

''تمہارا تو دماغ خراب ہے۔ وہ باتیں مت کرو جن میں شر ہی شر ہے۔'' امی جان ذرا سختی سے بولیں۔

''اِس میں بھلا کیا شر ہے اگر میں کسی یتیم غریب بچی کو اپنا لوں گی تو؟'' مجھے ان کی سوچ پر الجھن ہونے لگی تھی۔

''دیکھو! میری بات کو غور سے سنو اور سمجھنے کی کوشش کرو.....'' وہ مجھے اپنے پاس پیار سے بٹھاتے ہوئے بولیں۔

''وہ بچی جو تم گود لوگی۔ سوچو جب وہ جوان ہوگی تو کیا تمہارا شوہر اس کے لیے نامحرم نہ ہو جائے گا۔''

''امی جان پلیز.....!'' مجھے اُن سے ایسی بات کی ہرگز بھی توقع نہ تھی لہٰذا مجھے کرنٹ سا لگا۔ مجھے امی جان کی ایسی سوچ پر افسوس ہونے لگا۔

''دیکھو میری بیٹی! اللہ کے بنائے ہوئے قوانین اور حدود کو سمجھو۔ وہ مرد اور عورتیں جو ہمارے معاشرتی نظام کی وجہ سے اکٹھے رہتے ہیں بھلے وہ اِنتہائی قریبی رشتہ دار ہوں اُن کے لیے بھی قانونِ محرمات ہے۔ ماں، بیٹا، بیٹی اور باپ، بھائی اور بہن، چچا اور بھتیجی، ماموں اور بھانجی..... خالہ اور بھانجا، سوتیلا باپ، سوتیلی ماں، ساس، داماد، سسر اور بہو اِس کے علاوہ رضاعی مائیں اور رضاعی باپ۔ یہ سب رشتے محرم رشتے ہیں۔''

وہ بڑے رسان سے بولتی بولتی رُکیں۔ ایک نظر مجھ پر ڈالی، ذرا سا مسکرائیں اور پھر میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بڑی نرمی سے انہیں دباتی ہوئی بولیں۔ ''اس کے سوا جتنے بھی رشتے جتنے بھی تعلق ہوں گے وہ نامحرم ہوں گے۔ خواہ وہ لے پالک بیٹا ہو یا لے پالک بیٹی۔''

اب وہ میری آنکھوں سے دل کو چھو رہی تھیں اور مجھے بے چینی ہونے کی بجائے کچھ

ٹھہراؤ محسوس ہو رہا تھا۔ ورنہ تو میں امی جان کی ایسی لمبی لمبی باتوں، مثالوں اور دلیلوں سے دل چُرا لیا کرتی تھی اور ہنستے ہوئے انہیں کہہ دیا کرتی تھی۔

''کیا ہے امی جان! آپ تو ہمیشہ دین کے ڈرانے والے پہلو ہی دکھاتی رہتی ہیں۔ اللہ میاں اتنے بھی سخت نہیں ہوں گے وہ تو بڑے مہربان ہیں معاف کر دیں گے.....''

''آئمہ! سوچو ذرا جو تم چاہتی ہو۔ یعنی اگر تم کسی لاوارث یا غیر بچی کو آج گود لیتی ہو تو کل جب وہ جوان ہوگی۔ تو کیا وہ احمد کے لیے نامحرم اور احمد اس کے لیے نامحرم نہ ہو جائیں گے۔'' امی نے اپنی بات جاری رکھی۔

''اُف اللہ امی جان! آپ کہاں تک سوچتی ہیں۔'' مجھے پھر اُن کی بات اچھی نہ لگی۔

''ایک بچی یا بچہ جسے ہم اپنی اولاد بنا کر پالیں۔ وہ کل کو ہمارے لیے نامحرم کیسے ہو سکتے ہیں۔ آپ کے کہنے کا مطلب ہے بیٹی لوں تو احمد کا کردار خطرے میں پڑ جائے گا اور بیٹا لوں تو میرا..... اُف یہ تو بہت گری ہوئی سوچ ہے۔''

میرے الفاظ اور انداز پر ذرا بھی بُرا منائے بغیر وہ کہنے لگیں۔ ''زمانے کے چلن سے نظریں مت چراؤ آئمہ! تم بھی اچھی طرح سے جانتی ہو کہ دنیا میں کیا نہیں ہو رہا۔ آج سگے رشتے خطرے میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہ تو منہ بولے رشتے ہیں۔''

''ایسے مکروہ کردار باپ پتہ نہیں کہاں ہوتے ہوں گے؟''

''یہیں ہوتے ہیں اسی دنیا میں..... کیا تم اس کیس کو بھول گئی ہو جسے تمہاری ہی فاؤنڈیشن نے خوب اُچھالا تھا اور عہد کر لیا تھا کہ اُس شخص کو عبرت ناک سزا دلوا کر رہیں گی.....''

امی جان نے مجھے وہ سانحہ یاد کرا دیا جس میں ایک شرابی باپ کے ہاتھوں معصوم بیٹی بے حُرمت ہو گئی تھی، اور ہماری فاؤنڈیشن نے اس کے خلاف ریلیاں تک نکالی تھیں یہاں تک کہ اس ذلیل شخص کو عمر قید کروا دی تھی۔ مجھے ایک دم سے کراہت محسوس ہوئی۔

''وہ انسان کہلانے کے لائق کب تھا وہ تو شیطان تھا۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔

''یہی تو میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ یہ ''شیطان'' جو اِنسانی رگوں میں لہو کے ساتھ گردش کرتا ہے یہ اِنسانی جذبات کی رَو کو کب اپنے تابع کر لے کسے خبر؟ اِنسان تو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بشری کمزوریوں کا مرقع ہے اور نفسِ انسانی خود بڑا کمزور ہوتا ہے۔ ایسا سب کچھ یقیناً اِنسان سے کروانے والا شیطان ہی ہوتا ہے۔ مگر ایسا ہوتا تو ہے....."

امی جان نے بے حد محبت سے میرا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اُن کی ٹھنڈی میٹھی نگاہوں کے لمس میرے چہرے کو چھونے لگے تو میرا دل خود بخود پگھلنے لگا۔

یہ محبت..... محبت بھی کیا آتش ہے! نرم ہو یا گرم۔ لمحوں میں پتھر کو پانی کر دیتی ہے۔ اور پھر ایک ماں کی محبت..... مجھے لگا میرے ہاتھ اور پاؤں باندھ کر اِس محبت نے مجھے گرا لیا تھا۔

"اور سنو! محرم نامحرم کے مسئلے کو اگر تم اپنی ماڈرن سوچ سے نہ بھی تسلیم کرو تو اِس معاملے میں ایک اور بڑی قباحت ہے جسے تم کسی بھی آزاد خیالی سے رَد نہیں کر سکتی ہو۔"

"وہ کیا؟" میری آواز میں اَب وہ دَم نہ تھا۔ لگتا تھا میری ماں کی محبت نے میری زبان پر بھی رسّی ڈال دِی تھی۔

"تم کسی ایسے لے پالک کو جو تمہارا یا تمہارے شوہر کا قریبی رشتہ دار نہ ہوا، اپنی وراثت کا حقدار نہ بنا سکو گی..... کبھی بھی نہیں۔ وہ عمر بھر تمہاری خدمت کرے گا..... تم ہزار جان سے اُس پر فدا رہو گی مگر ایک وقت آئے گا کہ وہ تمہارے لیے غیر ہو جائے گا۔"

اب دوسرا ئیل میرے دل پر تھا۔

"امی جان! کھل کر بتائیں....." میرا سچ مچ دَم گھٹنے لگا۔

"لے پالک۔" کو زمین جائداد میں کچھ حصہ نہیں مل سکتا اگر وہ غیر تھا تو..... یہ اللہ کا حکم ہے، قرآن کا قانون ہے..... اور اللہ کے قوانین بندوں کی بھلائی کے لیے ہی ہوتے ہیں۔"

"اس میں تو کوئی شک نہیں" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ جس پر وہ مزید کہنے لگیں۔

"احمد! کے ساتھ حسنِ سلوک کرو۔ آئمہ..... کیونکہ وہ تم پر احسان کر رہا ہے۔"

"احمد کا مجھ پر کیا احسان ہے امی؟" میں پھرتن کر بولی۔

"وہ دوسری شادی کرنے کا حق رکھتا ہے مگر نہیں کر رہا۔" مجھے اپنی بے حد سبکی محسوس ہوئی اور مجھے لگا کہ امی بھی نادرہ آنٹی کی طرح فردِ جرم میرے نام ہی لکھ رہی ہیں۔

"احمد اگر دوسری شادی نہیں کر رہے تو اِس لیے کہ وہ اس کا حق رکھنے کے باوجود اس کے اہل نہیں ہیں....."

میں نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر کے وہ کہہ دیا جو سچ تو نہیں تھا مگر جسے اب میں خود بھی سچ ہی سمجھنے لگی تھی.....

"کیا..... کیا کہہ رہی ہو تم..... یعنی احمد.....؟؟"

امی جان سُوکھے گلے سے بولیں احمد کے بارے میں ایسا اِنکشاف جسے وہ یقیناً سوچ بھی نہ سکتی تھیں نوکیلے کانٹوں کی طرح اُن کے یقین کے گلے میں اٹک گیا۔

"بس امی! اب آپ بھی مجھ سے کوئی اور بات نہیں پوچھیں گی نہ ہی کریں گی....."

میں نے جلدی سے کہا اور اُن کے ڈھیلے پڑتے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ چھڑا کر کمرے سے باہر نکل گئی.....

اب میں ایک لمحے کو بھی اُن کے سامنے نہیں رہنا چاہتی تھی۔ جانتی جو تھی کہ وہ میری آنکھوں میں لکھا سب صاف صاف پڑھ لیں گی۔ وہ جان جائیں گی کہ یہ فردِ جرم دراصل کس کے خلاف ہے۔ اہلیت اور اصلیت کس کی کیا ہے۔ بغیر کسی دلیل کے ثابت ہو جائے گی اور مجرم کے چہرے پر سے سیاہ نقاب خود بخود ڈھلک جائے گا..... وہ میری ماں تھیں۔ ان کی کوکھ نے مجھے نو ماہ تک ٹٹول ٹٹول کر پروان چڑھایا تھا۔ وہ تو میرے سارے بھید پیدائشی جانتی تھیں۔ میں جس نے خود کو بری الذمہ رکھنے کی ٹھان لی تھی کسی کے بھی سامنے کمزور نہیں پڑنا چاہتی تھی..... اپنی ماں کے سامنے بھی نہیں!

❀❀❀

میں اپنی فاؤنڈیشن کی چند اور ممبران کے ساتھ خواتین کی پانچویں عالمی کانفرنس میں شرکت کے لیے نیویارک آ چکی تھی جہاں ہمارا بڑی گرمجوشی سے اِستقبال کیا گیا تھا یہ کانفرنس ۵ جون سے ۹ جون تک ہونی تھی۔ ہم لوگ دو روز پہلے ہی نیویارک پہنچ گئے تھے۔ ہم جس ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ وہ "ایونیو آف امریکہ" کی سحر آفرینیوں کے بیچوں بیچ ایک کئی منزلہ آسمان کو چھوتی ہوئی بلڈنگ میں واقع تھا۔ میرے ساتھ کمرے میں تنویر فاطمہ تھی۔ یہ آج کل ہماری فاؤنڈیشن کی سیکرٹری تھی۔ اس کا تعلق اگرچہ سیالکوٹ سے تھا مگر اس کی ذہانت اور سرگرمی سے فاؤنڈیشن کے فرائض انجام دینے کی عادت نے اسے بہت جلد ملک سے باہر بھی شہرت دلوا دی تھی۔ فرحت اور دیگر چند ممبران کے ساتھ شوہر اور بچے بھی تھے۔ غیر سرکاری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تنظیم ہونے کے ناطے ہماری فاؤنڈیشن کے پاس فنڈز کی فراوانی تھی جو ایسے بڑے بڑے دوروں کے دوران اخراجات میں خوب نظر آتی۔ دو روز جو کانفرنس شروع ہونے سے پہلے ہمیں سیر و سیاحت کے ساتھ ساتھ کانفرنس کی تیاری کے لیے مہیا کیے گئے تھے۔ میری توجہ گھومنے پھرنے سے زیادہ کانفرنس کی تیاری کی طرف تھی۔ تنویر فاطمہ تو مجھ سے بھی زیادہ اس سلسلے میں سنجیدہ دکھائی دیتی تھی۔ وہ بڑی صاف گو لڑکی تھی اور مجھے بتا چکی تھی کہ اس این جی او سے وابستہ ہو کر وہ دراصل اپنے اور اپنے گھر والوں کے لیے زندگی کے سارے سکھ حاصل کرنا چاہتی ہے اور اس کا ٹارگٹ اقوام متحدہ تک رسائی ہے۔ جسے وہ جلد ہی حاصل کر لے گی.....

اُس نے اپنے شوہر سے طلاق بھی اِسی مقصد کی تکمیل کے لیے لے لی تھی۔ وہ بنیادی طور پر ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور دیہات کی رہنے والی تھی۔ بس اپنی محنت اور شوق سے اس نے تعلیم حاصل کر کے شہر میں نوکری کر لی اور پھر اپنے گھر والوں کو بھی وہاں لے آئی۔ اس کی شہرت اگرچہ اچھی نہ تھی۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ اس نے شہر آ کر ترقی حاصل کرنے کے لیے جو سیڑھی استعمال کی تھی۔ اس کے پہلے Step پر ہی شرافت اور پاکیزگی کے آبگینے ٹوٹ کر چکنا چور ہو جایا کرتے ہیں۔ بہرحال..... مجھے کسی کے کردار و عمل سے کیا لینا دینا۔ ہر ایک کو اپنی مرضی سے جینے کا اختیار ہونا چاہیے۔

۲ر جون کی رات ہماری فلائٹ نیویارک پہنچی تھی۔ بے حد تھکن کی وجہ سے اس رات کھانا کھاتے ہی میں تو سو گئی تھی مگر سنا تھا اور کوئی بھی نہ سویا تھا۔ سب کا کہنا تھا کہ بھلا نیویارک میں بھی کوئی سونے آتا ہے۔ لیکن مجھے نیویارک سے کچھ خاص دلچسپی نہ تھی میں تو پہلے سے ہی اس کا چپہ چپہ احمد کے ساتھ گھوم چکی تھی۔ مجھے احمد یاد آنے لگے اور میرا دل بے حد اُداس ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ یہ اُداسی میری آنکھوں سے نیند اور دل سے قرار لے اُڑتی۔ میں نے جلدی سے اپنے ہینڈ بیگ میں سے سکون کی دو گولیاں نکالیں۔ جو دراصل خواب آور ہوتی ہیں۔ پانی کے بڑے بڑے گھونٹ بھر کے انہیں حلق سے اُتارا اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔

اگلی صبح ناشتے کے بعد ایک گاڑی تیار کھڑی تھی جس نے ہمیں نیویارک کے اہم مقامات پر سیاحت کی غرض سے لے کر جانا تھا۔ بادلِ نخواستہ مجھے بھی چلنا پڑا..... گاڑی چلی تو سارے لوگوں کا خوشی اور تجسس کے مارے بُرا حال تھا، خصوصاً بچوں کا۔ میں نے ایک نظر

اُنہیں دیکھا اور پھر کھڑکی سے باہر اس شہر کی دلفریبیوں کو تکنے لگی..... کچھ ہی دیر میں ہم لوگ ایونیو آف امریکہ سے گزرتے ہوئے اُنسٹھ سٹریٹ پہنچ چکے تھے جہاں دنیا کا سب سے بڑا پارک جسے سنٹرل پارک کہتے ہیں ہمارے سامنے تھا۔ یہ پارک یہاں سے لے کر ایک سو دسویں سٹریٹ تک پھیلا ہوا ہے جس کی لمبائی تقریباً ڈھائی میل بنتی ہے۔ یہ شرقاً غرباً ففتھ ایونیو سے ایٹھ ایونیو کے درمیان واقع ہے اِس پارک میں سبزہ زار، درختوں، پھولوں کے علاوہ ثقافت، اسپورٹس، قدرتی مناظر، بچوں کے عجائب خانے، چڑیا گھر سب کچھ موجود ہے۔ گاڑی سے اُترتے ہی سب لوگ اپنی اپنی دلچسپی کی جگہوں کی طرف دیوانوں کی طرح بھاگے۔ مجھے ایک طرف ہو کر بیٹھتے دیکھ کر تنویر فاطمہ بھی میرے ساتھ بیٹھ گئی۔

''جاؤ تم سیر کرو..... اِنجوائے کرو.....'' میں نے اُس کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

''نہیں میرا دل نہیں چاہ رہا.....'' وہ کچھ تھکی تھکی سی لگ رہی تھی۔

''کیوں خیر تو ہے۔'' میں نے پریشانی سے پوچھا۔

''ہاں بس ایسے ہی میرے سر میں درد تھا.....'' وہ اپنی کنپٹیاں دباتے ہوئے بولی۔ چلو وہاں سے کافی لے کر آتے ہیں۔'' میں نے ایک طرف کافی شاپ دیکھ کر کہا۔ پھر ہم دونوں نے وہاں سے کافی اور چپس کے پیکٹ لیے۔ اب ہم دونوں چہل قدمی کر رہی تھیں۔

''کس قدر وسیع اور حسین پارک ہے۔ ہمارے ہاں تو ایسے پارکوں کا تصور بھی ناپید ہے۔'' وہ ''سنٹرل پارک'' کو دیکھ کر خاصی مرعوب تھی۔ اُس کی دلچسپی دیکھ کر میں اُسے پارک کے بارے میں وہ معلومات فراہم کرنے لگی جو مجھے یہاں سیر کراتے وقت احمد نے دی تھیں۔

''میں تمہیں بتاؤں اِس پارک کو بنانے کی پلاننگ ۱۸۵۸ء میں فریڈرک لا آمسٹیڈ (Fredrick Law Oimstead) نے کی تھی پھر اس کو عملی جامہ پہنانے کا کام ۱۸۵۹ء سے ۱۸۷۰ء تک ہوتا رہا۔ اِس طرح سے یہ پارک نیویارک کے باشندگان کے لیے ظہور میں آیا.....''

''واہ میڈم آپ کو تو بہت معلومات ہیں۔'' تنویر فاطمہ مجھ سے اور بھی مرعوب ہو گئی۔

''ہاں..... یہ سب احمد نے بتایا تھا۔'' میں نے بتایا تو ''احمد'' کے نام کے ساتھ ہی یقیناً

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میری آنکھیں ستارہ سی ہوگئی تھیں تبھی تو تنویر فاطمہ نے مجھے شرارت سے چھیڑتے ہوئے کہا تھا۔

''لگتا ہے آپ کو اپنے شوہر سے بہت محبت ہے۔''

''مجھے..... ہاں..... بہت زیادہ.....'' میں نے فخر سے کہنا چاہا مگر میری پلکیں جانے کیوں میری آنکھوں پر پردہ بن گئی تھیں۔

''اور اُنہیں؟'' وہ شوق اور تجسس سے پوچھ رہی تھی۔

''بے حساب۔ بے پناہ.....'' بے اختیار میرے لبوں نے اقرار کیا۔

''آپ بہت خوش قسمت ہیں ورنہ..... آہ.....!'' وہ اُداسی وحسرت سے بولی۔

''ورنہ سارے مرد اپنی بیویوں سے محبت نہیں کرتے۔ جیسے کہ میرا شوہر تھا۔''

میں نے دیکھا وہ اپنے طلاق والے فیصلے پر اندر سے خوش نہ تھی۔ شاید اُسے بھی اپنے سابقہ شوہر سے محبت ہوگی اور وہی اس پر ظلم کرتا ہوگا۔ میں نے خود ہی قیاس کیا۔ اِس سے پہلے کہ ہم مزید کچھ بات اپنے نجی معاملات پر کرتیں ہماری گائیڈ مس ایلینا نے ہمیں متوجہ کیا کہ ہمیں اب سنٹرل پارک سے آگے دوسرے مقام پر جانا ہے۔

❁❁❁

رات کو ہم لوگ جو واپس ہوٹل آئے تو دوبارہ گھومنے کے لیے میں تو باہر نہ گئی البتہ تنویر فاطمہ مجھ سے معذرت کرتے ہوئے اُن لوگوں کے ساتھ چلی گئی جن کا پروگرام نیویارک کی راتوں کی رونقیں دیکھنے، کلب اور کسینو وغیرہ جھانکنے کا تھا۔ مگر مجھے ایک تو واقعی ان جگہوں سے کراہت آتی تھی دوسرا میرے سَر میں بھی درد تھا۔ پھر وہی میگرین..... لگتا تھا۔ میرا بلڈ پریشر پھر ہائی ہوگیا تھا۔ مگر کیوں؟ آج تو دن بھر میں بے حد پُرسکون اور تروتازہ رہی تھی۔ آج تو مجھے کوئی فکر کوئی پریشانی نہ تھی پھر بھی یہ درد..... میں آرام کرسی پر جھولتی ہوئی اپنی کنپٹیاں دبانے لگی۔

مجھے اپنا وطن یاد آرہا تھا..... اپنا شہر لاہور۔ اپنا گھر، اپنے لوگ..... وہی روز میں میں اس قدر اُداس ہوگئی تھی کہ جی چاہ رہا تھا فوراً واپس چلی جاؤں۔ مگر میں تو سمندر پار ہزاروں میل دور تھی۔ ایک دم سے مجھے رونا آگیا حالانکہ میں پہلے بھی کئی بار احمد کے بغیر دوسرے شہروں میں جا چکی تھی مگر اب احمد مجھے بہت یاد آرہے تھے۔ میں نے بے بسی سے آنکھیں موند

لیں۔ سنٹرل پارک میں موجود تالابوں کے کنارے آفتابی غسل سے لطف اندوز ہوتے سینکڑوں جوڑے خیالات کی پہلی تصویر کی طرح چھم سے میری پلکوں تلے آگئے..... اُفوہ..... مجھے اُبکائی سی آگئی۔

میں نے دوبارہ پلکیں بند کیں تو نیویارک کے عجائب خانوں کی پوری فہرست ایک ایک کر کے جھلک دینے لگی۔ یہ میوزیم چھوٹے بڑے ملا کر تقریباً چونسٹھ بنتے ہیں جن میں میوزیم آف آرٹ، مصری گیلریاں، لنکن سنٹر جو نیویارک کا معروف ترین مقام ہے جہاں گانے بجانے، اوپرا، تھیٹرز بیلٹ اور اسکول آف میوزک واقع ہے۔ نیویارک پبلک لائبریری اور عظیم الشان آڈیٹوریم..... اور..... اور اِلامک آرٹ گیلریاں..... آنکھوں تلے چلتے مناظر تھم گئے اور دل کی دھک دھک بھی ہلکی پڑنے لگی۔

مس ایلینا جو ہمیں گائیڈ کرتی کرتی اور معلومات فراہم کرتی ہوئی ہمارے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ وہ بھی وہاں آکر ٹھہر گئی تھی اُس نے ہمارے چہروں کی طرف بڑی گہری نظروں سے دیکھا تھا۔ پھر وہ معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ''یہ سب تو آپ ہی کی تاریخ ہے۔ آپ ہی کا اثاثہ ہے اِس سے تو آپ مجھ سے زیادہ واقف ہوں گے.....''

وہ ایک گیلری میں اسلامی خلفاء اور بادشاہوں کے استعمال شدہ قالینوں کے انبار کے سامنے موجود ہم سے مخاطب تھی۔ جب ہم سب ایک دوسرے سے نظریں چُرانے لگے تو وہ ہی کہنے لگی اور ہم سننے سے زیادہ دیکھنے میں محو ہوگئے کہ وہ نادر اور قیمتی اثاثے قابلِ دید ہی تھے۔ اس قدر حسین اور خوش نما کہ سینکڑوں سال گزر جانے کے باوجود اپنی آب وتاب میں جواب نہیں رکھتے تھے۔ یہ قالین عباسیوں، سلجوقیوں اور تاتاریوں کے نایاب تحفے ہیں۔ اِسی گیلری سے منسلک ایرانی، عراقی و سلجوقی بادشاہوں کے سامانِ آرائش کے لیے ایک گیلری مختص کر دی گئی ہے جہاں ہزاروں نمونے رکھے ہوئے ہیں جس میں چمک دار دھات کے گلدان، ظروف، پیچوان، قلم دان اور ہاتھی دانت کے چوبی، منقش شاہکار موجود ہیں۔ یہاں وہ ٹائلیں بھی محفوظ ہیں جو ان کے محلات میں استعمال کی جاتی تھیں جن کی چمک دمک آج بھی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ چاندی سونے کے ظروف بھی موجود ہیں۔ یعنی قطار اندر قطار مسلمانوں کے شاندار ماضی کے نادر نمونے چنے ہوئے ہیں اور ہر ایک کے ساتھ ان کی تاریخ حصول اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مقام بھی موجود ہے۔

میں نے دیکھا تھا میرے اور تنویر فاطمہ کے ساتھ ساتھ ہر پاکستانی مرد و خاتون کا چہرہ اس وقت عجب فخر و انبساط کے ساتھ دمک رہا تھا۔ اور..... اور وہیں پر موجود ایک شوکیس کے سامنے جا کر تو ہمارے پیر اور دھک دھک کرتا دل دونوں ہی پتھر ہو گئے تھے۔ وہاں پر قرآنِ پاک کے قلمی نسخہ جات قرینے اور تہذیب سے سجائے گئے ہیں۔ اِن میں کوفی رسم الخط کے بیشتر نمونے ہیں جبکہ چند کلامِ پاک طلائی تحریر میں بھی ہیں۔ ان کی سجاوٹ میں احترام کا انتظام دیکھ کر مجھے بے حد حیرت بھی ہوئی کہ کیا یہ وہی امریکی ہیں جو اپنے سیاسی ایجنڈوں میں اسلام کی جڑیں کاٹنے میں رات دن مصروفِ عمل ہیں اور توہینِ قرآن و رسالت کرنے والی قوموں کا پورا ساتھ دیتے ہیں۔

میری نظروں نے عقیدت بھری نظروں سے ان نسخوں کو چوم لیا اور تب سے اب تک میری پلکیں خوش بختی کے احساس اور ادب سے جھکی ہوئی ہیں، دل سے بار بار اِک مُدھری آواز آتی ہے.....

''یٰسین!''

مجھے لگا اس سے آگے کوئی نظارہ کوئی اور یاد باقی نہ رہی تھی۔ حالانکہ وہاں سے نکل کر ہم لوگ وَال اسٹریٹ بھی گئے تھے مگر میری یادداشت کے پَر اس سے آگے جَل چکے تھے۔

میں اس وقت مسز بدر کے بتائے ہوئے نفسیاتی حربے کے ذریعے اپنے ڈپریشن کا علاج کر رہی تھی اور اپنے دماغ کو اُداسی اور الجھن سے چھڑانے کے لیے دن بھر کی اچھی باتیں یاد کر رہی تھی تاکہ ریلیکس ہو جاؤں۔ مگر میرا دل تو اور بھی بے قرار ہو گیا تھا۔ احمد کی یاد بھی اس خیال کے آگے ماند پڑ چکی تھی اور مجھے اُس کی یاد بے طرح سے آ گئی تھی جس سے بچھڑے ہوئے مجھے برسوں ہی بیت گئے تھے۔ اس رات مجھے نیند نے بہت ستایا سکون کی گولیاں پھانکنے کے باوجود وہ مجھ سے رُوٹھی ہوئی تھی۔ رات کا تیسرا پہر بھی ڈھلنے کو تھا۔ تنویر فاطمہ بھی سیر سپاٹے سے واپس آ کر سو گئی تھی مگر میں ہنوز جاگ رہی تھی۔

اگلے روز ریہرسل تھی۔ پاکستان سے آنے والے وفود کے لیے ہوٹل کا ایک کانفرنس ہال مخصوص کیا گیا تھا۔ میں اپنی فاؤنڈیشن کی ممبران کے ساتھ وہاں پہنچی تو ہم سے پہلے کئی اور

این جی اوز کی نمائندہ خواتین، سماجی بہبود اور خواتین کی وزیر صاحبہ جبکہ وفاقی وزیرِ تعلیم اور ان کے ساتھ کئی دانشور خواتین بطور مبصر بھی موجود تھیں اور ہمارے ملک کی معروف قانون دان اور وکیل خواتین بھی جو یو۔این۔او کی ممبر بھی تھیں۔ ان سب کو اسٹیج پر موجود دیکھ کر مجھے ایک لمحے کے لیے تو ذرا احساسِ کمتری بھی محسوس ہوا مگر دوسرے ہی لمحے میرا وہ احساسِ کمتری احساسِ تفاخر میں تبدیل ہو گیا جب وزیر سماجی بہبود نے مجھے پکارا۔

''ارے آئمہ احمد! آپ وہاں کہاں بیٹھ رہی ہیں آپ یہاں آیئے اُوپر.....'' اگلے کچھ لمحوں میں مَیں اُن کے برابر بیٹھی تھی۔ کچھ ہی دیر کے بعد کل کو ہونے والی خواتین کی پانچویں عالمی کانفرنس میں ہماری شرکت، ایجنڈا اور حکمتِ عملی کیا ہو گی.....؟ کی ریہرسل شروع ہو گئی۔ مجھے اس بات کی بھی خوشی تھی کہ آج کے پروگرام کو تنویر فاطمہ کنڈکٹ کر رہی تھی۔ یہ میری فاؤنڈیشن کے لیے اعزاز کی بات تھی۔ وہ بتا رہی تھی۔

''ڈیئر لیڈیز! آپ کو یہ تو علم ہے کہ اس سے پہلے بیجنگ میں ہونے والی کانفرنس کا ایجنڈا کیا تھا؟ یہ اب کل ہونے والی کانفرنس بلاشبہ اُسی ایجنڈے کے رزلٹ کو ڈسکس کرنے کے لیے رکھی گئی ہے۔'' پھر اُس نے بنیادی معلومات فراہم کرنے کے بعد وزیر بہبود آبادی اور خواتین کو دعوت دی کہ وہ اس ایجنڈے کے تحت ہونے والے کاموں کا ایک جائزہ پیش کریں۔

انہوں نے بغیر کسی تمہید کے بات شروع کر دی تاکہ وقت ضائع نہ ہو۔

''آپ سب یہ تو جانتی ہیں کہ خواتین کی اصلاح و ترقی کے لیے چھ برس قبل حکومتِ وقت نے ایک ''خواتین تحقیقاتی کمیشن'' ترتیب دیا تھا جس کے تحت بے شمار اقدامات ہوئے ہیں۔

اب ہم جس عنوان کے تحت یہاں جمع کیے گئے ہیں وہ بھی آپ لوگوں کو معلوم ہے۔ اب یہ کانفرنس ''اکیسویں صدی کی خواتین کے لیے صنفی مساوات، امن اور ترقی'' کے عنوان سے ہے، اُسی کام کو آگے بڑھانے کے لیے ہے۔'' انہوں نے بڑی تفصیل سے بتایا کہ چھ برس قبل والے ایجنڈے کے تحت ہمارے ملک میں بہت سی این جی اوز وجود میں آئیں۔ فیملی پلاننگ کو بھی ہمارے ہاں بہت زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ جگہ جگہ بہبودِ آبادی سنٹر کھل چکے ہیں۔ مانع حملِ ادویات بھی ملکِ عزیز میں عام ہو چکی ہیں۔ ماڈرن ازم کے فروغ کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیے ہمارا میڈیا بھرپور کردار ادا کر رہا ہے۔ ہم اپنی عورتوں کو نہ صرف گھروں سے باہر لا چکے ہیں بلکہ وہ وطن کی ترقی کے لیے مردوں کے شانہ بہ شانہ ہر شعبۂ زندگی میں کام کر رہی ہیں یہاں تک کہ اب ہمارے ہاں بینک، پولیس اور ٹریفک پولیس تک میں خواتین کا کردار مثالی ہے۔ مگر ابھی ہمیں بہت کام کرنا ہے۔''

اُن کے بعد وزیرِ تعلیم نے نوجوان نسل میں جنسی تعلیم کی اہمیت اور فروغ کے لیے کیے گئے اقدامات پر بات کرتے ہوئے کہا:

''افسوس! لوگوں پر آج بھی روایتی اور بے جا شرم طاری ہے اور وہ اس موضوع پر بات کرتے ہچکچاتے ہیں حالانکہ ایڈز جیسے خطرناک مرض سے بچنے کے لیے جنسی تعلیم از حد ضروری ہے۔ افسوس تو اِس بات پر بھی ہے کہ ہماری عورتیں اپنے تولیدی حقوق اور جنسی صحت سے متعلق اُمور سے آج بھی بے بہرہ ہیں حالانکہ یو۔ این۔ او نے غیر حکومتی تنظیموں کو یہ ذمہ داری سونپی تھی کہ وہ معاشرے میں ایسی عوامی بحث کا آغاز کریں اور باقاعدہ مہم چلائیں جس سے اس موضوع پر کھلے عام بات چیت ہو سکے اور عوام رویوں میں لچک آئے، نئے تصورات جنم لیں.....''

انہوں نے این۔ جی۔ اوز کا ذکر کرتے ہوئے ایک کڑی سی نظر مجھ پر بھی ڈالی تھی جو مجھے بالکل اچھی نہ لگی تھی۔ مجھے یہ خاتون ویسے بھی اچھی نہ لگتی تھی۔ بہت ہی کھلی باتیں بڑی سہولت سے کر لیا کرتی تھی۔ لبرل کہلانے والی اِس عورت کے بارے میں معاشرے میں کئی افسانے گردش کرتے رہتے تھے۔

اب مجھے ان بڑی بڑی بیگمات کی آزاد خیالی کے اظہار سے کوفت ہو رہی تھی۔ فُل ایئر کنڈیشنڈ یخ بستہ اس کانفرنس ہال میں میرا دَم مارے حبس اور گرمی کے گھٹنے لگا تھا لیکن میں پھر بھی وہاں بیٹھنے پر مجبور تھی۔ اب محترمہ قانون دان صاحبہ مسلم گھرانوں کے عائلی قوانین کو ظالمانہ قرار دے کر ان میں ترامیم کرنے کا عزم لے کر آئی تھیں۔ وہ اکیسویں صدی کی عورت کے لیے ترقی اور امن کے نام پر ہر فورم پر ان کی ۵۰ فیصد نمائندگی، اسقاطِ حمل کا حق، تولیدی خدمات اور گھریلو خدمات پر معاوضہ طلب کرنا، ہم جنس پرستی کو قانونی جواز فراہم کرنا اور شوہر کے ہاتھوں ازدواجی عصمت دَری اور مساواتِ مرد و زن کے حقوق مانگ رہی تھیں۔

مجھے جانے کیوں آج یہ ساری باتیں، ساری ڈسکشن کچھ اچھی نہ لگ رہی تھی حالانکہ اِس سے پہلے کھٹمنڈو اور بنکاک میں خواتین کے حقوق پر اِسی ایجنڈے کی کانفرنسیں اٹینڈ کر چکی تھی۔ تب تو مَیں بڑی گرم جوش تھی۔ مگر اب شاید احمد کی کمی میرے حواسوں پر بُری طرح سے طاری ہو چکی تھی جس سے میرے اعصاب شل ہو رہے تھے۔ میرے سر میں اب بھی شدید دَرد ہو رہا تھا یہاں تک کہ مجھے سخت چکر آنے لگے اور میرا جی متلانے لگا۔

''ایکسیوزمی لیڈیز.....'' بالآخر مجھے وہاں سے معذرت کر کے اُٹھنا ہی پڑا..... میں تیزی سے بھاگتی ہوئی واش رُوم کی طرف لپکی۔ میرا متلاتا ہوا جی بے اختیار اُلٹ گیا اور پھر میں ہونے والی قے سے اتنی بے دَم ہو گئی کہ وہیں واش رُوم سے باہر چند قدم کے فاصلے پر ہی لڑکھڑا گئی۔

❀❀❀

عین کانفرنس کے روز میری طبیعت بے حد بگڑ گئی اور طبیعت سے کہیں زیادہ ہمارے وفد کا مزاج..... مجھے اِتنا پروٹوکول دینے اور میرے قدم کے ساتھ قدم ملا کر چلنے والی وہ تنویر فاطمہ جسے میری فاؤنڈیشن میں آئے جمعہ جمعہ چار دن ہی ہوئے تھے وہ بھی بڑے روکھے انداز میں پیش آ رہی تھی۔

''میڈم اگر ایسا کوئی مسئلہ تھا تو آپ وہیں رہتیں اِتنا لمبا سفر نہ کرتیں، آپ کی جگہ کوئی اور ممبر آ جاتیں۔'' وہ مجھے مُورِدِ الزام ٹھہراتی جانے کس مسئلے کی بات کر رہی تھی۔

''اور کیا..... یہ کوئی سیر و سیاحت یا شاپنگ کا ٹرپ تو تھا نہیں نہ ہی کوئی فلمی میلہ تھا۔ ایک بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت سے پہلے تمہیں کچھ تو سوچنا چاہیے تھا.....''

وکیل صاحبہ تو بہت ہی اُکھڑی ہوئی تھیں اور میں پریشان سی اُن سب کے چہرے تک رہی تھی۔

''تم کم از کم اپنی ڈاکٹر سے تو اجازت لے لیتیں یا مشورہ تو کر لیتیں کہ ایسی حالت میں تمہیں سفر کرنا چاہیے بھی یا نہیں۔ وہ بھی ہزاروں میل کا۔''

''کیا طبیعت کی خرابی اتنا بڑا مسئلہ ہے؟ کیوں مجھے اتنی باتیں سنائی جا رہی ہیں؟'' تنگ آ کر میں چیخ ہی پڑی۔ میں جو کانفرنس ہال کے باہر چکرا کر گر گئی تھی اور اب مجھے ہسپتال

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے فرسٹ ایڈ دینے کے بعد اپنے کمرے میں شفٹ کیا گیا تھا تب سے یہ ساری خواتین مجھ پر پل پڑی تھیں۔

''کیا مطلب مسئلہ.....؟'' وزیرِ بہبود آبادی نے مجھے بڑے طنز سے پوچھا۔

''تمہارے خیال میں یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں..... میں تو یہ سوچ کر ہی روہانسی ہو رہی ہوں کہ ہماری یہاں پر کس قدر سبکی ہوگی جب سب کو پتہ چلے گا کہ بہبودِ آبادی کا نصب العین رکھنے والی ہمارے ملک کی سب سے بڑی اور اب تو انٹرنیشنل لیول کی فاؤنڈیشن کی آل پاکستان صدر تو خود ماں بننے والی ہیں۔''

وہ کمرے میں بے چینی سے ٹہلتی ہوئی مجھے اور کتنا بُرا بھلا کہہ رہی تھیں میں نے آگے کچھ نہیں سنا۔ میری سماعتیں تو ''ماں بننے والی ہیں'' پر ہی ساکت ہو چکی تھیں۔

''میں.....اور ماں.....'' یہ خبر ایک جلترنگ کی طرح سے میرے لہو میں سرایت کر چکی تھی اور اب میری پور پور سے نغمے پھوٹ رہے تھے۔ میری دھڑکنیں جھومتیں اور لب اک دوسرے سے مل کر لفظ ''ماں'' ادا کرتے تو زندگی میری رگ رگ میں خوشی بن کر دوڑنے لگتی۔ میرے دل و جاں یہی سرگوشیاں کر رہے تھے اور میری ہر سانس کان بنی بس یہی سن رہی تھی۔ میری سماعتوں میں باہر کی کسی بھی صدا کے ٹھہرنے کی کوئی جگہ نہ رہی تھی۔ میں تھی کہ خود کو مبارکبادیں دیتی نہ تھک رہی تھی۔ لگتا تھا کائنات کا ذرہ ذرہ کہہ رہا ہے ''مبارک ہو، مبارک ہو!''

تنویر فاطمہ کیا کہہ رہی تھی اور اس کے ساتھ وہ ساری وزیر و مشیر اور بیگمات میرے بارے میں کیا کچھ فرما رہی تھیں مجھے کچھ سنائی نہ دے رہا تھا۔ بس میری آنکھوں نے اتنا ہی دیکھا کہ وہ ساری جلد ہی میرے کمرے سے رُخصت ہو گئی تھیں اور میں نے شکر کیا تھا۔ اب تو میرا دل خود بھی یہ کانفرنس اٹینڈ کرنے کو نہ چاہ رہا تھا۔ بس یہ تمنا تھی کہ مجھے پنکھ لگ جائیں اور میں اُڑ کر احمد کے پاس پہنچ جاؤں.....اور اُنہیں یہ خوش خبری سنا دوں۔

میں نے یہ خیال آتے ہی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مگر پھر میرے ہاتھ رُک گئے، یہ سوچتے ہی کہ اتنی دُور سے اتنی بڑی خوش خبری دوں گی تو خاک مزا آئے گا۔ یہ بات تو میں اُنہیں خود رُو برو ہو کر بتاؤں گی، اور پھر اُن کے چہرے پر بکھر جانے والے رنگوں کو قریب سے دیکھوں گی۔ فون پر تو وہ یہ خبر پا کر بے بس ہو جائیں گے۔ میرے انتظار میں ان کا اک اک

پل قیامت بن جائے گا۔

میں آنکھیں موندے خیالوں کی دنیا میں کھوئی کہاں سے کہاں پہنچ چکی تھی!

''عمید.....'' خود بخود لبوں سے نکلا اور اُس کا معصوم سراپا میری نگاہوں میں اُتر گیا۔ اُس کی آنکھیں.....اُس کی ناک.....اُس کے پھولے ہوئے گلابی گال اور نرم نرم اُنگلیوں والے ہاتھ..... جب وہ پیدا ہوا تھا تو کیسا روئی کا گولا سا تھا۔ میرے دل میں اُس کا پہلے دن والا سراپا چٹکیاں لینے لگا۔ کیا وہ بھی ایسا ہی ہوگا؟ میں نے خود سے ہی پوچھا۔

''اس سے بھی پیارا..... بے حد خوبصورت..... بالکل تمہارے جیسا.....'' میں نے اک زعم سے خود کو جواب دیا۔ اس وقت مشابہت دیتے ہوئے میں نے احمد کو بھی نظر انداز کر دیا تھا۔ میں نے اپنے وجود کو بڑے ہی لاڈ سے اپنی بانہوں میں سمیٹا جیسے وہ میری گود میں ہو۔

اب میں کیا کروں؟ کس طرح سے وقت گزاروں۔ ہماری واپسی کی سیٹیں تو مزید ایک ہفتہ بعد کی تھیں جبکہ مجھ پر ایک ایک ساعت برس بن رہی تھی جسے گزارنا میرے لیے انتہائی مشکل اور صبر آزما تھا۔ میں نے تکیے سے سر اُٹھایا اور اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ میری طبیعت پھر سے متلانا شروع ہو گئی تھی۔

''اُف! اب مجھے کون سنبھالے گا۔'' میں نے اُٹھ کر باتھ روم تک جانا چاہا تو نقاہت سے مجھے چکر آ گیا۔ ''میری امی جان!'' بے اختیار ہی میرے لبوں سے نکل گیا۔ مجھے اپنی ماں کی یاد بے طرح سے ستانے لگی۔ ''امی کس قدر خوش ہوں گی جب وہ یہ خوش خبری سنیں گی تو.....'' میں نے تصور میں اپنی ماں کا خوشی سے کھلا چہرہ اور خوشی کے آنسوؤں سے لبریز آنکھیں دیکھیں۔ میں جانتی تھی وہ یہ سنتے ہی مجھے اپنے سینے سے لگا کر بھینچ لیں گی، میری پیشانی پر بوسہ دیں گی اور پھر یہ کہتی ہوئی چل دیں گی..... ''میں پہلے دو نفل شکرانے کے ادا کر لوں یہ سب اُسی کا تو کرم ہے۔''

''شکرانے کے نفل.....؟'' خوشی کے جلترنگ بجاتی میری دھڑکنیں لمحہ بھر کو رُک گئیں۔

''یہ سب اُسی کا کام ہے۔'' لمحہ بھر پہلے ناچتی گاتی دھڑکنوں کا مزاج فوراً ہی بدل گیا۔

''اللہ ہی کارساز ہے۔ وہی رحمٰن ہے..... رحیم ہے اور وہ ہر بات پر قادر ہے۔'' دھڑکنوں کی دھک دھک حمد کرنے لگی اور میرے اندر مچلتے جذبے باادب ہونے لگے۔ ''دو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نفل شکرانے کے.....'' ایک دھڑکن نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ میں بے اختیار اُٹھی اور باتھ رُوم جا کر وضو کرنے لگی۔ جی کا متلانا اور نقاہت کا احساس دونوں ہی پانی ہو کر بہہ گئے۔ میں اپنا دایاں پاؤں دھو رہی تھی جب ایک باریک سی پھانس کا منہ میری اُنگلیوں سے ٹکرایا جس کی انکن سے میرا رُواں رُواں کھڑا ہو گیا۔

''آج کتنے برسوں کے بعد تمہیں خدا کا شکر ادا کرنے کا خیال آیا ہے۔ کس منہ سے اُس کے حضور جاؤ گی.....؟'' اُس پھانس کو پھر سے لب مل گئے۔ میں نے خوفزدہ اور شرمندہ ہو کر اپنا ہاتھ جلدی سے پاؤں کے تلوے سے ہٹایا، جلدی جلدی دوسرا پاؤں دھویا اور باتھ روم سے باہر آ گئی۔ میں اِدھر اُدھر جائے نماز تلاش کرنے لگی جو مجھے کہیں نہ مل رہی تھی۔ میں بھول گئی تھی کہ میں امریکہ میں ہوں۔

میں بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگی۔ پھر میں نے بستر کی چادر کو گھسیٹ کر زمین پر بچھا لیا۔

''قبلہ کس طرف ہوگا؟'' میں نے پریشان ہو کر چادر سے نیچے قدم رکھے۔ ''کس سے پوچھوں؟'' اگر تم نے جائے نماز پر کھڑے ہونے کا ارادہ کر ہی لیا ہے تو وسوسوں میں مت پڑو۔ ریسیپشن پر فون کر کے پوچھ لو۔ گورے لاکھ مسلمانوں کے دشمن سہی مگر مسلمانوں کے عقائد کی سب خبر انہیں ہے۔'' میرے قدم خود بخود اٹھے اور میں دوبارہ فون کی طرف بڑھ گئی۔ قبلہ رُخ کی معلومات لیں اور دو نفل کی نیت سے کھڑی ہو گئی مگر پھر نفل کی بجائے فرض نماز کی نیت ہی باندھ لی کہ اِس وقت ظہر کی نماز کا وقت بھی ہو رہا تھا۔ پہلے نماز ادا کی اور پھر دو نفل شکرانے کے۔ دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے تو پتھر ہو گئی۔ اندر باہر کی ساری آوازیں کہیں کھو گئیں، اور میں لاچار و بے بس۔ گونگی اور بہری، ایک بے جان مٹی کے بھربھرے بت کی طرح سے گر گئی۔ میری پیشانی زمین سے جا لگی، اور ساری دھڑکنیں، سارا لہو پانی ہو کر آنکھوں سے خارج ہونے لگا۔

''میرے اللہ.....میرے اللہ!'' ہر قطرے کا ایک ہی مفہوم تھا۔ میں کچھ اور کہہ ہی نہ پا رہی تھی۔ میرے لب سِل چکے تھے اور دل و دماغ ماؤف ہو چکے تھے۔ میں کوئی دعا نہ مانگ رہی تھی۔ بس میرا اندر کُھر چا جا رہا تھا اور میرے وجود کا کونہ کونہ چھل رہا تھا۔ میں آئمہ احمد

حسن.....اتنی بے بس، اتنی حقیر.....اتنی معمولی.....کیا تھی میں.....؟ کچھ کہنے اور سننے کی صلاحیت بھی اپنی مرضی سے نہ رکھتی تھی۔

آج اُس نے مجھے بے مایہ ہونے کا احساس دے دیا تھا!

❀❀❀

احمد مجھے ائیر پورٹ پر لینے آئے ہوئے تھے۔ میں انہیں دیکھتے ہی اُن کی طرف یوں لپکی جیسے برسوں کے فراق کے بعد مل رہی ہوں۔ مگر پھر ان کا چہرہ دیکھتے ہی جیسے ایک اور خیال میرے سارے جسم میں سنسنا گیا۔ وہ خیال جسے اب تک کی خوشی اور بے تابی میں ذہن سے گزرنے کا موقع ہی نہ ملا تھا.....

احمد کو میں بتاؤں گی کیسے؟

میرے جھوٹ کا پول کھل جائے گا.....میں ان کی نظروں میں گر جاؤں گی.....ہمیشہ کے لیے! وہ اعتبار، وہ یقین.....وہ اندھا اعتماد.....سب ریزہ ریزہ ہو جائے گا.....اور اعتبار ٹوٹتا ہے تو محبت بھی تو کرچی کرچی ہو جاتی ہے!

میں سخت خوفزدہ ہو گئی.....احمد کو کھو دینے کا خوف ایک بار پھر میرے وجود پر طاری ہونے لگا۔

نہیں! میں ان سے معافی مانگ لوں گی۔ ہاتھ جوڑ کر.....اپنی اَنا کو پرے پھینک کر.....وہ یقیناً مجھے معاف کر دیں گے.....اور پھر خوشی بھی تو اتنی بڑی ہے۔

یہ سوچ آتے ہی میرے قدموں میں پھر جان آ گئی۔ ائیر پورٹ سے کچھ ہی دیر میں ہم فارغ ہو گئے۔ اِس بار میں نے نیویارک سے کچھ بھی شاپنگ نہ کی تھی حالانکہ میرا پروگرام بھی تھا اور میرے پاس شاپنگ کے لیے اچھا بھلا بجٹ بھی۔ لیکن اِس بار مجھے وہاں کچھ بھی اچھا نہ لگا۔ لگتا بھی کیسے.....اِس بار تو مجھے ایسی قیمتی متاع حاصل ہو گئی تھی جس کے سامنے دنیا کی ہر شے بے حیثیت اور بے مایہ تھی۔

''کیا بات ہے اِس بار تمہارا دل نہیں لگا.....اور طبیعت کو کیا ہوا؟'' ائیر پورٹ سے باہر آتے ہی احمد مجھے پوچھنے لگے۔ میں نے اپنی واپسی کی سیٹ جلد کروالی تھی اِس لیے میں تنہا ہی واپس آ گئی تھی۔ باقی سب ابھی وہیں تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ہاں بس میرا دل نہیں لگا۔'' میں نے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

''تو ہماری یاد نے تمہارا چین چُرائے رکھا وہاں بھی.....'' مجھے اپنی طرف یوں دیکھتا پا کر احمد شوخی سے بولے۔

''آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔'' میں نے فوراً اقرار کر لیا اور آج تو ویسے بھی میرا جی سچ کے سوا کسی بات پر مائل نہ تھا۔ ویسے بھی اب جو سچ میں بولنے جا رہی تھی اس کے بعد مجھے شاید عمر بھر کبھی جھوٹ بولنے کی حاجت رہنی بھی نہ تھی۔

''سچ کہوں میں بھی بے حد اُداس رہا۔ تمہاری یاد پہلے کبھی اتنی نہیں آئی جتنی اس بار..... میں نے تو کئی بار چاہا کہ تم سے کہوں چھوڑو سب کچھ آجاؤ واپس۔ تم نے بھلا کانفرنسوں سے کیا لینا ہے تمہارے لیے میں جو ہوں۔ تمہیں اور کسی مصروفیت کی ضرورت تو ہونی ہی نہیں چاہیے۔'' وہ اپنے حق سے ایسا کہہ رہے تھے مگر آج مجھے اِس حقیقت کو تسلیم کرنے میں کوئی حُجت نہ تھی۔

''اب یہی ہوگا.....'' میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''تو کیا اپنے عہدے سے مستعفی ہو کر آئی ہو؟'' وہ مذاق سے پوچھ رہے تھے مگر مجھے لگ رہا تھا انہیں سب خبر ہے۔ وہاں جو کچھ بھی ہوا۔ تو کیا انہیں وہ خبر بھی مل چکی ہے جسے بتانے کے لیے مجھ سے صبر کرنا مشکل ہو رہا ہے؟ میں سمجھی! فرحت نے احمد کو فون کر کے ساری باتیں بتا دی ہوں گی۔

''ارے بھئی پریشان کیوں ہو رہی ہو میں تو مذاق کر رہا تھا۔'' انہوں نے میرے چہرے پر پریشانی کا سایہ دیکھ لیا تھا۔

''اچھا بتاؤ تمہیں ہوا کیا تھا۔ طبیعت کیوں خراب ہو گئی تھی وہ بھی اتنی کہ تم فوراً واپس آ گئیں۔'' انہوں نے یونہی پوچھا تھا مگر میرا دھڑکتا دل سینے کی دیواروں سے لگ گیا تھا۔ چپ..... حیران..... اور پریشان..... اب تو مجھے یقین ہونے لگا تھا کہ وہ سب جانتے ہیں۔

''وہ..... وہ..... میں.....'' میں نے چاہا کہ کچھ کہوں مگر انہوں نے مجھ سے پہلے کہنا شروع کر دیا۔

''دراصل میں نے پرسوں فون کیا تو تمہارا موبائل تنویر فاطمہ نے اُٹھایا۔ اُسی نے بتایا

تھا کہ تمہاری طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ تم شاید بے ہوش ہو گئی تھیں اور تمہیں ہسپتال لے کر جانا پڑا تھا۔''

''اور..... اور کیا بتایا تنویر نے.....؟'' میں نے نظریں جھکاتے ہوئے پوچھا۔

''اور تو کچھ نہیں بس اتنا کہا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں ایسی حالت میں ایسا ہو ہی جایا کرتا ہے اور بس.....'' وہ سادگی سے بولے۔ پھر انہوں نے یہ بھی نہ پوچھا کہ ''کیسی حالت میں'' تو میں نے سکون بھری سانس لی کہ انہیں مزید کوئی خبر نہیں ملی۔ میں دراصل احمد کو یہ بات بتانے سے پہلے مہ نور سے مل کر تصدیق کرنا چاہتی تھی۔ ابھی میرے جی کو بے اعتباری تھی۔ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ یہ حقیقت نہ ہو بلکہ میں ایک گداز سے خواب کی بُکل میں ہوں۔ اور اگر یہ سچ ہی تھا تو پھر میں اُس کے دلائی ہوئی اس پانچ فیصد اُمید کے بَر آنے پر اس کا شکریہ ادا کرتی جس کے بار بار سمجھانے پر میں نے اپنا علاج اس سے جاری رکھا تھا اور جس کی خبر احمد کو نہ تھی۔ میں علاج تو کرا رہی تھی مگر مجھے اُمید نہ تھی۔

''کہاں کھو گئیں؟'' مجھے یوں گم صُم پا کر احمد نے چٹکی بجا کر مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔

''جی..... جی کچھ نہیں۔'' میں نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا۔

''مومی!''

''جی.....'' میری پلکیں اُن کی طرف اُٹھیں۔

''میں نے ''عمید'' کو اپنانے کے لیے سارے لیگل پیپر بنوا لیے ہیں۔ اگر تم آج ان پر سائن کر دو تو ہم آج ''صاحب اولاد'' ہو جائیں گے.....''

انہوں نے بڑی خوشگواری سے کہا مگر مجھے ان کا اک اک لفظ نوکدار کنکر کی طرح لگا۔ جی چاہا ابھی انہیں سب بتا دوں اور کہوں کہ اب اس کی ضرورت نہ پڑے گی۔ مگر میں اس وقت مصلحتاً چُپ کر گئی۔ میں احمد کو یہ بات بڑے اچھے ماحول اور موڈ میں بتانا چاہتی تھی اور وہ بھی تصدیق کے بعد۔

''احمد! ہم یہ بات آرام سے بیٹھ کر کریں گے.....'' میں نے بھی سکون سے انہیں جواب دیا۔

''ٹھیک ہے بیگم صاحبہ۔ ویسے گھر میں سب ''عُمید'' کو ہمارا بیٹا مان چکے ہیں۔ تم بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ذرا اُسے اُسی محبت سے ملنا جیسے مائیں اپنے بچوں سے ملتی ہیں۔"

"جی بہتر....." نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے مختصراً جواب دیا حالانکہ میرا دل چاہ رہا تھا اب میں گھر جانے کی بجائے امی کی طرف چلی جاؤں اور وہیں سے ساری باتیں کر کے احمد کے ساتھ واپس گھر آؤں۔ مگر اب تو ایسا ممکن نہ تھا، ہم گیٹ پر پہنچ چکے تھے۔

❁❁❁

گھر میں داخل ہوتے ہی میں نے دیکھا سب لوگوں نے میرا بڑی محبت اور گرمجوشی سے اِستقبال کیا تھا۔ نادرہ آنٹی واپس کینیڈا جا چکی تھیں اور اماں جان کا موڈ بھی بے حد اچھا تھا ورنہ وہ میرے نیویارک تنہا جانے پر سخت برہم تھیں۔

دوپہر کا کھانا آج سب لوگ اکٹھے کھا رہے تھے۔ میں نے ابھی چند لقمے ہی لیے تھے کہ میرا جی پھر متلانے لگا۔ اتنا کہ میں بے اختیار ہو کر باتھ روم میں گھس گئی۔ پھر تو مجھے پے در پے اتنی اُلٹیاں ہوئیں کہ میں نڈھال ہو گئی۔ میری حالت دیکھ کر سارے گھر والے ہی پریشان ہو گئے مگر سب سے زیادہ پریشانی احمد کے چہرے پر تھی۔

"کیا کھایا تھا فلائٹ میں.....؟" وہ مجھ سے فکرمندی سے پوچھ رہے تھے۔

"کچھ بھی نہیں۔ صرف سُوپ لیا تھا۔" پھر میں نے بتایا کہ چار پانچ روز سے مجھے کچھ بھی ہضم نہیں ہو رہا، ایسی ہی حالت ہے۔

"لگتا ہے شدید قسم کی فوڈ پوائزننگ ہے۔ میں ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں۔" وہ مجھے بیڈ پر لٹا کر مجھ پر کمبل ڈالتے ہوئے بولے۔ مجھے سردی بھی لگ رہی تھی۔

"احمد! میں ٹھیک ہوں۔ شاید لمبے سفر اور بے آرامی کی وجہ سے ایسا ہے۔ آپ ڈاکٹر کو نہ بُلائیں۔"

"ٹھیک ہے تم آرام کرو پھر دیکھتے ہیں۔"

شام تک میری طبیعت ذرا سنبھلی تو میں ڈاکٹر مہ نور کے پاس آ گئی۔ احمد نے مجھے تنہا نہ آنے دیا تھا وہ میرے ساتھ آئے تھے۔ میں نے بھی بہتر یہی سمجھا کہ واقعی اگر کوئی خوش خبری ہے تو احمد اپنے کانوں سے ڈاکٹر کی زبانی ہی سنیں، اس طرح انہیں زیادہ خوشی ہو گی۔ احمد باہر ویٹنگ رُوم میں ہی تھے اور میں اندر مہ نور کے پاس..... مہ نور نے میرا مکمل چیک اَپ کیا۔ وہ

بے حد خوش تھی۔ اُس نے مجھے گلے سے لگا کر پیار کرتے ہوئے مبارکباد دی۔

"میں نے کہا تھا ناں۔ ہم ایک فیصد اُمید پر بھی پورا بھروسہ رکھتے ہیں، اور پھر اللہ کے لیے کیا ناممکن ہے۔ وہ تو بس "کُن" کہتا ہے اور ہو جاتا ہے۔"

"جاؤ جا کر اپنے رب کے شکرانے ادا کرو..... اور بلاؤ ذرا احمد بھائی کو..... میں اُنہیں یہ خبر خود سناتی ہوں۔"

وہ خوش ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد جذباتی بھی ہو رہی تھی۔ اُس نے پیغام باہر بھجوایا اور پھر مجھے سمجھانے لگی۔

"آئمہ! تمہیں بے حد احتیاط سے کام لینا ہو گا اور اپنا بے حد خیال رکھنا ہو گا۔ جس نعمت سے اللہ تمہیں نواز رہا ہے وہ اب بھی تمہارا صبر آزمائے گی۔ ہمیں بے حد خیال کے ساتھ یہ وقت گزارنا ہو گا۔ رسک ابھی بھی ہے۔" وہ مجھے میڈیکل کے نقطہ نظر سے وہ پیچیدگیاں سمجھا رہی تھی جو میرے وجود میں اب بھی موجود تھیں۔

"تم نے مکمل بیڈ ریسٹ کرنا ہے۔ کسی ٹینشن کو خود پر طاری نہیں ہونے دینا۔ کچھ دوائیں لینی ہوں گی۔ پہلے پہل تمہیں ہر پندرہ روز کے بعد آنا ہو گا..... پھر ماہانہ....."

تبھی احمد اندر داخل ہوئے۔ "خیریت تو ہے ڈاکٹر صاحبہ!" انہوں نے آتے ہی پوچھا۔

"ستے خیراں نیں احمد بھائی!" ڈاکٹر مہ نور نے مسکراتے ہوئے جواب دیا وہ اکثر بہت موڈ میں ہوتی تو اپنی مادری زبان پنجابی بولنے لگتی۔

"مبارکاں ہون..... مٹھائیاں شٹھائیاں منگواؤ۔"

انہوں نے میری رپورٹس احمد کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا جنہیں پکڑتے ہوئے احمد بے حد حیرانی سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

"جی جناب! آپ دونوں والدین بننے والے ہیں۔ اللہ نے آئمہ کی کوکھ کو اپنی رحمت سے اولاد جیسا گوہر عطا کر دیا ہے۔"

ڈاکٹر مہ نور نے بڑے سلیقے سے اُنہیں خوش خبری سنا دی۔

"آئمہ کو..... مگر کیسے.....؟" وہ بے یقین تھے۔ اُن کے چہرے پر خوشی کی سُرخیاں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوڑنے کی بجائے زرد پریشانیاں ڈیرے ڈال چکی تھیں۔

''بس اللہ کی رحمت ہے جب ہو جائے۔ آئمہ میں تو ماں بننے کی صلاحیت پہلے بھی تھی بس یہ یونہی پریشان ہوتی رہتی تھی۔'' وہ تو ایک ڈاکٹر کا فرض نبھا رہی تھی احمد کو میرے بارے میں حوصلہ دے رہی تھی مگر احمد کے چہرے کے بدلتے رنگ کو صرف میں دیکھ رہی تھی۔

تو وہی ہوا جس کا ڈر تھا!

میرے دل کی دھڑکن بے حد تیز ہوگئی تھی۔ احساسِ جرم مجھے مارے ڈال رہا تھا۔

''آپ کو یقین ہے ایسا ہی ہے۔'' احمد کا لہجہ سپاٹ ہونے کے ساتھ ساتھ کھردرا بھی تھا۔

''جی..... جی سو فیصد۔ یہ سچ ہے۔'' اُس نے یقین دلایا۔

احمد نے ایک تیز نگاہ مجھ پر ڈالی..... زخم خوردہ، شاکی، دُکھ بھری، اُبلتی ہوئی..... اُف! وہ کیسی نگاہ تھی! بے حد انجانی اور اجنبی..... جس کی میں تاب نہ لا پا رہی تھی..... میں نے آنکھیں جھکا لیں۔ ان نگاہوں نے آج تک کبھی مجھے یوں نہ دیکھا تھا۔ میں تو ہمیشہ ہی ان سے پھوٹنے والی نرمی اور محبت کی پھوار میں بھیگتی آئی تھی۔

پھر اُس نے احمد سے میرے بارے میں بہت سی باتیں کہیں جنہیں احمد بس ہُوں ہاں کر کے سنتے رہے اب وہ وہاں سے جلد نکلنا چاہ رہے تھے۔

''شکریہ ڈاکٹر صاحبہ!'' انہوں نے مہ نور کا شکریہ ادا کیا اور بغیر میری طرف دیکھے باہر نکل گئے۔ جتنی دیر میں مَیں مہ نور سے مل کر نکلی وہ کوریڈور میں نہ تھے۔ میں تیزی سے باہر کی طرف لپکی۔ دو چار قدموں پر ہی میرے پاؤں میں کچھ چبھ گیا..... اور میں ''اُف۔ اُف۔ اُف'' کرتی ہوئی رُک گئی ایک پاؤں پر زور ڈال کر میں نے دوسرا پاؤں اُوپر اُٹھایا، اپنی سینڈل سے باہر نکال کر جھاڑا۔ میں سمجھی جوتے میں کچھ تھا جو چبھ گیا مگر پاؤں واپس ڈالنے پر وہی چبھن اور اُلجھن تھی جیسے کوئی باریک کانٹا یا کانچ کا ذرّہ..... کچھ تو تھا۔

''احمد.....'' مجھے اس وقت احمد کی فکر تھی میں پاؤں کو نظر انداز کر کے تیزی سے چل دی۔

''حوصلہ کرو..... اب تمہیں صبر اور حوصلے کی سخت ضرورت ہے۔'' میرا پاؤں میرے

کان میں چاپ دینے لگا۔ ''اوہ..... یہ تو وہی آواز تھی۔'' میں ڈر گئی یہ تو خطرے کی گھنٹی تھی۔ یہ تو میرے ساتھ پچھلے دو تین برس سے ہوتا چلا آ رہا تھا۔ یہ اُلجھن تو میرے لیے مصیبت بن گئی تھی۔ یہ منحوس آواز جب بھی مجھے سنائی دی میری زندگی میں کوئی ناکوئی پریشانی آ جاتی۔

''احمد!'' میں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے پھولی ہوئی سانسوں سے اُنہیں بلایا وہ آ کر گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔

انہوں نے ایک بڑی ہی سخت اور شاکی سی نظر مجھ پر ڈالی اور بڑی تیزی سے گاڑی ریورس کی اور گیٹ سے باہر نکال دی۔ وہ خوش ہونے کی بجائے بے حد غصے میں تھے اور خطرناک ڈرائیو کر رہے تھے۔

''احمد پلیز! گاڑی آہستہ چلائیں۔'' میں نے ڈرتے ڈرتے کہا جسے انہوں نے نظر انداز کرتے ہوئے گاڑی کی رفتار آہستہ نہ کی۔ وہ اپنے ہونٹوں کو چباتے ہوئے سخت ذہنی کشمکش کا شکار تھے۔

''احمد! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟'' میں نے وہ سوال پوچھا جس کا جواب میں بخوبی جانتی تھی۔

انہوں نے کوئی جواب دیئے بغیر گاڑی کو تیسرے سے چوتھے گیئر میں ڈال دیا۔ میں اتنی ٹریفک اِتنے رش میں ان کی یہ حرکت دیکھ کر مزید سہم گئی۔ جس بات کو سنتے ہی احمد کا مارے خوشی کے بُرا حال ہونا چاہیے تھا، اُسے سن کر وہ طیش میں آ گئے تھے۔ میرے سر میں ایک دم سے درد شروع ہو گیا۔ میرا دل مارے خوف کے لرز رہا تھا۔

''احمد کا یہ غصہ بجا ہے؟ کیا ایسے موقعوں پر شوہر ایسا رویہ ظاہر کرتے ہیں؟''

میں ان کے دل دُکھانے والے رویے پر رو دینے کو تھی۔

''تم شاید بھول رہی ہو کہ تم نے احمد کے ساتھ کیا کیا تھا۔'' میرے ضمیر نے چٹکی لی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے لڑیں، کھل کر شکوہ کریں، ناراض ہوں۔ پھر میں معافی کی درخواست کروں اور ان کے دل کا غبار دُھل جائے..... مگر ایسا نہ ہو رہا تھا۔ آخر کار میں نے خود ہی ہمت کر کے کہہ دیا ''احمد! خدا کے لیے مجھے معاف کر دیں..... میں نے آپ کو دکھ دیا ہے میں قصوروار ہوں..... مگر غلطی انسانوں سے ہی ہوتی ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''غلطی!'' احمد نے ایسے زہر خند سے کہا کہ میرا سارا اعتماد اور حوصلہ ہوا ہو گیا اور میں نے چپ رہنے میں عافیت سمجھی۔

''اُترو.....'' ہم گھر کے پورچ میں پہنچ چکے تھے۔ مجھے پتہ ہی نہ چلا تھا کہ کب راستہ کٹا اور کب ہم گھر میں داخل ہوئے۔ احمد ذرا سختی سے دوبارہ بولے۔

''اُترو.....اور سنو.....'' جب میں نے گاڑی سے نیچے قدم رکھے تو انہوں نے دوبارہ کہا۔

''گھر میں کسی سے ذکر نہ کرنا۔ میرا مطلب ہے جو بات تمہارے لیے خوش خبری ہے اسے گھر میں مت بتانا.....'' وہ کاٹ دار انداز میں بولے۔

''بلکہ تم چند روز کے لیے اپنی امی کی طرف کیوں نہیں چلی جاتیں؟'' وہ عجیب سے انداز میں بولے تو میں اُن کے یہ انداز دیکھ کر دنگ ہی رہ گئی۔

''اچھا تم اندر جاؤ مجھے کسی ضروری کام سے جانا ہے۔'' وہ دوبارہ گاڑی میں بیٹھے اور کہیں چلے گئے۔ میں مَرے مَرے قدموں سے اپنی نم آنکھیں صاف کرتی اندر چلی گئی۔

❁❁❁

میں پورے دو دن سے اپنے کمرے میں بند تھی، اور آنسو بہا رہی تھی۔ احمد نے ایک گھمبیر چپ کی چادر اپنے اُوپر تان رکھی تھی جو میرے لیے اِنتہائی اذیت ناک تھی۔ میں اُنہیں بُلا بُلا کر تھک جاتی تھی، باتیں کرنے کی کوشش کرتی تھی، مگر وہ میری طرف بغیر دیکھے بُت بنے بیٹھے بظاہر ٹی۔ وی دیکھتے رہتے مگر اُن کے چہرے کے تناؤ سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ اندر سے کسی سخت آزمائش میں ہیں۔ وہ زیادہ وقت گھر سے باہر ہی رہتے اور کھانا بھی گھر نہ کھا رہے تھے۔ حد تو یہ تھی کہ انہوں نے مجھے وہ دوائیں بھی نہ لا کر دی تھیں جو ڈاکٹر مہ نور نے لکھ کر دی تھیں اور فوراً شروع کرنے کو کہا تھا۔ ایک دو بار میں نے پوچھا تو بھی انہوں نے کچھ جواب نہ دیا۔ احمد تو میرے لیے اتنے حساس تھے کہ مجھے ذرا سا زکام ہوتا تو دوائیوں کا ڈھیر لگا دیتے۔ مجھے بستر سے قدم نہ اُتارنے دیتے.....اور اب میں اُن کے سامنے رو رہی تھی، بھوکی پڑی رہتی تھی۔ اکثر تے آتی تو تنہا نڈھال ہو جاتی مگر وہ پاس پڑا پانی کا گلاس تک نہ اُٹھا کر دیتے۔ میں سخت ذہنی پریشانی اور اذیت کا شکار تھی.....اور آج.....آج تو انہوں نے حد کر دی تھی۔ رات کے ساڑھے گیارہ بجے وہ کمرے میں آئے اور آتے ہی مجھے حکم دیا۔

آئمہ! چلو اپنی تیاری کر لو.....''

''تیاری کر لوں.....؟ کیوں کیا ہم کہیں جا رہے ہیں؟'' میں ابھی ابھی باتھ رُوم سے آ کر بستر پر بیٹھی ہی تھی۔

''ہاں! میں چند روز کے لیے ملک سے باہر جا رہا ہوں۔ چاہتا ہوں تم اپنی امی کے ہاں چلی جاؤ.....''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انہوں نے گویا میرے سر پر بم دے مارا۔

''آپ ملک سے باہر جا رہے ہیں..... کہاں.....؟'' میرا دل ایک دم سے بیٹھ گیا۔

''فضول سوالات مت کرو۔ میں کاروباری بندہ ہوں۔ کبھی بھی کہیں بھی جا سکتا ہوں۔ تمہیں جو کہا ہے تم صرف وہ کرو..... اُٹھو مجھے دیر ہو رہی ہے؟'' وہ الماری سے اپنے کپڑے نکالتے ہوئے سختی سے بولے۔

''لائیں میں تیاری کر دوں.....'' میں پھر بھی نرمی سے بولی اور ان کی مدد کرنے کو آگے بڑھی۔

''رہنے دو۔ میں کر رہا ہوں۔ تم اپنی تیاری کرو.....'' انہوں نے گرم سُوٹ والا ہینگر میرے ہاتھ سے واپس کھینچ لیا۔

''احمد! میں نے کہیں نہیں جانا میں گھر پر ہی ہوں۔ میری طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔'' میں نے نہ جانے کی وجہ بیان کی۔

''طبیعت..... طبیعت..... بند کرو یہ ڈرامہ..... اور اپنے گھر جاؤ۔'' وہ خاصی بلند آواز میں بولے۔ اتنی بلند آواز کہ جس میں وہ پہلے کبھی نہ بولے تھے۔

''اپنے گھر.....'' میں تو اپنا دہلتا کلیجہ تھام کر وہیں زمین پر بیٹھ گئی۔

''ہاں تمہارا گھر.....'' وہ اُسی بے رُخی سے بولے۔

''احمد! میرا گھر تو یہ ہے..... آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' میں روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''یہ تمہارا گھر نہیں ہے۔ اگر کبھی تھا تو بھی اب نہیں ہے۔ سمجھیں تم.....'' وہ جھک کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے۔ اُن کی آنکھوں میں اُن کے لہجے سے کہیں زیادہ تپش تھی اور اس سے زیادہ غیریت..... میں لرز ہی تو گئی۔ یہ احمد تو نہیں تھے۔ میری آنکھوں سے آنسو اور بھی تیزی سے بہنے لگے۔

''آپ مجھ سے کس بات پر خفا ہیں۔ میرا قصور تو بتائیں۔''

میں ہمت کر کے اُٹھی اور اُن کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

''میں کون ہوتا ہوں تم سے ناراض ہونے والا.....؟ اور میں نے کہا ناں معصوم بننے کی

ڈرامے بازی اب بس کرو..... ساری زندگی مجھے بیوقوف ہی تو بناتی آئی ہو۔''

وہ اپنی آگ برساتی آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ کر کھڑے ہو گئے اور جو کچھ انہوں نے کہا وہ انگاروں کی طرح میرے دل پر پڑا۔

''احمد! کہا ناں مجھ سے غلطی ہو گئی۔ معاف کر دیں۔''

میں اُن کی ساری سختی اور سارے تکلیف دِہ الفاظ بھول کر اُن کے سامنے ہاتھ جوڑ کے معافی مانگ رہی تھی۔

''جو تم نے کیا تم اُسے آج بھی غلطی کہہ رہی ہو..... اور پھر بھی میں تمہیں معصوم سمجھوں..... معاف کر دوں؟''

انہوں نے نہایت بے دردی سے میرے جڑے ہوئے ہاتھوں کو جھٹکا اور دوبارہ اپنی پیکنگ کرنے لگے۔

''جلدی کرو۔ رات ڈیڑھ بجے کی فلائٹ ہے میری.....'' اگلے ہی پل وہ مڑ کر میری طرف دیکھتے ہوئے گرجے۔

''احمد! آپ جائیں۔ میں نے کہیں نہیں جانا.....''

آج میں پھر بھی جانے کو تیار نہ تھی۔

''تو کیا چاہتی ہو۔ تمہارا تماشہ بنے۔ تو ٹھیک ہے میں ابھی اماں جان کو بلا کر لاتا ہوں اور اُنہیں بتاتا ہوں کہ تم نے میرے ساتھ کیا کیا ہے۔ پھر وہ تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آئیں گی.....''

وہ الماری کے پٹ کو پورے زور سے بند کرتے ہوئے کمرے سے باہر جانے کو بڑھے۔

''نن..... نہیں۔ احمد پلیز.....'' اماں اور گھر والوں کو ابھی تک کچھ بھی پتہ نہ تھا۔ میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اُنہیں روکا۔

''تو پھر چپ چاپ چلو.....'' انہوں نے میرا وہ ہاتھ جو اُن کے کندھے پر تھا سخت غصے سے ہٹایا اور خود باتھ روم چلے گئے۔

میں نے روتی آنکھوں اور کانپتے ہاتھوں سے چار جوڑے اُٹھا کر بیگ میں ڈالے اور تیار ہو گئی۔

''اماں جان کو بتا دیتی ہوں۔ وہ ناراض ہو جائیں گی کہ میں بغیر بتائے چلی گئی'' چلتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چلتے میں نے رُک کر کہا۔

''اماں کے ناراض ہونے سے تمہیں کیا لینا دینا.....'' وہ میری کوئی بات سننے کو تیار نہ تھے۔ میں بھی چپ چاپ آ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ ڈرائیور کی موجودگی میں مَیں نے راستے بھر مزید کوئی بات نہ کی۔ بس خود کو خود ہی تسلیاں دیتی رہی کہ ابھی احمد کو غصہ ہے۔ واپس آئیں گے تو ٹھنڈا ہو چکا ہوگا اور وہ مجھے یقیناً معاف کر دیں گے۔ بھلا کب تک مجھ سے خفا رہیں گے؟ اور پھر اتنی بڑی نعمت سے کیوں منہ موڑیں گے۔ مجھ سے لاکھ ناراض سہی اپنی ہونے والی اولاد سے کب تک دُور رہ سکیں گے۔ میں آج تو چلی جاتی ہوں تاکہ انہیں زیادہ غصہ نہ آئے۔ ایک دو روز میں خود ہی واپس گھر آ جاؤں گی اور ان کے آنے پر انہیں منا لوں گی۔ جیسے بھی ہوا اپنی خطا کی معافی مانگ لوں گی۔

میں جو کسی کی ذرّہ برابر بات برداشت نہ کرتی تھی، احمد کی تو بالکل بھی نہ سنتی تھی..... وہ مجھے کبھی سمجھانے والے انداز میں کچھ کہہ دیتے تو میں کئی روز تک منہ سجائے رکھتی تھی۔ مگر آج..... آج تو میں نے ان کی سخت سے سخت بات بھی برداشت کر لی تھی..... بلکہ میں تو اب بھی اُن کے بارے میں اچھے گمان ہی کر رہی تھی۔

امی جان کا گھر آ گیا۔ احمد نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ بیل دے دے..... اس نے بیل دی تو کچھ ہی دیر بعد چوکیدار گیٹ کھولے کھڑا تھا۔

''آپ اندر تو آ جاتے۔ امی کیا کہیں گی.....'' احمد کو بدستور گاڑی میں ہی بیٹھا دیکھ کر میں نے التجائیہ انداز میں کہا۔

''میرے پاس وقت نہیں ہے۔ تم جاؤ اندر.....'' وہ بے رُخی اور بے دردی سے آنکھیں دوسری جانب کیے بولے۔ ڈرائیور نے میرا بیگ چوکیدار کو تھمایا اور گاڑی میں بیٹھ کر زن سے گاڑی آگے لے گیا۔

''آئمہ! تم..... رات کے اِس پہر.....؟'' مجھے یوں اچانک اپنے سامنے پا کر امی جان بے حد پریشان ہو گئیں۔

''احمد کہاں ہے۔ اور تم کس کے ساتھ آئی ہو اس وقت؟'' وہ مجھے آگے بڑھ کر ملنے کی بجائے پریشانی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں۔ اس وقت میں خود بھی پریشانی سے بوکھلائی ہوئی تھی

اور کچھ احمد کے بدلے ہوئے رویے سے میرا دل بھی بہت دُکھا ہوا تھا۔ میں بے ساختہ ہی امی جان سے لپٹ گئی اور ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔

''آئمہ! آئمہ! کیا ہو گیا۔ کیا ہو گیا میری جان؟'' امی جان نے وارفتگی سے میرے کانپتے لرزتے وجود کو اپنی گرم بانہوں میں بھینچ لیا۔ میرا دھڑ دھڑ کرتا ہوا دل اُن کے ڈرے سہمے دل میں سمانے لگا۔ ان کا دل اگرچہ مجھے یوں تنہا اور دُکھی دیکھ کر ڈر تو گیا تھا مگر وہ پھر بھی ایک حکیم و دانا دل تھا۔ مسیحائی اور چارہ گری کے فنون سے آراستہ دل..... ایک سمجھدار ماں کا دل جو تھا۔ اس نے میرے کمزور ڈھے جانے والے دل کو فوراً ہی اپنی محبت کا سہارا دے کر سنبھال لیا تھا۔

''بس۔ بس میری بیٹی.....!'' اُن کا پیار تازہ لہو کی طرح میری شریانوں میں گردش کرنے لگا تھا۔

''چلو یہاں بیٹھو..... اِدھر آؤ.....'' اُنہوں نے مجھے اپنی بانہوں میں لیے لیے صوفے پر بٹھا دیا اور خود بھی میرے ساتھ ہی بیٹھ گئیں۔

میرے ابو جان جو اس وقت تک سو چکے ہوتے ہیں وہ بھی اپنے کمرے سے نکل کر لونگ روم میں آ گئے تھے۔ میری سسکیوں نے یقیناً اُن کی نیند کچی کر دی تھی۔ ایک بیٹی کی سسکیاں وہ بھی شادی شدہ بیٹی کی..... ایک سخت گیر باپ کے اعصاب پر بھی تازیانے کی طرح لگتی ہیں اور میرے ابو تو انتہائی شفیق باپ تھے۔

''کیا ہوا آئمہ کو؟ یہ کب آئی، اور احمد کہاں ہے؟'' ابو جان نے بھی امی کی طرح اسی کیفیت میں پوچھا۔ بے چینی اور پریشانی سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے۔

''احمد کو کہیں جانا تھا۔ وہ جلدی میں تھا چھوڑ کر چلا گیا ہے۔''

امی جان نے ابو کو پریشانی سے بچانے کے لیے کہا۔

''اِس وقت احمد کو کہاں جانا تھا؟'' ابو کی تسلی نہ ہو رہی تھی وہ بدستور بے چین تھے۔

''آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ یوں پریشان ہو رہے ہیں جیسے کوئی آفت آ گئی ہو۔ بھئی بیٹی ہی تو ہے۔ اپنے گھر آئی ہے۔'' امی جان نے ابو کا دھیان بٹانے کو کہا۔

''بیٹی آدھی رات کو گھر آئے تو والدین کے لیے آفت نہیں قیامت کی خبر لاتی ہے۔ اسے پوچھو کیا بات ہے۔ ابھی رات ڈھلی نہیں ہے۔ میں اِسے اِسی اندھیرے میں واپس چھوڑ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آؤں گا۔ صبح یہ اپنے گھر ہو گی تو بڑی سے بڑی بات بھی دب جائے گی۔ ورنہ کل کا سویرا جانے کیا گُل کھلائے.....؟'' ابو جان امی کی تسلی سے مطمئن نہ ہوئے بلکہ بے حد فکر مند ہو گئے تھے۔ آج اُن کا پدرانہ رویہ مشفقانہ نہیں بلکہ ناصحانہ تھا۔

''آئمہ کیا بات ہے؟ کیا احمد کے اور تمہارے بیچ کچھ ناراضگی ہو گئی ہے؟'' امی بھی فکر مندی سے پوچھنے لگیں۔

''نن نہیں امی جان..... احمد کو دراصل بزنس کے سلسلے میں اچانک ہی ملک سے باہر جانا پڑا اِس لیے میں اِدھر آ گئی.....''

میں نے آدھا سچ بولا اور آدھا اس لیے چھپا گئی کہ آج ماں کے ساتھ ساتھ میرے باپ کی نظروں میں بھی بے چارگی تھی۔ وہ میرے آنسو دیکھ کر تڑپ تو رہے تھے مگر آدھی رات کا سناٹا اور میرا تنہا وجود اُن کا کلیجہ چھیل رہا تھا۔

''احمد آج کوئی پہلی بار تو ملک سے باہر نہیں گیا۔ وہ کبھی اِسے گھر کے باہر چھوڑ کے نہیں جاتا۔ اس کے قدم آج باہر سے باہر ہی پلٹ گئے۔ یقیناً اُس کا دل اس سے بدگمان ہے۔ وہ بُرے جی سے گیا ہے، اور یہ ہرگز بھی اچھا نہیں ہوا.....'' ابو جان کے لہجے میں پریشانی اور سختی دونوں آ چکی تھیں۔ ''اِسے اندر لے جاؤ اور جا کر اس سے سچ پوچھو..... میں احمد کو فون کرتا ہوں۔'' انہوں نے قطعی انداز میں کہا اور ہم دونوں کی طرف دیکھے بغیر واپس اپنے کمرے میں چلے گئے۔

❁❁❁

رات کو تو میں نے امی جان کو پوری بات نہ بتائی اور کسی نہ کسی طرح سے مطمئن کر ہی دیا۔ یہ کہہ کر کہ واقعی میرے اور احمد حسن کے درمیان ایسی کوئی بات نہیں ہوئی جو اتنی سنجیدہ ہو۔ بس وہ مجھ سے اس بات پر خفا ہیں کہ میں نے انہیں یہ کیوں نہیں بتایا تھا کہ میں نے ڈاکٹر مہ نور سے علاج جاری رکھا ہوا ہے اور یہ کہ ڈاکٹر مہ نور نے مجھے اُمید بھی دلائی تھی۔

''ویسے تو یہ اتنی سی بات نہیں ہے جتنی چھوٹی اور معمولی تمہیں لگ رہی ہے۔ بات تو نادانستگی کی ہے۔ تمہیں اپنے شوہر کو لاعلم نہیں رکھنا چاہیے تھا۔''

وہ مجھ پر خفا ہو رہی تھیں لیکن اس خفگی میں میرے لیے بے پناہ پیار تھا۔ وہ تو میرے ماں بننے کی خبر سن کر ہی نہال ہو گئی تھیں۔ ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ میں اگر احمد کے ساتھ یہ

خبر لے کر مسکراتی ہوئی آئی ہوتی تو یقیناً وہ اپنی خوشی کا اظہار کھل کر کرتیں۔ مگر اب وہ کچھ رنجیدہ بھی تھیں کہ ایسی خوشی کے موقعے پر ہم دونوں میاں بیوی میں ناراضگی ہے۔

ابو جان نے احمد کو فون کیا تو احمد نے اُنہیں بڑی سعادت مندی سے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا تھا کہ وہ واقعی ملک سے باہر جا رہے ہیں واپس آتے ہی گھر آئیں گے۔ لہٰذا ابو جان کی ناراضگی مجھ سے کافی حد تک ختم ہو گئی تھی لیکن فکر مندی کی لکیریں پھر بھی اُن کی پیشانی پر موجود تھیں۔

''اِسے سمجھاؤ فاطمہ! اب یہ اپنے فضول شوق چھوڑ دے، اپنے گھر اور شوہر کی فکر کرے، اور سمجھاؤ کہ بیویوں کو کیسا ہونا چاہیے۔ اُن کے محض حقوق ہی نہیں فرائض بھی ہوتے ہیں۔ دنیا بھر کی عورتوں کے حقوق کے لیے لڑنا چھوڑے اور اپنے فرائض کو نبھانا سیکھے، اور ہاں اِسے یہ بھی بتا دینا کہ.....'' ابو جان جاتے جاتے پلٹے اور مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

''وہ پاکستان ہو یا امریکہ..... دنیا میں جتنی بھی عورتیں اپنے حقوق کی جنگ لڑنے کے لیے گھر سے باہر نکلی ہیں، اُن کے اپنے سروں پر پھر گھر کی چھتیں نہیں رہیں۔ وہ خود بے سکون اور غیر محفوظ ہی ہوئی ہیں۔ کیونکہ ''حق'' حاصل کرنے کی دُھن میں وہ اپنے فرض سے غافل ہو گئیں اور بھول گئیں کہ دنیا کے نظام کا ایک بڑا اُصول ہے Give and take اور اِسی پر انصاف قائم ہوتا ہے۔''

ابو یہ سمجھ رہے تھے کہ میں چونکہ اپنی سرگرمیوں میں بہت آگے تک جا چکی ہوں تو اس سے میرے اور احمد کے تعلقات متاثر ہو رہے ہیں، اور وہ کچھ ایسا غلط بھی نہ سمجھ رہے تھے، اس کا اندازہ اس وقت تو مجھے نہ ہوا مگر کچھ روز کے بعد ہی یہ بات بھی ثابت ہو گئی۔

''اچھا اب آپ آرام کیجیے۔ ورنہ صبح فجر کے وقت مشکل ہو گی اُٹھنے میں۔'' امی نے اُنہیں سونے کے لیے بھیج دیا۔

''آئمہ! اب تم بھی آرام کرو باقی باتیں ہم صبح کریں گے۔'' پھر انہوں نے مجھے بھی بستر پر لٹا کر کمبل اوڑھایا اور خود یہ کہتے ہوئے میرے کمرے سے باہر چلی گئیں۔

''اچھا اب میں شکرانے کے نفل تو ادا کر لوں۔ اللہ تعالیٰ نے میری دعاؤں کو قبولیت کا شرف بخشا ہے۔ آخر کو اب میں نانی بننے والی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اُن کے چہرے پر ایسی صبیح سی چمک تھی کہ میری آنسوؤں سے تر آنکھیں بھی مسکرا دیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

❀❀❀

مجھے امی کے گھر آئے ہوئے تقریباً ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ اس ایک ہفتے میں احمد نے مجھے ایک بار بھی فون نہ کیا تھا۔ ورنہ تو مجھے ایک دن میں دو تین بار لازماً فون کیا کرتے تھے جب بھی مجھ سے دُور ہوتے تھے۔ میں اندر ہی اندر بے حد لرزی ہوئی تھی۔ مجھے ایک پل کو بھی قرار نہ تھا۔ میں جب سے آئی تھی خود کو مصروف رکھنے کے ہزار جتن کر رہی تھی۔ ٹی وی کے تقریباً سارے ڈرامہ چینلز کو باری باری دیکھتی رہتی مگر کسی بھی ڈرامے میں میری دلچسپی چند منٹوں سے زیادہ برقرار نہ رہتی۔ میں خواہ مخواہ ہی الجھنے لگتی۔ پھر اسٹیریو آن کر دیتی۔ میلوڈی ٹریجڈی..... کلاسیکی..... پاپ..... کچھ بھی میری نفسیاتی کشمکش پر کارگر ثابت نہ ہوتا۔ میں اُٹھتی اور یوگا کا کوئی آسان سا آسن مار کے بیٹھ جاتی۔ سانسوں کی آمد و رفت میں سہولت تو ہو جاتی مگر سینے کی وہ جلن کم ہونے میں نہ آ رہی تھی جو احمد حسن کے فراق سے سُلگ رہی تھی۔

درداں دی ماری..... رو رو کے ہاری
تانگاں تیریاں نے مینوں ماریا

نصرت فتح علی کی آواز میں پنجابی غزل اب بھی میرے سرہانے بج رہی تھی اور میری آنکھوں سے فریاد بن بن کے بہہ رہی تھی۔

"احمد! آپ مجھ سے کیوں خفا ہو گئے ہیں۔ میں نے ایسا تو کچھ نہیں کیا جو آپ میرے ساتھ اتنا کٹھور رویہ رکھیں۔" میرا بس نہ چل رہا تھا کہ میں اُڑ کر احمد کے پاس پہنچ جاؤں۔

"آئمہ! اُٹھو یہ جوس پی لو۔" امی جان نے کمرے میں آتے ہی میرے سرہانے بجتے اس اسٹیریو کو بند کیا۔ وہ جوس کا گلاس لیے کھڑی تھیں۔

"اُٹھو..... کیا ہر وقت پڑی رہتی ہو۔ اوپر سے یہ نحوست سرہانے لگائے رہتی ہو....."

وہ میرے اس موسیقی سننے کے شوق سے سخت نالاں تھیں اور مجھ سے اس بات پر خفا رہتی تھیں۔

میں نے چپ چاپ جوس کا گلاس اُن کے ہاتھ سے لیا اور ہونٹوں سے لگا لیا۔

"یہ کیا کفرانِ نعمت ہے مومی۔ اللہ نے تمہیں برسوں کے بعد اور اس قدر مسائل کے بعد اولاد جیسی انمول نعمت سے نوازنے کا فیصلہ کیا ہے اور تم یوں منہ بسورے پڑی رہتی ہو....."

وہ میرے قریب ہی بیٹھ گئیں۔

"کیا کروں امی جان! کسی چیز کی طرف جی مائل نہیں ہوتا۔ کوئی کام کرنے کو دل نہیں کرتا۔"

"یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ نہ ہی بیماری ہے نہ فکرمندی کی بات۔ یہ سب تو ہر عورت کے ساتھ ہوتا ہے۔ ماں بننا کوئی آسان کام نہیں۔ ایک عورت اپنے جسمانی نظام کے ساتھ ساتھ ذہنی اور نفسیاتی نظام میں بھی بڑی عظیم تبدیلیوں سے گزر رہی ہوتی ہے۔ اِس لیے یہ ٹوٹ پھوٹ جو کہ عارضی ہوتی ہے چلتی رہتی ہے۔

"مومی! اب تمہاری دھڑکنوں میں ایک اور زندگی کی چاپ سنائی دے رہی ہے تمہاری سانسوں سے ایک ننھی سی جان جڑ چکی ہے۔ تمہیں اُس کا خیال رکھنا ہے۔ بالکل اُسی طرح جیسا کہ ایک ماں اپنے اس بچے کا خیال رکھتی ہے جو اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے۔"

"کیسے.....؟" میں اپنے بچے کا ذکر سن کر چند لمحوں کے لیے احمد کے خیالوں سے آزاد ہو گئی۔

"دیکھو اس کی جسمانی نشوونما اگر تمہاری بہترین خوراک سے منسلک ہو چکی ہے تو اس کے دل اور دماغ بھی تو ابھی تمہارے دل و دماغ سے ہی نمو پا رہے ہیں یعنی اگر تم خوش اور پُرسکون رہو گی تو وہ بھی رہے گا۔ ورنہ....." امی جان نے بڑی محبت سے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے..... دوسرے لفظوں میں انہوں نے میری نبضیں تھام لیں۔

"اُس کی جسمانی خوراک کا بھی خیال کرو میری بچی! اور اس کی روحانی خوراک کا بھی۔ یہ گانے وانے مت سنا کرو اب۔ اب تو تمہیں نماز اور قرآن سے جڑنا چاہیے۔ مجھے اپنا یاد ہے، تمہارے قدموں کی چاپ سنتے ہی میرے قدم بڑے محتاط ہو گئے تھے۔"

وہ بڑے شوق و انبساط سے اپنے بارے میں بتانے لگیں اور مجھے زندگی میں پہلی بار اس موضوع پر باتیں کرنے اور سننے میں اتنی دلچسپی پیدا ہوئی۔

"بتائیں ناں! امی جان آپ کیا کرتی تھیں؟"

"میں.....؟" اُن کی آنکھوں سے پچھلی یاد کی پھلجھڑیاں چھٹنے لگیں۔ "میں نے تو وہی کیا جو تمہاری دادی اور نانی سے مجھے سکھایا۔ اللہ بخشے تمہاری دادی جان کہا کرتی تھیں، اگر اس مرحلے میں سورۃ یوسف اور سورۃ مریم باقاعدگی سے پڑھی جائے تو پیدا ہونے والا بیٹا صفات یوسفؑ سے اور اگر بیٹی ہو تو صفاتِ مریمؑ سے مزین ہوتی ہے۔ اس حالت میں زیادہ سے زیادہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

باوضو رہنا چاہیے۔نماز وقرآن باقاعدگی سے پڑھنے چاہئیں۔سیرت النبیؐ کی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ سے ہر لحظہ دُعا واستغفار کرنی چاہیے تاکہ اولاد بے عیب ہو، نیک ہو اور دراز عمر پا کر آئے.....''

امی جان کہہ رہی تھیں اور میں سر سے پاؤں تک سن رہی تھی..... بے حد شوق سے۔آج مجھے اپنی ماں کا چہرہ جانے کیوں پہلے سے کہیں زیادہ حسین دکھائی دے رہا تھا، اور میرا دل پگھل پگھل کر اُن کا چہرہ بنتا جا رہا تھا جیسے آئمہ احمد حسن کے دل پر تصویر بن رہا ہو۔ایک بے حد حسین عورت کی تصویر۔جس کی آنکھوں میں اُمید، ایمان اور محبت کے دیئے ہر لحہ جلتے دکھائی دیتے تھے۔جس کے لبوں پر اخلاق اور نصیحت کے گلاب کھلے رہتے تھے، اور جس کا دل ہر اپنے اور پرائے کے لیے دن رات اخلاص اور دُعا سے بھرا رہتا تھا۔میری ماں..... دنیا کی سب سے پیاری ماں.....

میرے دل ودماغ نے سرِ تسلیم خم کیا اور دل نے لبک کر کہا۔

''یا اللہ! اگر میرے ہاں بیٹی ہو تو میری ماں جیسی ہو.....''

میں نے..... آئمہ احمد نے آج زندگی میں پہلی بار خود سے زیادہ خوبصورت اور بہترین کسی اور کو تسلیم کیا تھا۔ورنہ تو مجھے اپنے سوا نہ کوئی اچھا لگتا تھا نہ دکھائی دیتا تھا۔

''بیٹی! زندگی کا سکون صرف اور صرف یاد اللہ میں ہے، اور یہ جو دنیا بکواس کرتی رہتی ہے کہ موسیقی روح کی غذا ہے ایسا نہیں ہے۔مسلمانوں کی روح کی غذا آلات موسیقی میں نہیں، اُس کتاب حکیم میں ہے جو آسمانوں سے ہماری ہدایت کے لیے اُتری ہے۔''

وہ میرے سرہانے پڑی بے شمار سی ڈیز اور ڈی وی ڈیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولیں۔

''جی امی جان.....'' میں نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

''نماز پڑھا کر میری جان! اسی میں سکون وراحت ہے۔'' انہوں نے بڑی محبت اور شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔''چلو اب اٹھ کر باہر آجاؤ۔باہر آکر تھوڑی دیر دھوپ میں بیٹھو تاکہ تمہاری سستی اُترے۔آجاؤ شاباش میں تمہارے لیے بریانی بنانے لگی ہوں جنت بُوا اتنی دیر میں تمہارے سر میں تیل ڈال دیں گی..... اور ہاں ذرا ہاتھ پیر بھی ملوا لینا۔

انہوں نے جاتے جاتے بھی مجھے نصیحت کی۔میں نے ہاتھ اُٹھا کر ایک لمبی سی انگڑائی لی اور باہر جانے کے لیے پاؤں بستر پر سے اُتار لیے۔

❁❁❁

''احمد واپس آچکے ہیں۔'' اس خبر کو سن کر میری حالت دیوانوں کی سی ہو گئی تھی۔میرے پیروں میں پہیے لگ چکے تھے۔میں بھاگ کر بار بار لونگ روم کے بیرونی دروازے سے جھانکتی کہ شاید چوکیدار گیٹ کھول رہا ہو۔احمد نے مجھے اپنے آنے کی اطلاع نہ دی تھی۔میں نے آج گھر فون کیا تو اماں جان نے بتایا کہ احمد رات ہی واپس آئے ہیں۔میں جب سے اپنی امی کے گھر آئی تھی ہر روز باقاعدگی سے اپنے سسرال یعنی اپنے گھر پر فون کر کے سب کا حال چال پوچھتی تھی۔اور ایسا میں پہلی بار کر رہی تھی ورنہ پہلے تو جب بھی گھر سے دور ہوتی یا میکے آتی تو پچھلوں کی فکریں وہیں چھوڑ کر آتی تھی۔امی جان تو مجھے ہمیشہ کہتی رہتی تھیں ''آئمہ! لڑکیوں کو اپنے میکے آکر اپنے سسرال کی زیادہ فکر کرنی چاہیے۔اس طرح ان کی غیر موجودگی سے اُن کی جگہ پر خلا نہیں پڑتا۔لیکن میں کہاں مانتی تھی میں تو کندھا اُچکا کر لاپروائی سے کہتی۔''رہنے دیں امی! اب کیا لڑکیاں والدین کے گھر آکر بھی سسرال کی فکروں سے آزاد نہ ہوں.....'' مگر اس بار..... اس بار تو میرے اپنے دل کو لگی ہوئی تھی۔میں تو ہر روز اس لیے فون کرتی تھی تاکہ مجھے احمد کی خبر ملتی رہے، اور گھر کے حالات کی سن گن بھی کہ وہاں میرے بعد کیا چل رہا ہے۔آج مجھے اس کا فائدہ ہو ہی گیا تھا۔یہ پتہ چل گیا تھا کہ احمد واپس آچکے ہیں۔تب سے میں ان کے موبائل پر فون کر رہی تھی مگر وہ میرا فون اٹینڈ نہ کر رہے تھے۔مطلب اُن کا غصہ ابھی ٹھنڈا نہ ہوا تھا۔وہ چاہتے ہوں گے کہ میں اُن سے باقاعدہ معافی مانگ کر انہیں مناؤں۔میں نے خوش فہم ہو کر سوچا۔چلو خیر ہے۔میں ایسا ہی کر لوں گی..... میں نے بڑے اہتمام سے تیار ہوتے ہوئے سوچا۔مجھے اُن کا انتظار تھا۔وہ ابو جان سے وعدہ جو کر کے گئے تھے کہ آتے ہی یہاں آئیں گے۔میں نے باتوں باتوں میں ابو جان کو اُن کے آنے کی اطلاع بھی دے دی تھی تاکہ وہ احمد کو فون کر کے مدعو کر لیں۔احمد نے میرے کسی میسج کا بھی جواب نہ دیا تھا۔میرا دل خوش ہونے کے باوجود عجیب سے واہموں میں الجھا ہوا تھا۔ابو جان کی بجائے امی جان نے میرے جی کی بے چینی کو محسوس کرتے ہوئے احمد کو فون کر لیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا.....اور اُن کا حال چال پوچھ کر انہیں شام کی چائے پر باقاعدہ مدعو کر لیا تھا۔ تھوڑی سی پس پیش کے بعد انہوں نے آنے کی ہامی بھر لی تھی جس پر میرا دل خوشی سے بلیوں اُچھلنے لگا تھا۔ میں نے فٹافٹ غسل کیا اور احمد کے پسندیدہ سرخ رنگ کے ساتھ سیاہ کنٹراسٹ والا وہ سُوٹ تن زیب کیا جو احمد نے مجھے کراچی سے خرید کر گفٹ کیا تھا۔

❁❁❁

احمد چائے پر آئے تو حسبِ عادت امی اور ابو کے ساتھ بڑی ہی خوش دلی اور گرمجوشی سے ملے۔ وہ بظاہر مجھ سے بھی مخاطب تھے۔ مگر ان کی آنکھوں کی لَو بجھی بجھی سی تھی۔ اُن میں میرے لیے کوئی وارفتگی یا تعریف نہ تھی بلکہ کافی حد تک اجنبیت اور بیگانگی کا تاثر تھا۔ میں پھر بھی پیش پیش رہی۔

''اچھا نوجوان! اب اگر تم ڈنر ہمارے ساتھ کرو تو ہمیں بے حد خوشی ہوگی اور اگر جلدی میں ہو تو میں ضد نہیں کروں گا۔ آئمہ تیار ہے تم لوگ جا سکتے ہو۔'' چائے کے بعد ابو جان نے خالص فوجیوں والے انداز میں احمد کے کندھے پر پیار سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ انہیں دراصل ٹینس کورٹ جانا تھا یہ ان کی گیم کا وقت تھا۔ وہ ریٹائرمنٹ کے بعد اگرچہ بزنس مین ہو چکے تھے مگر اُن کی مصروفیات اور ٹائم ٹیبل فوجیوں والا ہی تھا۔

''جج.....جی.....آئمہ.....'' وہ مجھے ساتھ لے جانے کے ذکر پر ہچکچا رہے تھے۔

''ہاں بھئی یہ آج پہلے سے تیار ہے تمہیں انتظار نہیں کروائے گی۔ بس دو منٹ۔ بس دو منٹ کہہ کر.....'' وہ میری پہلے والی عادت پر مجھے چھیڑنے لگے۔

''جی میں ڈنر تک رُکتا ہوں۔ آپ گیم کر آئیں.....'' انہوں نے جلدی سے یہی کہہ دیا جس پر ابو جان بہت خوش ہو گئے اور احمد کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ٹینس کورٹ چلے گئے۔

''آئمہ! تم لوگ اپنے کمرے میں چل کر باتیں کرو میں ذرا کچن کو دیکھ لوں۔'' امی جان بھی خوش ہو کر بولیں اور میں تو پہلے ہی یہی چاہ رہی تھی۔

❁❁❁

''احمد! سوری!''

کمرے میں آنے کے بعد جب اگلے دس منٹ تک بھی احمد نے مجھ سے بات نہ کی تو

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''Sorry for what?'' انہوں نے انجان بنتے ہوئے ٹی وی پر نظریں جمائے جمائے کہا۔ انہوں نے کمرے میں آتے ہی ٹی وی آن کر لیا تھا۔

''پلیز احمد!'' میں رونے کو تھی۔

''Please leave this topic'' انہوں نے بڑے سپاٹ انداز میں کہا۔

''اگر تم چاہتی ہو کہ تمہارے والدین کے سامنے تمہاری عزت بنی رہے تو اس موضوع پر مجھ سے بات مت کرنا.....''

''ٹھیک ہے نہیں کرتی۔ لیکن کیا آپ مجھے گھر نہیں لے کر جائیں گے؟'' میرے جی کا وسوسہ میری زبان پر آ ہی گیا۔

''وہ تمہارا گھر اب نہیں ہے۔ اور نہ ہی میرے پاس ایسا کوئی جواز کہ میں تمہیں گھر لے کر جا سکوں.....''

انہوں نے ٹی وی بند کیا اور مجھ سے آمنے سامنے ہو کر بات کرنے لگے۔ اُن کے چہرے پر بلا کی سختی اور بیزاری تھی۔ میں شرمندگی کے احساس سے پسنے لگی۔

''معاف کر دیں احمد! مجھ سے غلطی ہو گئی.....'' میں نے سچ مچ ہاتھ باندھ دیئے۔

''پھر وہی غلطی.....تم.....تم اپنی بے حیائی کو غلطی کہتی ہو.....'' وہ تقریباً پھنکارتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''بے حیائی.....'' میری زبان کے ساتھ ساتھ میرا رواں رواں لرز گیا۔

''تو اور کیا کہتے ہیں تمہاری اس آزاد خیال اور بے شرم سوسائٹی میں اسے؟'' وہ اپنی آگ برساتی آنکھوں کو میری آنکھوں پر گاڑے ہوئے بولے۔

''میں نے ایسا کیا کیا احمد.....؟'' میں پھر سے ٹوٹ گئی، رونے لگی۔

''اپنے آپ سے پوچھو۔ بلکہ مجھے بھی پوچھ کر بتاؤ۔ کم از کم اتنا تو بتا دو کہ اس گناہ میں تمہارا شریک کون تھا جس نے تمہیں ماں بننے کی خوش خبری سے نواز دیا.....''

احمد کی آنکھوں ہی سے نہیں زبان سے بھی شعلے نکل رہے تھے۔ ایسے شعلے جنہوں نے میرے دل و دماغ کے ساتھ ساتھ کردار کو بھی سیاہ کر ڈالا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''احمد! آپ..... آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟''

میں نے اپنے گرتے ہوئے وجود کو سہارا دینے کے لیے دیوار کو پکڑا۔

''وہی جو تم سن رہی ہو..... اور بالکل وہی جو تم کرتی رہی ہو..... تم اس قدر گر جاؤ گی، اپنی آوارگی میں اتنی دُور نکل جاؤ گی..... میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ ٹھیک کہتی تھیں اماں کہ میں ایک روز آنکھوں میں اُنگلیاں گھسا کر روؤں گا۔ میں نے بہت غلط کیا جو تمہیں اتنی آزادی دی۔ بے لگام رکھا۔ مگر تم..... تم نے کیا کیا..... میری محبت میرے اعتماد کا خون کر دیا..... ایک بچے کی خواہش میں تم اِس قدر دیوانی ہو گئیں کہ تم نے..... تم نے..... اپنا آپ..... اُف مجھے تو موت آتی ہے یہ سوچتے ہوئے بھی..... مگر تم نے کیا مجھے بھی اپنے جیسا بے شرم اور بے غیرت سمجھ لیا تھا کہ میں اپنی مردانگی کا جھوٹا شملہ اونچا رکھنے کے لیے تمہارے اس گناہ کو قبول کر لوں گا جسے تم میرے سر منڈھنا چاہتی ہو..... لعنت ہے تمہارے عورت ہونے پر.....'' وہ کیا کیا کہہ رہے تھے، میرے کان سن تو رہے تھے مگر میرے اعصاب اسے قبول نہ کر رہے تھے۔ میں تو احمد حسن کے منہ سے بدکردار اور سیاہ کار کے الفاظ سن کر ہی مٹی ہو گئی تھی۔ میرے پاؤں کی پھانس آج میرے کلیجے میں آ گڑی تھی۔ اور میں آئمہ حسن..... اپنی شرافت کو آخری سانسیں لیتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ میری زبان..... میرے کان..... میرا دل..... میرا دماغ سب اس لہو میں ڈوب چکے تھے جو احمد حسن کی زبان کا خنجر آر پار ہونے سے بہہ رہا تھا..... وہ خنجر جو آئمہ احمد حسن کی پاکبازی پر چلا تھا۔

❁❁❁

احمد رات کے کھانے کے بعد واپس چلے گئے اور میں احمد کے ساتھ واپس خود نہ گئی تھی۔ میں کیوں نہ گئی۔ یہ بات اگرچہ بھید میں تھی مگر میری متورم آنکھیں مرے مرے سے قدم اور احمد سے کتراتی نظریں میری امی اور ابو کو ایک بہت بڑے طوفان کی آمد کا پتہ دے رہے تھے۔ کھانے کے نام پر سبھی لوگ اپنی اپنی پلیٹوں میں پڑے چھری کانٹوں سے ہی کھیلتے رہے تھے۔ احمد بھی کچھ کھچے کھچے سے تھے اور ابو جان بھی پریشان اور چپ چپ تھے۔ احمد جانے لگے تو ابو جان نے اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑے التجائیہ انداز میں صرف اتنا کہا۔

''احمد بیٹا گھروں کو بنانے میں عمریں بیت جاتی ہیں..... مگر انہیں اپنے ہاتھوں سے

اُجاڑنے میں پل بھی نہیں لگتے۔ اگر شوہر اور بیوی کے درمیان بدگمانیاں آنے لگیں تو پھر جذبات سے نہیں ہوش و حکمت سے کام لینا چاہیے۔ اور اس سے بھی زیادہ صبر سے..... اتنے زیادہ صبر سے کہ قوتِ برداشت بھی تنگ پڑنے لگے..... مگر پھر بھی صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہیے زیادہ تر اسی آخری حد پر ہی سچ کھڑا ہوتا ہے۔ وہ سچ جو گھر کو ٹوٹنے سے بچا کر دلوں کو پھر سے جوڑ دیتا ہے.....''

اس وقت مجھے ہرگز بھی سمجھ نہ آئی کہ ابو جان ایسا کیوں کہہ رہے تھے جبکہ انہیں تو ہمارے بیچ ہونے والی بدگمانی کی خبر بھی نہ تھی۔ لیکن شاید ابو جان نے احمد کے منہ سے نکلے ہوئے وہ الفاظ سن لیے تھے جو احمد کمرے سے نکلتے ہوئے کہہ رہے تھے، اور تب ابو جان ہمیں بلانے کے لیے خود اِسی طرف آ رہے تھے۔ احمد حسن مجھے خود سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے علیحدہ کر دینا چاہتے تھے..... وہ مجھے طلاق دینا چاہتے تھے۔

''طلاق..... اور ہے۔'' میرے سامنے زمین آسمان گھوم رہے تھے۔

میرا وجود بے معنی ہو کر رہ گیا تھا۔ میری ذات اس وقت سوائے ایک چھوٹے سے سیاہ نقطے کے اور کچھ نہ تھی۔ میرا دل، دماغ سب ماؤف ہو چکے تھے میرے پورے جسم پر اگر کوئی عضو نام کی شے باقی رہ گئی تھی تو وہ تھے میرے کان..... میرا ریشہ ریشہ سماعت تھا جن میں یہی ایک لفظ گرم سیسے کی طرح بہتا جا رہا تھا۔ طلاق ''ط..... ل..... ا..... ق.....''

''آئمہ!''

انہی سیسہ ہوئے لمحوں میں امی جان کی آواز کی ٹھنڈی پھوار پڑی تو انہیں دیکھتے ہی میں اُن سے لپٹ گئی۔

''امی جان!'' میرے پورے حال دل کا ترجمان بس یہی ''امی جان'' کہنا تھا اور وہ میری داستان کا حرف حرف جان گئیں۔ ان کی بانہوں کے حصار میں پورا آسمان تھا۔ جو میرے لرزتے کانپتے، بے سہارا، بے چھت وجود پر چادر بن گیا۔ جس نے میری بے ستری کو ڈھک لیا تھا۔ ورنہ تو احمد کے لگائے ہوئے بہتان نے مجھے خود اپنے سامنے ننگا کر دیا تھا۔

''میری بیٹی! میری جان۔'' امی جان کی محبت مجھے سمیٹنے لگی۔

''امی جان..... امی..... میری امی۔'' میں خود کو ان کے اندر چھپانے کے لیے ان کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سینے میں گھسی جا رہی تھی۔

''بس.....بس میری بچی۔'' وہ بار بار میرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام کے میری پیشانی پر بوسہ دیتیں اور میرے آنسو صاف کرتیں۔

''امی جان! سنا آپ نے احمد نے کیا کہا؟ سناناں؟ آپ کی بیٹی پر آج انہوں نے کس قدر غلیظ بہتان لگا دیا ہے۔''

روتے روتے میں نے احمد کی شکایت لگائی۔ دراصل میرے اندر اس وقت احمد کے الفاظ نے آگ لگا رکھی تھی جنہوں نے میرے رہے سہے حواس کو بھی جھلسا دیا تھا۔

''بیٹھو ادھر.....اور یہ پانی پیو۔'' امی جان بڑے ہی تحمل سے مجھے کرسی پر بٹھاتے ہوئے بولیں پھر انہوں نے پانی کا گلاس میرے لبوں سے لگا دیا۔ میں دیکھ رہی تھی ان کے لب ہولے ہولے ہل رہے تھے۔ وہ کچھ پڑھ رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر بلا کا سکون تھا۔ اک نرم ملائم سے ہالے کے بیچ ان کا بے شکن چہرہ مسکرا رہا تھا۔ جسے دیکھ کر میں حیران تھی کہ بیٹی پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے اور یہ ماں ہو کر بھی اتنی مطمئن کیسے ہیں۔

''دیکھو آئمہ! میں احمد کو بھی اب اتنا ہی جانتی ہوں جتنا کہ تمہیں.....تم دونوں آج اپنی زندگی کے اس دوراہے پر کھڑے ہو جس کا ایک راستہ سوائے جدائی کے کچھ اور نہیں.....خدا نہ کرے کہ تم لوگ اس راستے پر قدم رکھو۔''

وہ بڑی محبت سے سمجھانے لگیں۔ انہوں نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنے ہونٹوں سے لگائے۔ جیسے میرے جلتے ہوئے زخموں پر پھاہا رکھ رہی ہوں۔ پھر میری آنکھوں میں دیکھتی ہوئیں پوچھنے لگیں۔

''اب سچ کہو کہ بات کیا ہے؟ ماں اور بیٹی آمنے سامنے رکھے ہوئے دو آئینوں کی طرح ہوتی ہیں جن میں سوائے اپنے عکس کے اور کچھ نظر نہیں آتا اور اگر ان میں سے ایک آئینے کا ذرا سا زاویہ سرکا دیا جائے تو اس عکس میں ایک اور آڑھا ترچھا سا عکس دکھائی دینے لگتا ہے جو نہ صرف ان دونوں کی اصل تصویر مسخ کر دیتا ہے بلکہ خود بھی معنی نہیں رکھتا۔ تم میری بات کو سمجھ رہی ہو ناں بیٹی!'' انہوں نے میرے ہاتھوں کو ہلکا سا جھٹکا دیا گویا وہ میرا سرکتا ہوا رخ درست زاویے پر لا رہی ہوں۔

''جج.....ج.....جی امی!'' میں نے خود کو ان کی نظروں سے چھڑانے کی کوشش نہ کی پھر ان کی آنکھوں کے مقناطیس نے میرے اندر سے سچ اور جھوٹ کا ذرہ ذرہ کھینچ لیا آج میں ان سے کچھ بھی نہ چھپا سکی۔ انہوں نے واقعی مجھے درست زاویے رکھ کے میری اصل تصویر کشید کر لی تھی۔

''مجھے معاف کر دیں امی جان..... میں اپنی جھوٹی خودی اور انا کی پرورش کے لیے ہمیشہ جھوٹ بولتی رہی۔'' آخر میں میری نگاہیں ان کی نگاہوں کی گرفت ڈھیلی ہونے پر ان سے چھوٹ کر زمین میں گڑ گئیں۔

''اور کتنی غلط بات ہوئی کہ تم نے یہ جھوٹ اپنے شوہر سے بولے۔ جو تمہارا کُل اور جس کی تم نصف ہو۔'' انہوں نے اپنے لہجے کو نرم رکھنے کے باوجود خفگی سے کہا۔

''اب سوچو ذرا.....کیا تم اپنے کُل کے بغیر جی سکو گی۔ جبکہ وہ اپنا نصف بدل لینے کا اختیار ہمیشہ سے رکھتا ہے۔ اب تو تم نے اسے اس کا حقدار بھی بنا دیا ہے۔''

وہ مجھ سے ناراض ہو رہی تھیں۔

''تو اب میں کیا کروں؟'' میں نے بے بسی سے ان کی طرف دیکھا۔

''اپنے جرم کا پورا پورا اقرار کرو اور اس سے معافی مانگو۔'' انہوں نے ایک سیدھا راستہ مجھے دکھایا۔

''آپ کو نہیں پتہ امی جان میں تو کب سے ان سے معافیاں مانگ رہی ہوں مگر وہ میری بات سن ہی نہیں رہے۔'' میں نے امی جان کو بتایا۔

''کیا تم نے اسے پورا سچ بتایا تھا؟'' وہ میری طرف شکی نظروں سے دیکھ رہی تھیں شاید اس لیے کہ میں نے ان کے اعتماد کو بھی تو ٹھیس پہنچائی تھی۔

''پورا سچ.....کیا مطلب؟'' مجھے ان کی بات کچھ سمجھ نہ آئی۔

''یہی کہ تم نے اس کی اصل رپورٹیں ضائع کر دی تھیں اور تم نے خود بچنے کے لیے اس پر بہتان دھرا تھا۔'' امی جان نے ایسا کہتے ہوئے میری طرف سے منہ پھیر لیا تھا۔ ان کی حیاء میرے ایسے گھناؤنے عمل کو منہ سے کہنے کا یارا بھی نہیں رکھتی تھی۔

''نن.....ن.....نہیں۔'' میں نے شرم سے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''تو اسے سب بتاؤ.....اور دل سے معافی مانگو۔'' وہ مجھے نصیحت کرتی ہوئیں اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''وہ نہیں مانیں گے۔ وہ بہت غصے میں ہیں وہ تو مجھے.....'' میں احمد کے کہے ہوئے الفاظ نہ دہرا سکی جو مجھے وہ آج کہہ گئے تھے۔

''تم نے اسے بہت سخت چوٹ پہنچائی ہے۔ اب تمہیں صبر سے کام لینا ہوگا۔''

وہ جاتے جاتے رک گئیں اور میرے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھ کر بولیں۔

''اللہ تمہیں ہدایت دے۔ تمہاری مشکل آسان کرے۔ آئمہ! تم نے مجھے بہت شرمندہ کرایا ہے۔ میرا سر شرم سے جھکا دیا ہے۔ اٹھو اپنے رب سے استغفار کرو۔ وہی کوئی راہ نکالے گا۔''

امی جان دکھی ہو کر کمرے سے چلی گئیں اور میں احمد کو فون کرنے لگی۔ اس پکے ارادے کے ساتھ کہ آج میں اس سے سچ بول کر معافی مانگ لوں گی۔

❁❁❁

پہلے جو باتیں میرا مان.....میرا اعتماد ہوا کرتی تھیں وہ اب محض خوش فہمیاں ہو کر رہ گئی تھیں۔ احمد نے میرے بار بار فون کرنے کے باوجود مجھ سے بات نہ کی تھی بلکہ ایک "Message" کر کے اپنا وہ نمبر ہی بند کر دیا تھا۔

''جو عورتیں اپنے شوہروں سے دھوکہ کرتی ہیں۔ جن کی زندگیوں میں اپنی خواہشوں کی تکمیل کے لیے چور دروازے ہوتے ہیں۔ ان پر گھر پلٹ آنے کے راستے بند ہونے کے ساتھ ساتھ چاہنے والوں کے دلوں میں بھی کوئی جگہ نہیں رہتی۔''

Dont disturb my life and enjoy your life as you wish.

''میں تمہارا بھرم کسی کے سامنے نہیں کھولوں گا۔ کیونکہ میں تمہارے والدین کی بہت عزت کرتا ہوں۔ البتہ تمہیں آزادی کا پروانہ جلد ہی مل جائے گا۔''

احمد نے مجھ پر اپنے دل کے دروازے بند کر دیئے۔ وہ مجھ سے نفرت کرنے لگے تھے۔ یہ خبر میرے لیے سوہان روح تھی۔ جس نے مجھے بستر سے لگا دیا تھا۔ دن دن بھر روتے

رہنا نہ کھانا نہ پینا۔ میرا دماغ الٹی سیدھی سوچوں کا مسکن بن چکا تھا۔ میں اپنے کمرے میں ہی بلکہ اپنی ذات میں بھی تنہا اور بے بس ہو کر پڑی تھی۔

''یہ کیسی خوش خبری تھی جس نے میری زندگی سے ہر خوشی چھین لی تھی۔'' میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس انداز سے سوچنے لگی تھی۔

کبھی کبھی جی چاہتا جا کر اس سے چھٹکارا پا لوں۔ جس کی وجہ سے یہ سارا مسئلہ کھڑا ہوا تھا۔ مگر اب کیا فائدہ؟ اب تو جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔

میں بے بسی سے اپنا سر جھٹکتی ہاتھ ملتی اور پھر آنسو بہانے لگتی۔

''احمد نے بھی وہی کیا جو دنیا کے زیادہ تر مرد عورتوں کے ساتھ کرتے ہیں۔'' کبھی میں احمد کے خلاف سوچنے لگتی تو مجھے وہ ساری مظلوم عورتیں یاد آنے لگتیں جو اپنے شوہروں کے ایسے ہی ناروا سلوک اور الزامات کے نتیجے میں یا تو زمانے بھر کے ظلم و ستم سہتی ہیں یا پھر اُن کی زندگیاں جیلوں میں سڑتے ہوئے گزر جاتی ہیں۔ ایسی دل خراش خبروں سے اخبارات ہر روز بھرے ہوتے تھے کہ فلاں نے بدچلنی کے شبے میں اپنی بیوی کو قتل کر دیا۔ فلاں نے اس پر آوارگی کا الزام لگا کر حدود کیس میں اسے اندر کروا دیا اور زیادہ تر تو باپ، شوہر یا بھائی کے ہاتھوں غیرت کے نام پر موت کے گھاٹ اتار دی جاتی تھیں۔ اُف یہ مرد! کتنے ظالم کیسے سفاک ہوتے ہیں۔ بے چاری عورت کی ایک نہیں سنتے نہ ہی اسے صفائی کا موقع دیتے ہیں اور.....اور اسے.....'' میرے رونگٹے کھڑے ہونے لگتے یہ سوچ کر ہی کہ میں بھی ایک عورت ہوں اور ایسے ہی حالات سے دوچار ہوں۔

''اٹھو آئمہ! یہ کیا تم ہر وقت کمرے میں اندھیرا کیے پڑی رہتی ہو۔''

اس وقت امی جان نے میرے کمرے میں آ کر مجھے ان بُرے حالات سے چونکایا۔

''چلو اٹھو اور جا کر منہ ہاتھ دھولو۔'' وہ میرے اوپر سے کمبل کھینچتی ہوئی مجھے زبردستی باتھ روم کی طرف دھکیلنے لگیں۔

''ذرا آئینے میں غور سے اپنا چہرہ دیکھنا۔ کیسے سیاہ حلقے پڑ رہے ہیں اور کیسا پیلا زرد ہو رہا ہے۔'' انہوں نے میرا بستر درست کرتے ہوئے کہا۔ میں مرے مرے قدموں سے چلتی ہوئی باتھ روم چلی گئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

❀❀❀

میرے ساتھ ناشتے پر آج ابا جان بھی موجود تھے ورنہ ابا جان اور امی جان تو بہت سویرے ہی ناشتہ کرنے کے عادی تھے یہ میں ہی تھی جس کی صبح دس گیارہ بجے سے پہلے نہ ہوا کرتی تھی۔ میں ابا جان کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

''آؤ بیٹی..... کیسی ہو؟'' ابا جان نے اپنی کرسی سے اٹھ کر میرا استقبال بڑی محبت سے کیا۔

''جی ابا جان! میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' میں نے زبردستی اک مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے جواب دیا۔

''گڈ..... ویری گڈ۔'' وہ خوش ہو کر بولے اور پھر میرے سامنے ناشتے کی چیزیں کرنے لگے۔ میں دیکھ رہی تھی آج وہ بہت خوش تھے اور میرا بے حد خیال رکھ رہے تھے۔ ان کی یہ شفقت آج مجھے شرمندہ کر رہی تھی ورنہ تو میں خود فرمائش کر کر کے ان سے لاڈ اٹھوایا کرتی تھی۔

''آئمہ! تمہاری امی جان نے مجھے بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت نے تمہاری زندگی پر دستک دی ہے۔ بیٹا! آگے بڑھ کر گرم جوشی سے اس رحمت کا استقبال کرو جس کا سب سے بہترین طریقہ یہ ہے کہ تم اپنے اس رب کی حمد وثناء کرو اور اس کا شکر ادا کرو۔'' وہ مجھے پیار سے دیکھتے ہوئے سمجھا رہے تھے۔ اب میں سمجھی کہ وہ اس قدر خوش کیوں ہیں۔ مجھے ان کی خوشی کی وجہ سمجھ آ گئی۔ مگر وہ دکھ..... وہ سانحہ جو اس خوشی کے پہلے ہی اظہار پر میرے دل پر گزرا۔ اس کا کیا؟ اس کی خبر کسی کو نہ تھی۔ میرے شب و روز جس اذیت کا شکار ہو چکے تھے اس کا اندازہ کوئی بھی نہ کر سکتا تھا۔

''اب تم ایسا کرو کہ اپنے گھر واپس چلی جاؤ۔ مجھے یقین ہے احمد کو اگر تم پر کچھ ناراضگی ہے تو وہ اتنی بڑی خوش خبری کے بعد سب بھول جائے گا۔''

وہ میری پلیٹ میں ایک اور فرائی انڈہ ڈالتے ہوئے مجھے سمجھا رہے تھے۔

''ابا جان! میں اور نہیں کھا سکتی۔'' میں نے دوسرا انڈہ واپس رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''یہ سب اب بند ہونا چاہیے۔ دل نہیں چاہ رہا۔ کھایا نہیں جائے گا۔'' انہوں نے مجھے

پیار سے ڈانٹتے ہوئے انڈہ واپس میری پلیٹ میں پلٹا۔

''اب تمہیں اپنی خوراک کا خاص خیال رکھنا ہوگا۔ میں دیکھ رہا ہوں تمہاری صحت بے حد گر گئی ہے۔''

انہوں نے میرے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے مجھے اس کا احساس دلایا۔

''فاطمہ! اسے سی۔ ایم۔ ایچ لے جاؤ ڈاکٹر فائزہ قریشی سے بہتر گائنا کالوجسٹ میرے خیال میں یہاں اور کوئی نہیں ہوگی۔''

وہ اپنی ہی دھن میں بولے جا رہے تھے۔ اپنی پلیٹ پر جھکے جھکے میں نے کنکھیوں سے دیکھا آج ان کے چہرے پر ایک عجیب سی سرخی دوڑ رہی تھی اور اس خوشی کا جوش ان کے انداز سے صاف طور پر جھلک رہا تھا۔ ورنہ تو تین روز قبل وہ احمد کے جانے کے بعد تو بے حد بیمار نظر آنے لگے تھے۔ ان کے کندھے کیسے جھک گئے تھے۔ لگتا تھا میں واقعی ایک بوجھ کی طرح ان کے کمزور پڑتے اعصاب پر آن پڑی تھی۔ انہوں نے مجھے زبردستی ٹھیک ٹھاک ناشتہ کروایا اور میرے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھ کر بولے۔

''اللہ نے میری دعائیں سن لی ہیں۔ تمہیں اولاد کی نعمت سے نواز کر وہ مجھ بوڑھے کو بھی ترسا کر نہیں مارے گا۔ تمہیں مبارک ہو۔ جاؤ اپنے گھر جانے کی تیاری کرو اللہ تمہیں آباد رکھے۔'' انہوں نے اتنی محبت سے مجھے دعا دی کہ میرا اس وقت خود پر قابو رکھنا مشکل ہو گیا۔ جی چاہا ان کے گلے سے لگ جاؤں اور اتنا روؤں کہ میرے اندر کا سارا دکھ بہہ جائے۔ میرا اندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا میرے حلق میں آ پھنسا اور میری آنکھیں اس نمکین پانی کو چھلکنے سے قاصر ہو گئیں۔ میں نے ایک لمبی سانس کھینچ کر اپنی ناک میں روک لی۔ تاکہ میری آنکھوں کا پانی کنارے نہ توڑ سکے۔

''جاؤ مومی! جا کر اپنی اس خوشی کو اپنے شوہر کے ساتھ انجوائے کرو کہ وہ اس کا حقدار ہم سب سے زیادہ ہے۔'' آج ان کی آواز فرط انبساط سے رندھ رہی تھی۔ وہ مجھے دعا دے کر چلے گئے۔ شاید میری طرح ان سے بھی اپنی آنکھوں کا پانی روکنا مشکل ہو رہا تھا۔ ان کی آنکھوں میں خوشی کا میٹھا، ٹھنڈا چشمہ پھوٹ رہا تھا جبکہ میری آنکھیں نمک سے بھری ہوئی تھیں۔

❀❀❀

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھر امی جان نے میری ایک نہ سنی۔

''دیکھو میری جان! اب یہ وقت تمہارا یوں ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھنے کا نہیں ہے نہ ہی انا..... یا خودی نام کے خود ساختہ پودوں کی پرورش کا ہے۔ تمہارا شوہر تم سے نہ صرف ناراض ہے بلکہ بدظن ہے۔ وہ بھی تمہاری اپنی حرکتوں کی وجہ سے تو اب تمہارا خود کو جھکانا کچھ معنی نہیں رکھتا بلکہ اسے منانے کے لیے اگر تمہیں مٹی بھی ہونا پڑے تو گریز نہ کرنا۔''

''مگر امی جان! وہ مجھے دیکھنے پر بھی تیار نہیں ہیں اور آپ مجھے گھر واپس بھیجنے پر مُصر ہیں۔'' میں نے اپنی ہچکچاہٹ کی وجہ بتائی۔

''تم گھر چلی جاؤ گی تو وہ تمہیں گھر سے تو نہ نکالے گا۔ بلکہ جاؤ اور جا کر اپنی ساس کو یہ خوش خبری سناؤ۔ اگر ہو سکے تو انہیں سب سچ بتا دو۔ وہ ایک سمجھدار خاتون ہیں یقیناً بیٹے کو سمجھا لیں گی۔'' امی جان نے مجھے ایک اور راستہ دکھایا۔

''اماں جان'' ساس کا خیال آتے ہی مجھے ان کا مشفق رویہ اور وہ محبت یاد آ گئی جو انہیں مجھ سے تھی۔

''چلو اٹھو اپنے جانے کی تیاری کرو۔'' وہ میرے چہرے پر امید کی کرن دیکھ کر مسکرائیں۔

''کیا آپ میرے ساتھ چلیں گی؟'' مجھے پتہ نہیں کیوں آج اپنے گھر واپس جاتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔

''نہیں..... تم خود جاؤ گی۔ ڈرائیور تمہیں چھوڑ آئے گا۔ اچھی بیٹیاں اپنے گھروں کے معاملات خود سلجھاتی ہیں۔ بات بات پر والدین کو ان میں شامل کر کے ان کی عزت اور اپنا بھرم خراب نہیں کرتیں۔'' انہوں نے میرے ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے پیار سے کہا۔

''مگر میں گھر جا کر کہوں گی کیا؟ اتنے روز سے یہاں آئی ہوئی ہوں..... اب؟'' مجھے اب بھی حوصلہ نہ مل رہا تھا گھر میں تنہا واپس جانے کا۔

''یہ تم سوچو گی۔ اب تو تمہیں نہ صرف سنجیدہ ہو جانا چاہیے بلکہ ذمہ دار بھی بننا ہوگا۔'' انہوں نے میری نیّا کو آس کی پتوار ضرور تھمائی مگر منجدھار سے اسے نکالنے کے لیے اپنا ہاتھ مجھے نہ دیا۔ اس کی ہمت مجھے ہی بازوؤں میں پیدا کرنی تھی۔

''چلو اب فضول کے خیالات کو ذہن سے جھٹکو اور جانے کی تیاری کرو۔'' وہ میرے سر پر ہلکی سی چپت لگا کر مجھے خیالوں میں گم دیکھ کر ذرا ڈانٹتے ہوئے بولیں۔

''امی جان! سنیں تو.....'' انہیں جاتا دیکھ کر میں نے انہیں پھر پکارا۔ وہ وہیں پر رُک کر میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگیں۔

''وہ ابا جان نے ڈاکٹر فائزہ کے پاس جانے کو کہا تھا۔'' میں نے آج کا پروگرام تبدیل کرنے کی غرض سے ان کی توجہ اس طرف کروائی۔

''وہ تم اپنے میاں صاحب کے ساتھ جانا۔ یا پھر اپنی ساس اماں جان کے ساتھ اب یہ تمہارے گھر کا معاملہ ہے بہتر ہے وہ لوگ اپنی مرضی اور خوشی سے جہاں چاہیں تمہیں لے کر جائیں۔'' وہ نرمی سے بولیں۔

''مگر امی جان! بیٹیوں کے بچوں کی پیدائش کے معاملات ان کے چھلے وغیرہ یہ تو میکے والے ہی کرتے ہیں۔'' میں ایک پل میں ہی بڑی عام سی سوچ والی روایتی بیٹی بن گئی۔

''یہ ایک فضول کی رسم بن کر رہ گئی ہے جو بے چارے میکے پر خواہ مخواہ ہی لاد دی جاتی ہے ورنہ یہ ذمہ داری دراصل تو خالص بچے کے والد کی ہوتی ہے اور سسرال والے اگر صاحبِ حیثیت اور محبت کرنے والے ہوں تو انہیں اچھا لگتا ہے کہ بہوئیں اتنے اہم معاملے پر ان کے مشورے لیں۔'' امی جان نے مجھے پیار سے سمجھایا۔ ''یہ سب بعد کا مسئلہ ہے۔ ابھی تم جا کر وہاں کا ماحول بدلو۔ بعد میں اگر تمہارے شوہر نے بخوشی اجازت دی تو میری سر آنکھوں پر.....'' امی جان جا کر میرے ساتھ بھیجنے والی چیزیں پیک کرنے لگیں اور میں اپنی تیاری کرنے لگی۔

❀❀❀

میں اپنے گھر کے پورچ میں کھڑی تھی۔ ہمارا ڈرائیور گاڑی میں سے سامان اتار رہا تھا۔ جس میں میرے ایک بیگ کے علاوہ پھلوں کی ایک ٹوکری اور مٹھائی کے علاوہ گاجر کا حلوہ، انڈوں کا حلوہ اور جانے کیا کچھ تھا جو امی جان نے بڑی محبت سے احمد کے لیے بنایا تھا وہ مجھے کبھی واپس خالی ہاتھ نہ آنے دیتی تھیں اپنی ڈھیروں محبتوں بھری دعاؤں کے ساتھ ساتھ ایسے تحائف بھی بھیجا کرتی تھیں جن میں سے ''حلوے'' احمد کو بے حد پسند تھے۔ احمد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیٹھا شوق سے کھاتے تھے اور میری امی جان سے اکثر وہ فرمائش کر کے یہ حلوے بنوایا کرتے تھے۔ اس بار انہوں نے فرمائش نہیں کی تھی مگر امی جان نے یہ حلوے پہلے سے کہیں زیادہ محبت اور توجہ سے یہ سب بنا کر دیا تھا۔

''آئیں بیٹا! اندر چلیں۔'' ڈرائیور چاچا سارا سامان کار کی ڈگی سے نکال چکے تو بڑے ادب سے مجھے کہنے لگے۔

''جی..... جی چاچا۔'' میرے من من کے وزنی قدم بمشکل اندر کی طرف بڑھنے لگے۔

''چھوٹی مما آ گئیں۔ چھوٹی مما آ گئیں۔''

عمید جو باہر لان میں فٹ بال کھیل رہا تھا مجھے دیکھتے ہی شور مچاتا ہوا میری طرف بھاگا آیا اور آ کر میری ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

''چھوٹی مما! آپ اتنے دنوں سے کہاں تھیں۔ میں آپ کو یاد کرتا تھا۔'' وہ بڑی لگاوٹ سے اپنے جذبات کا اظہار کرنے لگا۔ (وہ اب کچھ عرصے سے مجھے چھوٹی مما کہہ کر پکارا کرتا تھا) مجھے آج اس پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ اس نے کتنے جوش سے بغیر کسی خفگی سے میرا استقبال کیا تھا۔

''بتائیں ناں چھوٹی مما..... آپ کہاں تھیں؟'' وہ میرا ہاتھ کھینچ کر میری توجہ اپنی طرف کرواتا ہوا پھر بولا۔

''میں آپ کی نانو کے گھر گئی ہوئی تھی۔'' میں نے اسے گود میں بھر کے اٹھا لیا اور اس کے پھولے ہوئے گالوں پر بوسہ دیتے ہوئے بولی۔ آج اسے بوسہ دیتے ہوئے میرے اندر ایک عجیب سی سرشاری کی لہر دوڑی تھی۔ جیسے کسی نے میرے اندر سے مجھے ایسا ہی محبت بھرا جواب دیا ہو۔ چند لمحوں کو میں اور سب کچھ بھول گئی۔ پھر اسی سرشاری کے ساتھ اپنے گھر کے اندر داخل ہو گئی۔

''السلام علیکم۔'' اندر لونگ روم میں سامنے ہی اماں جان مجھے نظر آ گئیں وہ کام والی ماسی کو ٹھیک طرح سے جھاڑ پونچھ کرنے کی ہدایت کر رہی تھیں۔

''وعلیکم السلام۔'' اماں جان نے میرے سلام کا سرسری سا جواب دیا اور دوبارہ ماسی سے باتیں کرنے لگیں۔

''اس کا مطلب ہے احمد نے اپنی ماں کو سب بتا دیا ہے اور وہ بھی مجھ سے ناراض

ہیں۔'' میرے جی پر ان کے سرد رویے کی وجہ سے ایک گھونسہ سا پڑا۔

''دیکھو میری بیٹی! اب تم گھر جاؤ گی تو ہو سکتا ہے تمہیں وہ محبت نہ ملے جو پہلے ملا کرتی تھی۔ اپنا دل میلا نہ کرنا بلکہ اپنی محبت کو تازہ کر کے ان کے دلوں کا میل صاف کرنے میں جت جانا۔''

اس سے پہلے کہ میں بد دل ہو کر اس پہلے ہی قدم پر اپنی ہمت ہارتی مجھے اپنی ماں کی نصیحت یاد آئی جو انہوں نے مجھے خدا حافظ کہتے ہوئے کہی تھی۔

''کیسی ہیں آپ؟'' میں نے عمید کو گود سے اتار کر ان کے سامنے سر جھکاتے ہوئے پوچھا۔

''اللہ کا شکر ہے۔ تم کہو تمہاری امی جان کیسی تھیں؟'' اماں جان نے میرے سر پر ڈھیلا سا ہاتھ پھیرتے ہوئے میرا حال پوچھنے کی بجائے میری امی جان کی خیریت دریافت کی۔

''جی وہ بالکل ٹھیک تھیں اور آپ کو سلام کہہ رہی تھیں۔'' میں نے ان کے روکھے پن کو نظر انداز کر کے پیار سے جواب دیا اور وہیں پر ان کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ ماسی سے باتیں کر کے فارغ ہوئیں تو میری طرف منہ کر کے پوچھنے لگیں۔

''کیا ہو گیا تھا تمہاری طبیعت کو؟'' ان کا لہجہ خاصا تیکھا تھا میری انا کہنے لگی لیکن مجھے غصہ نہ آیا بلکہ میں خوشی اور جوش سے آگے بڑھ کر ان کے گلے سے لگ گئی۔

''مبارک ہو اماں جان آپ دادی بننے والی ہیں۔'' میں نے بغیر سوچے سمجھے کہ اس کا ردِعمل کیا ہو گا انہیں یہ خوش خبری سنا دی۔

''ہاں اماں جانا..... اللہ کا احسان ہے کہ میں.....'' میرا کانپتا ہوا لہجہ مزید الفاظ ادا نہ کر سکا اور میں ان کا چہرہ خوشی سے تکنے لگی۔

''کیا..... کیا کہا تم نے؟'' ان کے ہاتھ اٹھے اور انہوں نے میرے کندھوں کو سختی سے پکڑ لیا۔ ان کے ہاتھوں کی انگلیاں میرے کندھوں میں پیوست ہو رہی تھیں۔

''جی اماں.....'' میں نے خوفزدہ ہو کر اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ مجھ میں ان کی آنکھوں کو دیکھنے کی سکت نہ تھی۔ خدا جانے وہ خشمگیں تھیں یا گلچیں۔

''یعنی تم ماں بننے والی ہو۔ اور میرا احمد.....'' انہوں نے مجھے ایک ہلکا سا جھٹکا دیا۔ وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شاید یہ یقین کرنا چاہتی تھیں کہ میں ہوش میں تو ہوں جواب میں میرے منہ سے سوائے ''ہوں'' کے اور کچھ نہ نکلا اور میں نے اپنی آنکھیں زور سے بھینچ لیں۔ میرا دھڑ دھڑ کرتا ہوا دل ایک دم سے بند ہو چکا تھا اور میری ساعتیں ان کی طرف کچھ سننے کو منتظر تھیں۔ شاید کچھ بُرا بھلا۔ کچھ صلواتیں یا پھر احمد کی طرح کوئی الزام میرے پاؤں کے تلوے میں اس لمحے اتنی شدت سے جلن ہوئی۔ جیسے کوئی لال سرخ انگارہ اس میں دھنس گیا ہو۔

''سس.....سی.....ی.....ی.....سی.....'' میری رکی ہوئی دھڑکنوں سے بے ساختہ اک ''سی'' نکلی۔ شدت درد کے اظہار میں اک بے ساختہ سی..... جو سسکی بھی بن سکتی تھی۔

اماں جان کی خفگی دیکھ کر مجھے لگا تو یہی تھا کہ احمد نے انہیں شاید سب کچھ بتا دیا ہے لیکن احمد نے انہیں سوائے اس کے کچھ اور نہ بتایا تھا کہ میری طبیعت خراب تھی اس لیے میں اپنی امی جان کی طرف چلی گئی۔ اور پھر جب میں احمد کے ساتھ ان کے پاکستان واپس آ جانے پر بھی نہ آئی تھی تو احمد نے ان سے یہ بہانہ کر دیا تھا کہ میں اپنے تنظیمی کام کے سلسلے میں اسلام آباد گئی ہوئی ہوں جس پر وہ مجھ سے بے حد خفا تھیں۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر تھا کہ انہوں نے میرے بارے میں انہیں وہ کچھ نہ بتایا تھا جو وہ خود سمجھ رہے تھے۔

''آئمہ! تم سچ کہہ رہی ہو ناں؟'' امی جان مجھے بار بار پوچھ رہی تھیں۔

''جی امی جان بالکل سچ.....'' انہیں خوش دیکھ کر جب مجھے اطمینان کی سانس آئی تو میرے تلوے میں دھنسا انگارہ فوراً ہی پھول بن گیا۔

''کب..... کیسے؟ کیا تم نے احمد کو بتایا؟'' وہ تو جیسے یہ خبر سن کر خوشی سے دیوانی ہو رہی تھیں۔

''جی..... وہ مجھے خود ابھی پتہ چلا ہے۔ ڈاکٹر منور نے بتایا تو میں فوراً گھر چلی آئی احمد کو تو۔''

یہاں میں نے مصلحتاً جھوٹ بولا کہ اگر میں ان سے یہ کہتی کہ احمد جانتے ہیں تو وہ سچ مچ ناراض ہو جاتیں کہ بیٹے اور بہو دونوں نے انہیں کیوں نہیں بتایا اور مجھ سے غلطی یہ ہو گئی کہ میں نے انہیں اسی وقت کیوں نہ بتا دیا جب مجھے پتہ چلا تھا۔ بے شک احمد منع کر رہے تھے مگر میں طریقے سے اماں کو بتا دیتی تو میری امی جان کہہ رہی تھیں معاملہ اتنا نہ بگڑتا۔ اماں جان

تبھی اسے سنبھال لیتیں۔ تب مجھ سے تو ہمیشہ سے غلطیاں ہی ہوتی آئی تھیں یقیناً اس لیے کہ میں نے کبھی خود سے زیادہ نہ کسی کو سمجھا تھا نہ ہی اہمیت دی تھی۔ مگر اب..... اب میں نے سوچ لیا تھا کہ میں اپنے کیے کو ہر حال ہی میں ''اچھا'' کروں گی۔ اب میں خود سے زیادہ دوسروں کو اہمیت دوں گی کہ اسی اصول پر شادی شدہ عورتوں کی زندگیوں میں مسائل کم ہو سکتے ہیں ورنہ نہیں۔ کچھ ہی دیر میں اماں جان نے یہ خوش خبری گھر کے ایک ایک فرد کو سنائی دی تھی۔ جس کے نتیجے میں ثریا بھابی اور مائدہ بھابی تو تب سے مجھے چپک کر رہ گئی تھیں۔ وہ خوش تھیں بے حد خوش مجھے مبارک دینے کے ساتھ ساتھ وہ اور بہت سی باتیں سمجھا رہی تھیں۔ سارا گھر لگتا تھا خوشی سے بوکھلا گیا ہے۔ بلکہ بے صبرا ہو گیا ہے اور ان کے لیے آنے والے وقت کا انتظار کرنا مشکل ہو رہا ہے۔

''اچھا تم اندر تو چلو..... اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔ میں صدقے کے لیے بکرا تو لانے کو کہوں۔ ارے وہ نادرہ کو بھی یہ خوش خبری سناؤں۔ وہ تو احمد کے لیے لڑکیاں دیکھنی بند کرے کہیں کسی کے گھر بات ہی نہ چلا لے۔''

اماں جان نے مجھے پیار کرتے ہوئے کہا۔

''احمد کے لیے لڑکیاں؟'' میرا کلیجہ پھر منہ کو آ گیا۔ یعنی میرے بعد گھر میں یہ قصہ چل نکلا تھا۔ بلکہ یہاں تک پہنچ گیا تھا۔ مجھے یہ سوچتے ہی جھرجھری سی آ گئی۔ ''اللہ رکھے میری آئمہ کی جگہ کوئی دوسری بھلا لے سکتی ہے۔'' اماں جان نے پھر سے میری بلائیں لیں۔

''معاف کیجیے گا اماں جان! لے تو سکتی تھی کوئی اور یہ جگہ اگر اللہ پاک اپنا کام نہ کرتے تو۔'' ثریا بھابی نے ہنستے ہنستے مذاق سے کہا۔

''میرے اللہ ہی کو تو یہ منظور نہ تھا ورنہ بندہ تو واقعی بہت بے صبرا ہے اور دوسرے راستے جلدی ڈھونڈنے لگتا ہے۔''

اماں جان نے ثریا بھابی کی بات کا بُرا ماننے کی بجائے ہنستے ہوئے ہی جواب دیا۔ میں اس سے آگے ان میں سے کسی کی بھی بات نہ سن سکی۔ میرے کان اسی ایک نقطے پر سائیں سائیں کرنے لگے۔

''یہ تو اللہ ہی کو منظور نہ تھا ورنہ۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ورنہ تو کوئی دوسری.....کوئی دوسری۔"

میرے دماغ میں اک شور برپا ہوگیا تھا۔ میری سوچنے کی سب صلاحیتیں ایک بوجھ کی رسی کی طرح تنتی جارہی تھیں۔ جس پر کسی نے پانی کا چھڑکاؤ کر دیا ہو اور وہ اکڑ کر اتنی تن گئی ہو کہ اس کے اردگرد کی چھوٹی چھوٹی پھانسیں بھالے جیسی تیکھی ہوگئی ہوں۔

"یہ تو اللہ ہی کو منظور نہ تھا ورنہ؟" میرے دائیں پاؤں کے تلوے میں چبھی اک ایسی ہی برسوں پرانی پھانس کا بھالے جیسا منہ میری سوچ کے اس سے اگلے سارے پَرکاٹتا چلا گیا۔

❁❁❁

اگلے چند ہی منٹوں کے بعد میں جائے نماز پر تھی۔ اب گھر میں کیا ہو رہا تھا۔ اماں جان نے نادرہ آنٹی کو فون کر کے کیا کہا تھا۔

کوئی صدقے کے لیے بکرا لے آیا تھا یا نہیں۔

کسی نے احمد کو میرے آنے کی اطلاع دے دی تھی یا نہیں۔

مجھے نہ تو کسی بات کی خبر تھی اور نہ ہی مجھے اس سے کچھ لگاؤ۔ میں تو اپنے ذہن میں لگی اسی گرہ کے ساتھ بندھی بس جائے نماز پر پڑی تھی کہ۔

"یہ تو اللہ ہی ہے۔"

آج میری ماں نے مجھے نماز کی تاکید نہ کی تھی۔ آج تو کسی نے میرے ہاتھ پیر باندھ کے مجھے ڈال دیا تھا۔ میں نے کون سی نماز پڑھی۔ کتنی رکعتیں، ان رکعتوں میں کتنی سورتیں، کتنی آیتیں، مجھے کچھ خبر نہ تھی۔ میں تو بس پڑی تھی۔ میرا دل میری آنکھوں میں تھا جو جھر جھر بہہ رہی تھیں۔ اور میرا دماغ میرے ہونٹوں پر جو آج با آواز بلند بول رہا تھا۔ وہ آواز جسے میری سماعتوں میں دھڑکتی میری شہ رگ سن رہی تھی۔

"اے اللہ! تُو ہے بلکہ تُو ہی تو ہے.....جو مجھے اس دنیا میں سب سے زیادہ چاہتا ہے جسے میرا خیال سب سے زیادہ ہے۔

میرے مالک! تیرا حکم مجھ گناہ گار کے لیے کتنا زیادہ ہے۔ حالانکہ میں تو تیری صریحاً نافرمانی کرتی رہی ہوں۔

میں نے ہمیشہ تیری دی ہوئی نعمتوں کو تیری مرضی کے خلاف استعمال کر کے تیرے

غضب کو بھڑکایا ہی ہے۔ مگر۔

اے حلیم آقا! تُو نے مجھے نہ صرف برداشت کیا بلکہ مجھ پر رحم بھی کیا۔

میرے اللہ! تُو نے مجھے دنیا کی عظیم ترین نعمت سے پھر بھی نواز دیا۔ جب ساری دنیا میرے گھر کو اجاڑنے میں جت گئی تو تُو نے اس کی بنیاد کو پھر سے مضبوط کرنے کی سوچی۔

میں نے اپنے بُرے اعمال کے ہاتھوں نہ صرف دوسروں کو بلکہ خود کو بھی ذہنی اذیتوں میں مبتلا کر دیا اور تُو نے مجھے ایک ہی خبر سے نجات دے دی۔

اے رب! مجھے میری تمام مسلسل نافرمانیوں، نمک حرامیوں کا اقرار ہے بے شک میں اس قابل نہیں ہوں کہ تیرے دربار میں حاضری دوں۔ میرے قدم ہمیشہ رک جاتے تھے کہ آخر کس منہ سے آؤں؟

مگر اے میرے مالک!

تُو نے مجھے خود اپنے آپ سے جوڑ لیا۔ تیرے "کُن" نے مجھ جیسی بدبخت کی زندگی کو خوش بختی کے نور سے بھر دیا۔

اے اللہ!

میں تجھ سے تیرا بے پناہ رحم و کرم تیرے عفو و درگزر کی وسعتیں مانگتی ہوں۔ مجھ عاصی و گناہگار کو پناہ دے دے میرے مولا! مجھے معاف کر دے۔ مجھے معاف کر دے۔"

❁❁❁

احمد کو یہ توقع نہ تھی کہ میں یوں گھر واپس آجاؤں گی۔ شام کو وہ گھر آئے تو نہ صرف مجھے بلکہ گھر کے پورے ماحول کو بدلا ہوا پا کر خوش ہونے کی بجائے پریشان ہوگئے۔ بلکہ چڑ گئے۔ میں دیکھ رہی تھی اماں جان جس قدر اسے خوش ہو کر بار بار چوم رہی تھیں مبارکبادیں دے رہی تھیں وہ اسی قدر ہچکچا رہے تھے۔

"میرا تو یہی بیٹا ہے۔" انہوں نے عمید کو اٹھا کر گود میں بٹھاتے ہوئے کہا۔ میں جانتی تھی وہ یہ مجھے جلانے کے لیے کہہ رہے ہیں۔ ان کے لہجے کا طنز مجھے کاٹنے کے لیے تھا مگر میں..... میں تو اپنے پہلو میں ٹھیک ویسی ہی گدگداہٹیں محسوس کر رہی تھیں جو انہیں عمید کو چھیڑ کے محسوس ہوتی تھیں مجھے اب عمید سے حسد کی بجائے محبت کا احساس ہونے لگا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اللہ رکھے یہ بھی تمہارا ہے۔ سچ ہے بڑے ہی مقدروں والا ہے میرا بچہ جیسے ہی آپ نے اسے گود لینے کا فیصلہ کیا اللہ نے آپ کو خود صاحب اولاد کرنے کی عندیہ دے دیا۔'' ثریا بھابی نے اپنے بچے کی نظر اتارتے ہوئے کہا۔

''ہاں یہ تو ہے۔'' اماں جان نے بھی جھٹ پوتے کی بلائیں لیں۔

''اچھا اماں جان اب میں بہت تھک گیا ہوں ذرا آرام کروں گا۔'' احمد جلد ہی محفل سے اٹھ گئے۔

''یار کھانا لگا ہے۔ کھانا تو کھالو۔ آج اماں نے تمہاری خوشی پر سب کو اکٹھا کیا ہے۔'' بڑے بھائی جان نے احمد کو دوبارہ بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ کھانے کی میز پر بھی وہ بس زبردستی ہی منہ میں ڈال رہے تھے۔ میں اگر ان کی پلیٹ میں کچھ ڈالنے کی کوشش کرتی تو وہ مجھے خشمگیں نگاہوں سے گھورتے ہوئے بڑے سپاٹ انداز میں کہتے۔

''تھینکس..... میں خود لے لوں گا اگر کچھ چاہیے ہوگا۔''

وہ مجھے نظر انداز کر رہے تھے اور میں ان کی نگاہوں میں اُتر جانے کی پوری کوششوں میں تھی۔ حالانکہ جانتی تھی کہ اب یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ انہوں نے بمشکل باقی گھر والوں کا ساتھ نبھایا جیسے ہی ان لوگوں نے کھانے سے ہاتھ کھینچا احمد بھی فوراً اٹھ گئے۔

''پلیز ایکسیوزمی۔ میں کافی یا قہوہ نہیں لوں گا۔''

''کیوں..... کیوں خیر تو ہے۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' بڑی بھابی جان نے فکر مندی سے مڑ کر احمد سے پوچھا۔ وہ کافی بنانے ہی جا رہی تھیں۔

''بس بھابی آج میری طبیعت ذرا بھاری سی ہے۔ کھانا بھی آپ لوگوں نے زبردستی کھلا دیا۔ لگتا ہے قے ہو جائے گی۔'' احمد نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ان کی شکل سے ہی لگ رہا تھا کہ واقعی ان کی طبیعت خراب ہے۔

''کمال ہے بھئی تم دونوں میاں بیوی کی انڈرسٹینڈنگ..... طبیعت بھی ایک جیسی کر لی ہے تم دونوں نے۔'' بڑے بھائی نے احمد کی ''طبیعت بھاری'' کہنے پر ذومعنی سے کہا۔ جس پر دونوں بھابیاں ہنس دیں اور مجھے حیاء آ گئی میں نے اپنی مسکراہٹ چھپانے کو دوسری جانب چہرہ گھما لیا۔ میرا سسرال اگرچہ بڑا روادار اور رکھ رکھاؤ والا تھا مگر یہ لوگ اتنے آزاد خیال تو

تھے کہ ایسے چھوٹے موٹے ہنسی مذاق آپس میں بلا تکلف کر لیتے تھے۔

''بھائی جان! جو آپ سمجھ رہے ہیں وہ تو ابھی کنفرم بھی نہیں ہو سکتا ہے آئمہ کو اس کی ڈاکٹر نے کوئی خوش فہمی دلا دی ہو۔ آخر کو اس کی گہری دوست ہے۔''

احمد نے اسی سپاٹ انداز میں کہا اور پھر وہاں رکے بغیر اپنے کمرے کی طرف چلے گئے البتہ میں ایک دم سے سب کے سامنے روہانسی ہو گئی۔ احمد کی یہ چوٹ میرے دل سے زیادہ اس وقت میری ذات پر پڑی تھی۔

''آئمہ! کیا احمد تمہارے ساتھ ڈاکٹر کے پاس نہیں گیا تھا؟''

اماں جان نے بھی پریشان ہو کر مجھ سے پوچھا۔

''وہ..... وہ گئے تھے میرے ساتھ۔'' اب میری زبان سچ کے اقرار پر بھی لڑکھڑا جاتی تھی۔

''وہ مہ نور ہی ہے نا تمہاری گائنا کالوجسٹ.....؟'' ثریا بھابی نے بھی جیسے کچھ تصدیق چاہی۔

''جی..... جی..... وہی ہے۔'' میں تو سب کی نظروں کا وہم بن گئی۔

''ثریا! ذرا تم کل آئمہ کے ساتھ دوبارہ کلینک چلی جانا۔ بلکہ تم اسے CMH بھی لے جانا، اچھا ہے دو ڈاکٹروں کی رائے ہو جائے تاکہ کچھ وہم نہ رہے۔'' اماں نے تو ثریا بھابی کے ذمے ہی لگا دیا کہ میری بات کی پوری تصدیق کر کے آئیں۔ میں اتنی بے وقعت اتنی بے اعتباری اتنی کمتر کہ مجھے اپنی خوشی کو ثابت کرنے کے لیے بھی گواہیاں دینی پڑ رہی تھیں۔

''جی اماں جان.....'' پہلے ثریا بھابی نے اور پھر میں نے بھی یہی کہا۔ کہ اب تو میری ''میں'' کے سارے بل ایک ایک کر کے کھلنے ہی تھے اور میرے پاس سوائے ایک ''جی ہاں'' کے اور کچھ چارہ بھی نہ تھا۔

❀❀❀

''ویری گڈ..... واہ..... واہ!'' میں کمرے میں گئی تو مجھے دیکھتے ہی احمد نے تالیاں بجاتے ہوئے داد دینے والے انداز میں کہا۔

''اچھی ایکٹنگ کر لیتی ہو۔ خوب ڈرامے بازی آتی ہے تمہیں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ مجھے سر سے پاؤں تک بڑی کٹیلی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ میں نے چاہا کہ میں ان سے کہوں۔ ''احمد! میں ایکٹنگ نہیں کر رہی آپ کی قسم احمد! آپ کی آئمہ ویسی نہیں ہے جیسی آپ نے سمجھنا شروع کر دیا ہے۔'' لیکن میں نہ کہہ سکی اور خاموشی سے وارڈ روب کی طرف بڑھ گئی۔ ان کا سلیپنگ سوٹ نکالا اور ان کی طرف بڑھا دیا۔

''او..... پلیز..... پلیز..... میرے کام کرنے کی تکلیف نہ کیا کریں آپ..... مجھے اچھا بھی نہیں لگتا کہ آپ میری کسی چیز کو چھوئیں۔'' انہوں نے ہینگر میرے ہاتھ سے گھسیٹتے ہوئے ایک ایک لفظ اپنی نفرت کی شدت کے اظہار میں چبا چبا کر کہا۔

میں تب بھی چپ رہی اور ان کے سلیپر بیڈ کے نیچے سے نکال کر ان کی طرف سرکا دیئے۔

''او شاپ اٹ..... کیا چاہتی ہو تم..... میں پاگل ہو جاؤں؟''

انہوں نے مجھے کندھوں سے تھام کر جھنجھوڑ ڈالا۔ ''جاؤ..... جاؤ یہاں سے پلیز! مجھے اور بے وقوف مت بناؤ۔'' وہ منہ پھیر کے کھڑے ہو گئے۔

''احمد! آپ صرف ایک بار..... صرف ایک بار مجھے معاف کر دیں۔ مجھ سے اور کچھ بھی نہ بن پڑا۔'' میں ہاتھ باندھ کر ان کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

''معاف کر دوں گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ وہ شخص ہے کون..... جس نے تمہیں یہ اعزاز بخشا اور مجھے ذلت.....؟'' وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے مجھ سے پوچھ رہے تھے۔ انہوں نے میرا دل اپنی نفرت کی کند چھری پر رکھ دیا تھا اور میری زبان ایک ایسے سوال کے نیزے میں پرو دی تھی۔ جس کا جواب میرے لہو کا آخری قطرہ بھی نہ دے سکتا تھا۔ بہتان کی صلیب پر لٹکتا میرا وجود جان کنی کے عذاب سے دوچار تھا اور میں وہ سچ ثابت نہ کر پا رہی تھی جو میری بخشش کی نوید ہو سکتا تھا۔ ''کہو.....'' اب زبان پر تالے کیوں پڑ گئے؟ وہ مجھے جھنجھوڑ رہے تھے۔

''آپ احمد! آپ صرف آپ..... آپ کی قسم آپ کے سوا کوئی نہیں۔'' میری ادھ کٹی زبان سے آدھی بات ہی نکلی۔ میں کہنا چاہتی تھی کہ خدا جانتا ہے آئمہ کے خیال یا احساس کو کبھی احمد کے سوا کسی کے خیال نے چھوا تک نہیں۔ مگر اب جو خدا جانتا تھا وہ ہی میرا گواہ تھا اس لیے

میں نے اپنی گواہی خود نہ دی۔

''خبردار! میری قسم مت اٹھانا۔ مجھے تمہارا اعتبار کسی قسم سے نہ آ سکے گا۔'' انہوں نے زندگی میں پہلی بار غصے اور نفرت سے میرے بالوں کو مٹھی میں بھر کے انہیں جھٹکا دیا۔ وہ بھی بس اتنا کہ میری گردن سے ریڑھ کی ہڈی تک اک کرنٹ دوڑا۔ جس نے میری ساری خوش گمانی ایک ہی پل میں ٹھکانے لگا دی۔ ان کے تیور ان کے اندر اٹھے ہوئے جوار بھاٹے کی نشاندہی کر رہے تھے۔ اب مجھے میری بربادی کے آثار صاف صاف دکھائی دے رہے تھے۔ احمد ایک محبوب سے ایک مرد بن چکے تھے۔ محض ایک مرد..... جو عورت کے ساتھ باپ بھائی یا شوہر جیسے رشتوں سے تو جڑا ہوتا ہے مگر جس کے دل کی ایک پتلی سی شریان بھی اس کے ساتھ ''احساس'' کے ناطے سے نہیں بندھی ہوتی۔ جو عورت کے ساتھ عمر بھر اپنے رشتے کی نوعیت سے ذمہ داری (وہ بھی کسی حد تک) تو نبھا لیتا ہے۔ جس کے بدلے میں وہ اس کا خراج بھی وصول کر لیتا ہے لیکن اس سے محبت نہیں کرتا۔ ''محبت'' جو ایک عورت کی سب سے بنیادی ضرورت ہے۔ جس کے بغیر ایک عورت زندہ نہیں رہتی بلکہ وہ بھی محض ایک تعلق دار بن کر رہ جاتی ہے۔ خواہ پھر وہ ماں ہو، بہن یا بیوی..... اور ان سب میں ایک بیوی کے لیے تو اپنے مرد (شوہر) کی محبت ناگزیر ہوتی ہے۔ ورنہ دونوں کے بیچ کچھ بھی نہیں رہتا اکثر وہ ازدواجی تعلق بھی نہیں۔ جس کی بنا پر وہ ایک ساتھ رہتے ہیں۔ مجھے بھی لگ رہا تھا کہ احمد اور میرے بیچ اب واقعی کچھ اور نہ رہے گا لیکن میں..... میں وہ عورت تھی جسے برسوں مرد کی محبت حاصل رہی تھی۔ جس کی سانسوں میں..... لہو کی حرارت میں..... وجود کے ریشے ریشے میں محبت بس چکی تھی۔ جس کے شوہر نے اسے لمحہ لمحہ محبت ہی سے سینچا تھا۔ اس کی محبت تو اسے اک نعمت غیر مترقبہ کی طرح مجھے ملی تھی۔ آہ..... مگر میں نے اس وقت اس کی قدر نہ کی تھی۔

''محبت۔'' جو رُوئے زمین کے لیے خدا کی عطا کردہ عظیم ترین نعمت ہے۔ اس کے ''کفران'' اللہ کی نظروں سے گر ہی جاتے ہیں اور جو اللہ کی نظروں سے گر جائے پھر بھلا اس کی جائے پناہ کہاں ہو سکتی ہے۔ احمد نے بھی اپنے دل کے سارے دروازے بند کر لیے تھے اور وہ زمین میرے پیروں تلے سے چھین لی تھی جس سے نمو پا کر میں اٹھلاتی تھی۔ اٹھکیلیاں کرتی تھی۔ اس نے میرے سر سے وہ آسمان بھی کھینچ لیا تھا جس سے برسنے والی چاہتوں اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قربتوں کی پھواریں مجھے شب و روز بھگوتی تھیں اور دنیا میں مَیں سر اٹھا کر چلتی تھی۔ میں تو خوش بخت تھی کہ کسی کی محبوبہ تھی۔ ایک پورا مرد پورا ایک جہان میری دسترس میں تھا۔ جس کی طنابیں دھڑکنوں کے زیر و بم سے بندھی تھیں۔

''احمد! آپ میرے ساتھ صرف ایک بار ڈاکٹر کے پاس چلیں تو سہی۔ مہ نور پر اگر آپ کو یقین نہیں تو کسی اور کے ہاں.....''

''اوشٹ اپ پلیز.....'' میری بات کو پورا سنے بغیر ہی انہوں نے مجھے ہاتھ اٹھا کر آگے کچھ کہنے سے روک دیا۔

''اب میں ڈاکٹروں کے سامنے ذلیل ہوتا پھروں..... بار بار خود کو صحت اور کاملیت کی کسوٹی پر رکھوں اور ان سے پوچھوں کہ میری اہلیت کتنی ہے؟'' وہ غصے میں پھنکارتے ہوئے پھر میری جانب بڑھے۔

''اچھا تم کیوں نہیں کرتیں ایک کام؟'' اب وہ میرے دل پر رکھی اس کند چھری کو ذرا اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولے۔ میرا آدھا کٹا ہوا دل لہولہان تھا اور دوسرا باقی کا حصہ مزید کٹنے کے لیے تیار۔

''جی کیا؟'' شدتِ درد سے میرے ہونٹ نیلے پڑنے لگے۔

''تم اس گناہ کی پوٹ کو کسی کلینک پر کیوں نہیں چھوڑ آتیں۔ تاکہ ہمارے بیچ کا ایک تنازعہ تو کٹے۔'' انہوں نے بڑی ہی بے دردی سے میرے دل پر کھینچا ہوا اپنا ہاتھ مخالف سمت میں بڑھا دیا بالکل اسی طرح جیسے آری کو چلانے کے لیے پہلے اپنی جانب کھینچنا اور پھر مخالف سمت دھکیلنا پڑتا ہے۔

''احمد پلیز.....'' ضبطِ غم کے مارے میرے منہ سے اک گھٹی گھٹی سی چیخ نکل گئی۔

''کیوں؟ کیا مشکل ہے؟'' ان کا ہاتھ پھر کھنچا۔

''میں ایک ماں ہوں۔ ایسا کیسے کر سکتی ہوں۔'' میں نے وجہ بتانی چاہی۔

''یعنی تمہیں یہ استحقاق حاصل ہے کہ تم اپنے مکمل عورت ہونے کا ثبوت پیش کرو۔'' وہ میرے اردگرد گھوم کر مجھے یوں دیکھ رہے تھے جیسے ٹھونک بجا رہے ہوں۔

''اور میں..... میں جسے رب نے ایک نسل کو تخلیق کرنے کا موجب بنا کر بھیجا ہے اس کا

کیا؟ اس میں اگر کوئی کمی بیشی رہ جائے تو تمہاری جیسی بے صبری، ناقدری اور کم ظرف عورتیں انہیں ذلیل کر کے رکھ دیں۔ دنیا کے سامنے ان کے بھید یا تو کھول کر ان کا جینا حرام کر دیں یا پھر اپنا آپ اتنا گرا دیں کہ یہ دھرتی بھی ان کے گناہ کا بوجھ نہ اٹھا سکے۔ میں تو ایک انسان ہوں۔ بہت کمزور سا ایک مرد.....'' میں نے دیکھا احمد کے لہجے کا گرم لوہا ایک دم سے ٹھنڈا پڑ گیا اور ان کی شعلے برساتی آنکھوں میں پانی بھر گیا۔

''عورت واقعی کم ظرف بھی ہوتی ہے اور ہرجائی بھی..... یہ واقعی کمتر ہے محبت کے لائق نہیں ہوتی۔'' ایسا کہتے ہوئے وہ جیسے ٹوٹ سے گئے۔

''گھن آنے لگی ہے مجھے تم سے..... اور شاید خود سے بھی۔'' انہوں نے اس کند چھری کو آخری بار فیصلہ کن انداز میں اپنی طرف کھینچا اور اس جھٹکے سے کھینچا کہ میرا ادھ کٹا اور ادھ لٹکتا ہوا دل..... دو حصوں میں بٹ گیا۔ گوشت کے دو لوتھڑے میرے وجود کے تختے پر تڑپنے لگے اور جان کنی کے عذاب کا عمل وہیں پتھر ہو گیا۔ یعنی میں آئمہ احمد حسن..... ایک زندہ لاش بن کر رہ گئی۔ یہ سوچتی ہوئی کہ کیا میرا گناہ قومِ فرعون جیسا تھا۔ کیا قدرت نے یہ سوچ لیا ہے کہ وہ مجھے نشانِ عبرت بنا کر چھوڑے گی؟

❁❁❁

مجھے کچھ سمجھ نہ آتی تھی کہ میں کیا کروں۔ احمد نے مجھ سے گھن کھا کر منہ پھیر لیا تھا حالانکہ اگلے روز ثریا بھابی میرے ساتھ CMH سے ہو آئی تھیں اور انہوں نے اس خوش خبری کی تصدیق کر دی تھی جسے میں سنا رہی تھی لیکن احمد کو کسی بات سے غرض نہ تھی۔ وہ جب مجھے بری طرح سے جھڑک اور جھٹک چکے تھے اور انہوں نے مجھے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا کہ وہ عنقریب مجھے شرعی طور پر فارغ کر کے میرے گھر بھیج دیں گے تو مجھے بھی لگنے لگا تھا کہ اب ایسا ہی ہو گا۔ میری حالت عجیب منافقت کا شکار ہو کر رہ گئی تھی میں گھر والوں کے سامنے ہوتی تو ہنسنے مسکرانے کی کوشش میں لگی رہتی۔ مگر جیسے ہی مجھے تنہائی میسر آتی میں خود پر قابو نہ پا سکتی۔ آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتیں اور میرا ٹکڑے ٹکڑے دل تڑپنے لگتا۔ میں کیا کروں؟

''یا اللہ! میں احمد کو کس طرح یقین دلاؤں؟

اپنی بے گناہی کیونکر ثابت کروں؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آج بھی نماز کے بعد میں رو رو کر دعا کر رہی تھی۔ توبہ استغفار کر رہی تھی۔ جب میرے دل کا ایک ٹکڑا میرے کان میں آ کر بولنے لگا۔ ایک عجیب بات یہ ہو گئی تھی کہ میرے پاؤں کے تلوے میں چبھی وہ معمولی پھانس جو کسی چھوٹے سے کانٹے کا آدھا حصہ تھا۔ وہ آدھا حصہ جو تلوے کے اندر پیوست رہ گیا تھا جبکہ باقی کا آدھا شاید میری انگلیوں کے کھینچنے سے ٹوٹ گیا تھا۔ میرے دل کے ٹکڑوں کے ساتھ ہی بٹ گیا تھا اب وہ ادھ مونہا کانٹا بھی ہر ٹکڑے میں گڑا تھا۔ پہلے ایک پھانس میرے ایک دل کو رگیدتی تو میری جان پر بن جاتی تھی اب تو کتنے ہی دل تھے اور کتنی ہی پھانسیں۔ میں تو جان کنی کے عذاب کے بے شمار ذائقوں سے دوچار ہو گئی تھی۔ ہر ذائقہ پہلے سے زیادہ کسیلا..... کڑوا..... کٹیلا اور اذیت ناک تھا۔ لگتا تھا میں ادھ مری ہی برزخ میں لٹکا دی گئی ہوں..... آج تو احمد یہ بھی کہہ گئے تھے کہ وہ شام کو واپس آ کر ''اماں جان'' کو میرے کرتوت بتا دیں گے۔

میرے کرتوت.....

کیا تھے میرے کرتوت.....؟

میں نے اپنے گرے ہوئے ہاتھ پھر سے دعا کے لیے اٹھا دیئے اور رونے لگی۔

❁❁❁

کیا یہ وہی احمد تھے..... مجھ پر جان چھڑکنے والے..... اور میرے کردار پر آنکھیں بند کر کے گواہیاں دینے والے۔ مجھے یاد آ رہا تھا ایک بار جب میں اپنی تنظیم کے ساتھ کسی خواتین میلے میں شرکت کے لیے پانچ روز کے ٹرپ پر اسلام آباد جا رہی تھی۔ تو اماں نے کتنا اعتراض کیا تھا۔ وہ احمد کو میرے منہ پر ہی میرے خلاف کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔

''بس کر دو احمد! تم نے تو حد کر دی ہے آزاد خیالی اور بے غیرتی کی۔'' وہ سخت غصے میں تھیں۔

''میری پیاری اماں جان میں نے ایسا کر کیا دیا؟'' ان کی عادت تھی کہ اماں جب طیش میں ہوتیں تو وہ اور بھی مکھن ہو جاتے۔ وہ اپنی ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر کھڑے ہو گئے۔

''کیا کیا ہے؟ یہ سمجھ ابھی تمہیں نہیں آ رہی۔ مگر یاد رکھنا کہ ایک روز تم خود اپنے کیے پر پچھتاؤ گے۔ بیویوں کے حقوق گھر کی چار دیواری تک اچھے لگتے ہیں چادر اور چار دیواری سے

باہر جا کر ''عورت'' اکثر اوقات بھول جاتی ہے کہ وہ کسی کی بہن، بیٹی اور بیوی بھی ہے۔'' وہ مجھ پر طنز کی نظریں جما کر احمد سے کہہ رہی تھی۔ اس وقت مجھے نہ ان کی آنکھیں اچھی لگ رہی تھیں نہ باتیں..... میں نے اپنا چہرہ دوسری جانب پھیر لیا تھا۔

''اماں! آئمہ ایسی نہیں ہے۔'' وہ میری بھرپور حمایت کر رہے تھے۔

''کیوں کیا آئمہ عورت نہیں ہے۔ کیا ابلیس نے اس کے لہو میں گردش نہ کرنے کی قسم کھا رکھی ہے؟ یا پھر وہ ان مردوں کی رگوں سے نکل گیا ہے جن کی معیت میں آئمہ جیسی آزاد خیال عورتیں دن رات اپنے گھروں سے باہر جانے کہاں کہاں پھرتی ہیں؟'' اس روز ان کے غصے میں بے حد شدت تھی اور لہجے میں میرے لیے ہتک۔ وہ سیدھی میرے کردار پر شک کر رہی تھیں۔ مگر احمد..... احمد اتنے ہی میرے بارے میں پُراعتماد تھے۔

''اماں! اب ایسا نہیں ہوتا۔ باہر کی دنیا میں مرد اور عورتیں اکٹھے کام کرتے ہیں صرف کام..... اب شعورِ آگہی ان کے درمیان حدیں کھینچ چکا ہے اور پھر جہاں اچھائی اور بھلائی کے کام ہوں وہاں کرپشن خود بخود نہیں رہتی۔'' احمد بڑے سلیقے سے اماں کو سمجھا رہے تھے۔

''مجھے جدید دنیا کی کتابیں نہ پڑھاؤ۔ جو میں کہتی ہوں اس پر غور کرو۔ ورنہ پانی کو سر سے گزرتے دیر نہ لگے گی۔'' وہ احمد کو بھی شاکی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

''میری پیاری اماں جان! آئمہ کو جتنا میں جانتا ہوں کوئی اور نہیں جان سکتا، آئمہ کے کردار کی گواہی تو میں روزِ محشر میں بھی دے سکتا ہوں۔ آپ اس دنیا کی بات کرتی ہیں۔ آپ میری اماں جان! فکر نہ کریں اور ہاں لوگوں کی باتوں کی پرواہ نہ کیا کریں۔''

انہوں نے اماں جان کو میرے کردار کی گواہی دیتے ہوئے میرا سر کیسا فخر سے اونچا کر دیا تھا۔ میں نے انہیں شکر گزار نظروں سے دیکھا تو وہ مسکرا دیئے تھے جبکہ اماں جان اس روز سچ مچ بے حد خفا ہو کر چلی گئی تھیں۔

''نادرہ! درست کہتی ہے بیوی کے حُسن کا جادو تمہارے سر پر چڑھ کے بول رہا ہے مگر یاد رکھنا کہ ایک روز اپنے کیے پر پچھتاؤ گے۔'' جاتے جاتے وہ کہہ گئی تھیں۔

''احمد!'' میرے لبوں سے ان کا نام سسکیاں بن کر نکل رہا تھا۔ احمد کو مجھ پر کتنا بھروسہ تھا۔ کتنا اعتبار تھا لیکن اب..... اب وہ سب بھول گئے تھے اب تو وہ میرے لیے خود جوزبان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

استعمال کر رہے تھے وہ اماں جان کی زبان سے کہیں زیادہ سخت اور ناقابلِ برداشت تھی۔ واقعی وہ بدل گئے تھے۔ روزِ محشر تک میرے کردار کی گواہیاں دینے والے کیسے ایک ہی پل میں بدل گئے تھے۔ میں نے سامنے بیڈ پر کروٹ بدلے احمد کو دیکھا جو ابھی کچھ دیر پہلے نیند کی گولی کھا کر سوئے تھے۔ اب احمد اتنے ڈیپریسڈ تھے کہ انہیں نیند کی گولیوں کے بغیر نیند نہ آتی تھی۔ میں نے ایک حسرت بھری نگاہ ان پر ڈالی اور صوفے کے کشن سیدھے کر کے لیٹ گئی۔

اب تو احمد مجھے اپنے بستر پر بھی نہ لیٹنے دیتے تھے۔ کہتے تھے بُرے کردار کی عورت کی سزا یہیں سے شروع ہوتی ہے کہ اس کا شوہر پہلے اس کا بستر الگ کرے اور پھر اسے اپنی زندگی سے الگ.....'' مجھے ایک خوف سا آ گیا۔ میں نے اپنے اور احمد کے درمیان تیزی سے بڑھتے ہوئے فاصلے کو دیکھا۔

''اللہ نہ کرے۔'' میں نے بے ساختہ کہا اور اپنی آنکھیں زور سے میچ لیں۔ میری بند پلکوں تلے بھی احمد ہی تھے۔

''مومی! میں چاہتا ہوں ہم لوگ کسی اور ڈاکٹر سے بھی مشورہ کر لیں۔ کیا حرج ہے اگر ایک بار ہم آغا خان یا پھر لاہور، اسلام آباد یا..... یا پھر کسی اور ملک چل کر ہی کچھ علاج کرا لیں۔''

احمد نے مجھے بہت پیار سے اس وقت راضی کرتے ہوئے کہا تھا جب اماں جان نے ہمیں زبردستی کراچی بھیجنے کی ٹھان لی تھی۔

''احمد! احمد! آپ کو اگر میری بات کا اعتبار نہیں تو بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے چلیں جہاں آپ کہیں۔'' میں نے ذرا خفگی سے کہا تھا۔ جس پر وہ پریشان ہو گئے تھے۔

''میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ بعض اوقات ایک لیبارٹری یا ایک ڈاکٹر کی تشخیص کچھ ہوتی ہے اور دوسرے کی کچھ۔ اس لیے بس۔'' وہ ٹھنڈے سے ہو کر بولے تھے۔

''ہاں لیکن یہ سوچ لیں کہ آپ میں بار بار اپنے احساسِ کمتری کا بوجھ اٹھانے کا حوصلہ ہے اور پھر میں یہ نہیں چاہتی کہ کوئی میرے احمد کی اہلیت پر بار بار انگلی اٹھائے۔'' میں نے بڑی محبت سے انہیں یقین دلانا چاہا تھا کہ وہ ہر بار اپنی کمتری اور نااہلیت کا آئینہ دیکھ نہ پائیں گے۔

''احمد! مومی کو سوائے آپ کی محبت کے کچھ نہیں چاہیے۔ اولاد بھی نہیں..... آپ لوگوں کی باتوں کی پرواہ چھوڑ دیں۔ میں جو ہوں آپ کے ساتھ۔'' میں نے بڑی لگاوٹ سے ان کے ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگاتے ہوئے انہیں حوصلہ دیا تھا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ آج ہم اس باب کو بند کرتے ہیں آئندہ اس پر میں تم سے کبھی بات نہیں کروں گا۔'' احمد نے میری بات پر سرِ تسلیم خم کر دیا تھا اور واقعی پھر انہوں نے خود سے کبھی مجھ سے اس موضوع پر بات نہ کی تھی۔ قصور سراسر میرا تھا۔ یہ بات ثابت ہو چکی تھی۔ میں نے خود اپنا جرم ایک بار پھر قبول کیا۔

''لیکن اب میں کیا کروں؟ میرے خدایا! صرف اتنا کر دے کہ میں احمد کے سامنے اپنے کردار پر لگا داغ صاف کر سکوں جو وہ سمجھ رہے ہیں اسے غلط ثابت کر دوں۔''

میں نے اپنا مدعا اپنے اللہ کے سامنے التجا کے ساتھ رکھ دیا اور اس مالک کا ذکر کرتے کرتے سو گئی۔

''اللہ اکبر..... اللہ اکبر.....''

میرے کان میں بڑی ہی میٹھی پکار پڑی اور میں ایک لمحے کی بھی سُستی کیے بغیر اٹھ بیٹھی۔

میری شہ رگ میں ایک ہلکی سی چبھن تھی جو میرے لہو میں حرارت کو تیز کر رہی تھی۔ ایک عجیب سا رعشہ تھا جو میری نس نس کو لرزائے دے رہا تھا۔

حی علی..... حی علی.....

میری شہ رگ نے میری انگلی تھام لی اور میں اپنے کمرے کی کھڑکی کی طرف چل دی۔ میں نے کھڑکی کے پردے ہٹا کر اس کے دونوں پٹ کھول دیئے۔ باہر فضا میں ہر طرف یہی رسیلی اور سُریلی پکار تھی۔ ہوائیں اس پکار کو اپنے ساتھ لیے جھوم رہی تھیں۔ اس کی نرم ہتھیلیاں اس آواز کو ایک ایک دروازے پر..... ایک ایک دل کے بند کواڑوں پر دستک کی طرح بجا رہی تھیں۔ سماعتوں سے دل کے اور دل سے روح کے تاروں کو چھیڑتی اس آواز میں کیسا جادو تھا۔ میں نے ایک لمبی سی سانس کھینچ کے اپنے اندر اتاری۔ کتنا سکون تھا۔ میرا درد سے بوجھل سر فوراً ہی ہلکا پھلکا ہو گیا۔

''اللہ اکبر..... اللہ اکبر..... لا الہ الا اللہ۔''

میرے لب خود بخود اس خوب صورت پیغام کو دہرا رہے تھے اور میرا رواں رواں اس کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سچائی کی گواہی دے رہا تھا۔ اتنا پیارا نغمہ..... ایسی انوکھی شاعری اور پوری فضا میں گونجنے والی آوازوں کی ایک سی لے اور ایک سا ردھم جس کی سنگت کے لیے اس سمے کائنات کا ذرہ ذرہ ہم کلام تھا۔

واقعی..... واقعی امی جان درست کہتی تھیں کہ آئمہ! صبح فجر کی اذان سنا کرو کہ جو لطف جو سرور اس کے سننے میں ہے وہ دنیا کی کسی موسیقی کسی سُر تال میں نہیں۔ جو نغمگی ایک مؤذن کے گلے میں ہوتی ہے وہ دنیا کے کسی عظیم ترین گلوکار کے گلے کو نصیب نہیں اور جو کلام اس کا ہے وہ کسی شاعر کے ذہن کی تخلیق نہیں بلکہ مالک کائنات نے اپنی مخلوقات کے لیے کہا ہے۔ بلکہ تجویز کیا ہے۔

یہ وہ کلام ہے جسے اگر فضائیں نہ سنیں تو دن اور رات سانس لینا بند کر دیں۔ واقعی..... جب حضرت بلالؓ نے اذانِ فجر نہ دی تھی تو بھلا سورج کیسے طلوع ہوتا؟ یہ نغمہ ہی تو دراصل کائنات کی روح ہے۔ اس کے بنا کائنات کا نظام اس کے اوقات بھلا کس طرح چل سکتے ہیں؟ اور جب پوری کائنات اس سے غذا پاتی ہے تو انسانی اجسام کی تسکین اور ان کی روحوں کی آبیاری دنیا کی مصنوعی اور باجے گاجوں والی موسیقی میں کیسے ہو سکتی ہے؟'' میری روح نے ایک عجیب سرشاری محسوس کی اور میرے دل و دماغ نے یہ تسلیم کیا کہ صبح کی اذان سننا بھی ایک نعمت ہے۔ جو نیند سے ہی بیدار نہیں کرتی بلکہ دن بھر کے لمحے لمحے میں انسان کے لیے سکھ..... سکون اور برکتیں بھر دیتی ہے۔ اس کا ثبوت مجھے اسی دن ہو گیا تھا۔ جب نماز فجر کے بعد میں نے قرآن پاک بھی کھولا اور اسے کچھ دیر تلاوت کیا۔ میرا روتا..... تڑپتا..... مچلتا دل میرے پہلو سے یوں لگ کر بیٹھ گیا تھا جیسے ایک بھوک سے بلکتے بچے نے سیر ہو کر اپنی ماں کا دودھ پی لیا ہو اور وہ سکون سے اس کے ساتھ چمٹ کر سو جائے۔ مجھ کم علم کم عقل کو سورۃ بقرہ کی چند ہی آیات نے کتنی روشنی، کیسا نور عطا کر دیا تھا۔ زندگی کے اس پُر پیچ راستے پر آگے بڑھنے کے لیے ایک مضبوط عصاء عطا کر دیا تھا اور میری شہ رگ بار بار پھڑ پھڑا کر مجھے کہہ رہی تھی۔

اس کا بابِ رحمت کبھی بند نہیں ہوتا۔

اس کا بابِ رحمت کبھی بند نہیں ہوتا۔

آج کی صبح نے میرے اندر ''محبت'' کا ایک اور ہی نظریہ بیدار کر دیا تھا۔ میرے زاویہ

نگاہ کو محبت کے اس محدود سے معنی سے نکال کر کتنا وسیع کر دیا تھا۔ آج میرے بدن کا ریشہ ریشہ ''احمد'' کی محبت کے غم سے ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ میرے دماغ کے گرد کا وہ ہالہ جو صرف اور صرف احمد کی چاہت سے منور تھا۔ کچھ ماند پڑ گیا تھا۔ آج تو میری نس نس میں کسی اور محبت نے وہ جوت جگا دی تھی جو احمد سے تو کیا دنیا کے ہر رشتے سے زیادہ عزیز تھی۔

❁❁❁

ناشتے کے بعد میں اماں جان کو ساتھ لے کر اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔

''خیر تو ہے؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' وہ مجھے پریشانی سے دیکھتی ہوئیں پوچھ رہی تھیں۔

''جی آپ کی دعا ہے۔'' میں نے انہیں صوفے پر بٹھایا اور خود نیچے قالین پر بیٹھ کر ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

''اماں جان! اگر میں کہوں کہ مجھ سے بہت بڑی غلطی بلکہ ایک بہت ہی بڑا گناہ ہو گیا ہے۔'' میں نے سر کو ندامت سے جھکائے ہوئے بات شروع کی۔

''گناہ..... تم سے؟ ایسا کیا ہو گیا؟'' وہ پریشان ہو کر صوفے پر کسمسائیں۔

''بس اماں جان! ہو گیا مجھ سے..... اب میں اس کا اقرار آپ کے سامنے پوری سچائی سے کرنے لگی ہوں۔ اس امید کے ساتھ کہ آپ مجھے معاف بھی کر دیں اور مجھے اس مشکل سے نکلنے میں مدد بھی کریں۔'' میں نے صبح ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ میں اور احمد جس آگ میں جدا جدا جل رہے ہیں اسے بجھانے کے لیے ہمیں اب کسی تیسرے کی مدد لینی ہو گی اور وہ تیسرا اماں جان سے بہتر کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

''دیکھ لڑکی! مجھے پہیلیاں نہ بجھواؤ سیدھا سیدھا کہو۔'' وہ میری تمہید سے گھبرا رہی تھیں۔ عمر کے اس حصے میں اب واقعی ان کا دل زیادہ تجسس برداشت کرنے کے قابل بھی نہ تھا۔ میرا دل بھی اپنے جرم کا بوجھ اٹھائے اٹھائے نڈھال ہو چکا تھا۔ پھر میں نے وہ سب کہہ دیا۔ جسے میں کبھی زندگی بھر کسی کو بھی نہ بتانے کا عہد کر چکی تھی۔ مگر اب وہ عہد میرے لہو میں زہر ہو چکا تھا۔ اس سے قبل کہ میرا ضمیر ہمیشہ کے لیے میرے سر انڈ بھرے وجود میں دفن ہو جاتا۔ میں نے وہ زہر اگل دیا۔ اماں جان نے اپنے ہاتھ میرے ہاتھوں سے چھڑائے اور مجھے دیکھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بغیر.....مجھ سے کچھ کہے بغیر وہاں سے ایک دم اٹھ کر چل دیں۔ میں نے بھی انہیں اس وقت نہ روکا۔ وہ چلی گئیں اور میں کتنی ہی دیر اپنے گھٹنوں میں سر دیئے وہاں بیٹھی رہی۔ میرے اگلے ہوئے زہر کا نیلا پن کتنی ہی دیر میرے پیروں پر سرسراتا رہا لیکن اس کا اثر میرے پاؤں کے کسی ناخن تک پر نہ ہو سکا تھا۔ بلکہ میرے دائیں بائیں کے تلوے کی نیلاہٹ بھی اسی نیلے پن میں گھلتی رہی تھی۔ میرا دل کچھ دیر بعد ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ میرے اقرار جرم کی جونک نے میرے گناہ کا گند کافی حد تک چوس لیا تھا۔ اب کسی کا مہربان ہاتھ میرے دل میں پڑنے والے اس گڑھے کو تھپک رہا تھا۔ جہاں سے احساسِ جرم کا وہ موٹا کانٹا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکال دیا گیا تھا۔

اگلے دو روز میرے لیے ایک نئے امتحان کے دن تھے۔ اماں جان اپنی اسی چپ کے ساتھ نادرہ پھپو کی طرف چلی گئی تھیں اور گھر پر جیسے اک گھمبیر سناٹا چھا گیا تھا۔ یا مجھے ہی لگ رہا تھا۔ احمد کا وہی سرد سپاٹ رویہ تھا۔ ان کی وہی چیر دینے والی نگاہیں تھیں اور کبھی کبھی چپ کا سینہ شق کر دینے والا کوئی ایک آدھ فقرہ.....ایک آدھ جملہ جو وہ مجھے نماز پڑھتے یا قرآن پڑھتے دیکھ کر میری طرف اچھال دیتے تھے۔

''او بی بی! اللہ دلوں کے بھید جان لینے والی ہستی ہے۔ اس سے کیا چھپاؤ گی؟ بس کرو تمہاری نمازیں بھی تمہاری ڈھکوسلے بازیاں ہیں جو اللہ کے نزدیک سوائے ٹکروں کے اور کچھ نہیں جو تم زمین پر مارتی ہو۔''

ایک بار تو انہوں نے قرآن پاک میرے ہاتھ سے چھین ہی لیا۔ یہ کہتے ہوئے۔ ''اپنے ناپاک ہاتھوں سے اس مقدس کتاب کو تم مت چھوا کرو۔ یہ تم جیسوں کے لیے نہیں ہے۔''

تب میں نے بہت ہولے سے جواب دیا تھا۔

''احمد! یہی تو ہم جیسوں کے مرض دل کی شفا ہے اسی میں تو ہم جیسوں کی مغفرت کی خوشخبریاں ہیں اور ہدایت کے راستے۔''

''فار گاڈ سیک.....اب تو بند کر دو ڈائیلاگ بولنے.....اللہ۔ ''احمد'' نہیں جو تمہاری اداکاری کو سمجھ نہ سکے۔''

وہ غصے سے مجھ پر پھنکارے تھے۔

پھر میں نے ان سے بحث نہ کی تھی۔ اب ان سے بحث کرنا نہ ان کے غصے کو دیکھ کر رونا میری عادت سے نکل رہا تھا۔

''ویسے ڈھیٹ بڑی ہو تم۔'' وہ مجھ پر طنز کرتے ہوئے بولے۔ ''لگتا ہے تم نے اپنے ساتھ ساتھ اپنے والدین کو بھی ذلیل کرنے کا سوچ لیا ہے۔ میں ان کی شرافت کی وجہ سے چپ تھا۔ چاہتا تھا کہ تم واپس چلی جاؤ اور میں تمہیں وہیں پر کاغذ بھیج دوں۔ ہمارے والدین اس معاملے میں نہ ہی پڑیں تو بہتر ہو مگر تم.....تم لگتا ہے ایسا نہیں چاہتی ہو۔ چلو ٹھیک ہے۔''

وہ اپنی بات کو اپنی آنکھوں کی کاٹ سے پورا کرتے ہوئے کمرے سے نکل گئے اور میں نے دوبارہ سے شیلف میں رکھا ہوا وہ نسخہ کیمیا اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا جس میں ہر مشکل کی حاجت روائی اور ہر مرض کی دوا موجود تھی۔ پتہ نہیں مجھ جیسوں کو یہ بات اتنی دیر سے سمجھ کیوں آتی ہے اللہ تو اتنا عظیم ہے کہ اسے ہم جیسوں کی اطاعت یا نافرمانی نہ کوئی فائدہ دے سکتی ہے اور نہ نقصان لیکن وہ چونکہ اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ اس کے بُرے سے بُرے بندے بھی دوزخ کا ایندھن نہ بنیں۔ لہٰذا وہ ہمیں سمجھاتا ہے جیسے میرے چاہنے والے نے مجھے سمجھایا تھا۔ مجھ آئمہ حسن کو.....جو گھمنڈ اور انا سے بھری ہوئی تھی۔ جس نے کبھی اس کی تسبیح وحمد وثنا بھی نہ کی تھی۔ جو پانچ وقت کی نمازی بھی کبھی نہ تھی۔ قرآن کو بھی سوائے کسی قرآن خوانی کے کبھی کہیں نہ پڑھتی تھی۔ جھوٹ اور غرض جس کا نصب العین تھا۔ آج مجھے لگتا تھا قرآن میرا ہی مخاطب ہے۔ جو مجھے محبت سے نرمی سے ڈانٹ کر۔ غرض ہر طریقے سے سمجھاتا ہے۔ بُرائی کا بُرا انجام بتاتا ہے اور یہی تو ہے جس نے مجھے سچ بولنے کی توفیق دے۔ اقرار جرم کر لینے کا حوصلہ دیا۔ خواہ مجھے اب سزا ملتی یا جزا.....لیکن میں احساسِ گناہ کی اذیت سے تو نکل آئی تھی۔ میں جان رہی تھی کہ وہ رحمٰن اور رحیم ہے تو ستار اور غفار بھی ہے۔ بشری تقاضوں کی بھینٹ چڑھ کر میں گناہوں کی پوٹ بن بیٹھی تھی۔ مگر یہ اسی کا کرم تھا کہ آج اس نے مجھے پلٹ آنے کا حوصلہ بھی دے دیا تھا۔

❁❁❁

تیسرے روز اماں جان کا فون آ گیا انہوں نے مجھے نادرہ آنٹی کی طرف بلایا تھا۔ میں سمجھ رہی تھی کہ اب میرا انجام ہونے کو ہے۔ عین ممکن تھا وہ مجھے واپس گھر ہی بھیج دیں۔ احمد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا کر دیں۔ میں اپنے آپ کو ہر طرح کی بات کے لیے تیار کر کے نادرہ آنٹی کے گھر آئی تھی۔ ڈرائیور مجھے چھوڑ کر جانے لگا تو میں نے اسے ٹھہرنے کو کہہ دیا تھا۔ پتہ نہیں کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ میرے مقدمے کا فیصلہ تو بس تین حرفی ہی ہوگا۔ جسے سن کر میں جلد ہی فارغ ہو جاؤں گی۔

''آئمہ!'' چند لمحوں کی رسمی گفتگو اور خیریت معلوم کرنے کے بعد نادرہ آنٹی نے مجھے مخاطب کیا۔

''جی.....'' مجھے میری آواز ڈوبی ڈوبی سی محسوس ہوئی۔

''دیکھو، جو کچھ بھی ہوا اچھا نہیں ہوا۔'' وہ سختی کی بجائے ذرا نرمی سے بات کر رہی تھیں مگر پھر بھی ان کا لہجہ خفگی کی برف تلے دبا ہوا تھا۔ یخ ٹھنڈا میری سماعتوں کو جھرجھری دیتا ہوا۔

''آئمہ! تم نے بہرحال احمد کے جذبات و احساسات کو سخت دھچکا پہنچایا ہے۔ وہ تمہیں معاف کرنے پر راضی نہیں۔'' نادرہ آنٹی ٹھیک وہی کچھ کہہ رہی تھیں جس کی مجھے توقع تھی۔

''تمہیں معاف کرنا اگرچہ ہم میں سے کسی کے لیے بھی آسان نہیں۔'' وہ احمد کے ساتھ ساتھ اپنے اور اماں جان کے جذبات بھی بتا رہی تھیں۔ اماں جان دوسری جانب چہرہ کیے سسک رہی تھیں اور بار بار یہی کہے جا رہی تھیں۔

''آئمہ! تم نے میرے بیٹے کی محبت.....اس کے اعتماد کا قتل کیا ہے۔ وہ تمہیں معاف کرنے کے حق میں نہیں۔''

''اور آپ.....آپ اماں جان؟'' میں نے بڑی لجاجت سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے تم نے کب کسی قابل سمجھا تھا۔ میں بھلا تم دونوں کے درمیان کیا کر سکتی ہوں۔'' ان کی ناراضگی بھی ان کی بے بسی کی آئینہ دار تھی۔ میں جانتی تھی احمد نے ان کی بات سن کر بھی مجھے معاف نہ کیا ہوگا۔

''اماں جان! مجھ سے بے شک بہت بڑی خطا ہوگئی۔ مگر میں..... میں بدکردار نہیں ہوں.....میرا دامن آج بھی.....''

''آئمہ بس کرو.....آج ان باتوں کا.....ان قسموں کا کوئی فائدہ نہیں۔'' نادرہ آنٹی نے

میری ادھوری بات کو اپنی بات سے پورا کیا۔

''تمہارا کیا خیال ہے؟ تمہاری ذات.....تمہارے رویے اور تمہارا چلن کیا اتنا مضبوط تھا کہ ہم سب تمہاری بات پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کر لیتے۔ جبکہ تم نے ہمیشہ بڑوں کی باتوں کو پسِ پشت ڈال کر ان کا مذاق اڑایا ہے۔'' وہ مجھے کڑے تیوروں سے دیکھتی ہوئی کہہ رہی تھیں۔

''اسی کی تو سزا پا رہی ہوں میں۔'' میں نے سر جھکا کر اپنے کیے کا اقرار کیا۔

''میں نے ڈاکٹر مہ نور اور اس کے شوہر ڈاکٹر سے ساری بات کی ہے۔'' انہوں نے مجھے اطلاع دینے والے انداز میں نہیں بلکہ میرے کہے کا ناپ تول کرنے والے انداز میں کہا۔

''سچ۔'' میں خوش ہوگئی۔

''ہاں.....مگر احمد اب بھی ان سے ملنے کو تیار نہیں۔'' وہ منہ پھیر کے کھڑی ہوگئیں۔

''یا اللہ تیرا شکر ہے۔ یا اللہ تیرا شکر ہے۔'' میں ان کی اگلی بات پر کان دھرنے کی بجائے اپنے محسن کا شکر ادا کر رہی تھی جس نے مجھے اپنا آپ درست ثابت کرنے کا موقع تو دیا تھا۔

''احمد امریکہ جا رہا ہے.....اور تم.....'' وہ کہتے کہتے رُک گئیں۔

''اور میں؟'' میں نے جانتے بوجھتے بھی پوچھا حالانکہ میرے دل کے ہر ٹکڑے سے آواز آ رہی تھی۔ ''تم اپنے گھر چلی جاؤ۔''

''تم اپنے گھر چلی جاؤ۔'' نادرہ آنٹی کے لبوں پر میرا دل بولا۔

''اور وہ.....جو اس دنیا میں آنے والا ہے؟''

میں نے خود سے جڑے اس معصوم کا مستقبل بھی پوچھا جس نے ابھی دنیا میں آنکھ کھولنی تھی۔

''وہ ہمارا خون ہے۔ ہمارے بچے کی اولاد ہے۔'' نادرہ آنٹی کی بجائے اماں جان نے میری جانب رُخ کر کے فوراً جواب دیا۔

اور میں بے ساختہ اماں جان کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''بے شک وہ آپ ہی کی نسل ہے۔ بلاشبہ وہ احمد ہی کی اولاد ہے۔ وہ آپ ہی کا خون ہے۔'' میری ہچکیاں بس یہی کہے جا رہی تھیں اور میری آنکھوں سے شکرانے کا پانی جاری تھا۔

❁❁❁

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اماں جان! پلیز مجھے یہیں رہنے دیں۔ کم از کم میرے بچے کی پیدائش تک تو مجھے یہاں رہنے دیں۔'' شام کو میں اماں جان کے کمرے میں بیٹھی ان سے درخواست کر رہی تھی۔

''اس گھر میں تمہارا راج تھا۔ جسے تم نے خود خراب کیا ہے۔'' وہ افسردگی سے کہہ رہی تھیں۔ ''کاش بیٹی! تم ایسا نہ کرتیں۔ سمجھتیں کہ شوہر کے دل میں بسے رہنے سے کہیں زیادہ ضروری ہوتا ہے اس کی نظروں میں بسے رہنا۔ افسوس کہ تم نے خود کو ایک بے حد چاہنے والے شوہر کی نظروں سے گرا لیا۔'' ان کی آنکھوں میں میرے لیے ہمدردی اور اپنے بیٹے کے دل ٹوٹنے کا غم تھا۔

''اماں جان! پلیز مجھے معاف کر دیں۔'' میں نے اپنا سر ان کے گھٹنوں پر رکھ دیا۔ جس پر کچھ لمحوں کے بعد ان کا کپکپاتا ہوا ہاتھ آن ٹکا تھا۔ یعنی ان کے دل میں میری جگہ بن سکتی تھی۔

''ٹھیک ہے میں احمد کو سمجھاؤں گی۔ لیکن تم اس سے کوئی بحث نہ کرنا وہ بے حد غصے میں ہے۔ کہتا ہے تمہارے کردار میں جھول نہیں یہ تو ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن تم نے اس کے اعتماد کا خون کیا۔ اپنی خودی کے کھوکھلے پن کو برقرار رکھنے کے لیے اس کی اہلیت کو بھی مٹی کر دیا۔ یہ خطا بھی ناقابلِ معافی تو نہیں؟''

''اماں! مجھے اقرار ہے کہ میری خطا معمولی نہیں۔ میں کسی بھی سزا کے لیے تیار ہوں۔ بس مجھے آپ لوگ خود سے جدا نہ کریں۔''

میرا دل اپنے لیے کسی سزا سے بھی گھبرا نہیں رہا تھا۔ میں نے خود کو اس کے لیے تیار کر لیا تھا۔

''تو ٹھیک ہے انتظار کرو کہ وہ کیا فیصلہ لیتا ہے اور صبر و استغفار سے کام لو۔'' انہوں نے مجھے تسلی دی۔ اگرچہ ان کے لہجے اور رویے میں میرے لیے ابھی خاصی ناراضگی موجود تھی اور وہ مجھ سے کترا رہی تھیں۔ پھر بھی میرے لیے یہی بہت تھا۔ یہی کافی تھا کہ انہوں نے میری بات سنی اور اس کی تصدیق کر کے اسے سچ تسلیم بھی کر لیا تھا۔ احمد کے دل پر ابھی بدگمانی اور شک کے کئی بال باقی تھے۔ جن کی تحقیق کے لیے وہ امریکہ جا رہے تھے۔ میں تو اپنے محبوب کے صدقے واری اسی مہربانی پر ہی جاتے نہ تھک رہی تھی کہ اس نے میری پاکیزگی کسی پر تو ثابت کی اور احمد کو اس انداز پر سوچنے پر مجبور تو کیا اسی رات اس مہربان نے مجھ جیسی خطا کار

پر ایک اور احسان کر دیا۔ اس نے میری پاکیزگی کو اس طرح ثابت کر دیا جو میرے وہم و گمان میں نہ تھا۔ دراصل جب یہ سارا سلسلہ ہم نے اپنے علاج کا شروع کیا تھا اور ڈاکٹر مہ نور کے کلینک سے ہم نے اپنے کچھ ٹیسٹ وغیرہ کروائے تھے تو ڈاکٹر مہ نور نے ہمارے کیس کو کسی فارن گائنا کالوجسٹ سے بھی ڈسکس کیا تھا جس کی رائے پر مبنی ایک رپورٹ مہ نور نے مجھے بذریعہ ڈاک بھجوائی تھی جب مہ نور اپنے شوہر کے ساتھ کسی میڈیکل کانفرنس کے سلسلے میں گلاسکو گئی ہوئی تھی۔ وہ لیٹر جب آیا تب میں شاید نیویارک والی خواتین کانفرنس میں شرکت کے لیے گئی ہوئی تھی۔ احمد کی یہ ہمیشہ سے عادت تھی کہ وہ میری موجودگی یا غیر موجودگی میں کبھی میری ڈاک نہ کھولتے تھے۔ انہوں نے وہ لفافہ الماری کی دراز میں ڈال دیا تھا۔ جس کے بارے میں وہ بعد میں بھول گئے۔ آج جب وہ اپنے کوئی کاغذات وغیرہ تلاش کر رہے تھے تو ان کے ہاتھ میں وہ لفافہ آ گیا۔

جسے انہوں نے مجھے چیک کرنے کے ارادے سے ہی کھولا تھا تاکہ دیکھیں کہ گلاسکو سے مجھے کس نے ''انتہائی ذاتی'' کی مہر لگا کر کیا بھیجا تھا۔ انہوں نے وہ لفافہ مجھے بتائے بغیر کھولا اور پڑھ لیا۔ جن میں ان کی صحت کے 98 فیصد پلس پوائنٹ تھے اور میری ناقص صحت کے ٹھیک ہونے کے بھی پانچ فیصد امکانات موجود تھے۔ یعنی ہمارے ہاں اولاد ہونے کے امکانات اگرچہ تسلی بخش تو نہ تھے مگر موجود ضرور تھے۔ اسے پڑھ کر ان کے دل میں میری پاکیزگی کو لے کر جو کانٹا چبھا تھا وہ تو نکل گیا۔

''اب مجھے اس بات سے کچھ لینا دینا نہیں کہ تم پارسا ہو یا..... یا.....''

انہوں نے وہ لیٹر پڑھ کر میری طرف اچھالتے ہوئے غصے سے کہا۔ میں نے پہلے وہ کاغذ کا ٹکڑا اٹھا کر دیکھا اور پھر ان کا اٹکتا ہوا لہجہ۔ آج وہ مجھے ویسے بے دریغ مغلظات سے نہیں نواز رہے تھے جو پچھلے عرصے سے ان کے لبوں پر میرے لیے رہتے تھے۔

''تم نے مجھے میری نظروں میں دو کوڑی کا کر کے رکھ دیا۔ کیا یہ چھوٹا گناہ ہے تمہارا سنو آئمہ بیگم! اب میرے دل میں تمہارے لیے جگہ نہیں بن سکتی۔ کبھی نہیں..... بلکہ اب میں تمہیں یہ ثابت کروں گا کہ مجھے خدا نے ایک مکمل مرد بنایا ہے۔ باپ بننے کی صلاحیت مجھ میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ میں شادی کروں گا اور تم سے ہزار درجے بہتر عورت سے کروں گا۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ غصے سے پیر پٹختے کمرے سے باہر نکل گئے اور میں وہ لفافہ اپنے کپکپاتے ہاتھوں میں لیے اسے دیوانہ وار چومنے لگی۔

واقعی یہ میرے رب کی محبت کا اعلیٰ معیار ہی تھا کہ وہ مجھ جیسی نافرمان اور گستاخ کو بھی اتنا چاہنے لگا تھا کہ اس سے میری کوئی تکلیف برداشت نہ ہو رہی تھی۔

یہ اس کی حکمت..... اس کی دانائی..... اور میں..... میرا رواں رواں احساسِ ندامت سے لرزنے لگا۔ بھلا کوئی اتنا مہربان بھی ہوتا ہے۔ جیسا کہ وہ مجھ پر تھا۔

احمد نے آئمہ کو چاہا تو آئمہ اسے ہی اپنا سب کچھ مان بیٹھی۔ اس کی محبت پر اتنا اترا گئی کہ سب کو بھول گئی۔ اس کو بھی جس نے آئمہ کی محبت کو احمد کے دل میں ڈالا اور پھر اسے سینچا تھا۔

احمد..... جو دنیا کے مردوں سے جدا تھا۔ مجھ پر دل و جان سے اتنا فدا تھا کہ میں نے اسے مالک سمجھتے ہوئے بھی اسے اپنے تابع کر لیا تھا۔ جو میری ابرو کے اوپر نیچے ہونے سے بے کل ہو جایا کرتا تھا لیکن جب مجھ پر بھروسہ کرنے کا وقت آیا تو سب سے پہلے مجھ پر انگلی اٹھانے والا وہی نکلا۔ جو میری محبت میں شرک و کفر کی حد تک دعوے کرتا تھا۔ میرے کردار پر شک کرنے میں کچھ کسر بھی اس نے نہ اٹھا رکھی تھی۔ کیسی بودی محبت تھی اس کی اور کتنا کمزور اعتبار جو کڑے وقت کے پہلے قدم پر ہی ہوا ہو گیا تھا۔ کیا وہی تھا میرا ہمدم..... میرا غمگسار؟ میں اپنے سچے حبیب کے آستانے پر ماتھا ٹیکے پڑی تھی اور میرا دل اپنی کم مائیگی پر پانی ہوا جا رہا تھا۔ اس کی محبت چھاجوں چھاج مجھ سے بیکار اور گناہ گار پر برس رہی تھی اور میرا دامن کم پڑا جا رہا تھا۔

میرے لیے کس قدر مشکل اور ناممکن ہوتا جا رہا تھا احمد پر اپنی پاکبازی کو ثابت کرنا مگر اس نے کیسے اسے لمحوں میں ممکن بنا دیا اور کس طرح وہیں کے وہیں نہ صرف میری گواہی دی بلکہ اس کے ثبوت بھی فراہم کر دیئے۔ میں اس محبت کرنے والے پر قربان نہ جاتی تو اور کیا کرتی؟

❁❁❁

احمد اور میرے بیچ ایک اَن دیکھی خلیج جو حائل ہو چکی تھی وہ اب منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ اس پر دونوں طرف سے اک سکوت طاری تھا۔ وہ مجھ سے بات چیت نہیں کرتے تھے..... اور میں..... میں نے تو عجیب ہی ڈھب اپنا لیا تھا۔ میرے لب تو اب ایک پل کو بھی اک دوجے

سے نہ جڑے تھے۔ ہولے ہولے ہلتے ہی رہتے۔ کبھی مسکراتے اور کبھی کچھ گنگنانے لگتے..... میں تو بے حد باتونی ہو گئی تھی۔ اپنے سامنے نظر آنے والی ہر شے سے باتیں کرتی تھی۔ اپنے کمرے میں موجود کاغذ قلم سے لے کر اس کے در و دیوار سے باتیں۔ آئینے سے باتیں..... اور تو اور ہوا سے باتیں..... بادلوں اور پھولوں سے باتیں..... میری کیفیت ہی کچھ ایسی ہو گئی تھی۔ میرے اندر کی دنیا کے رنگ تو یکسر بدل گئے تھے لگتا تھا اک قوسِ قزاح ہے جس نے میری رگ رگ پر اپنی کمند ڈال دی ہے۔ میرے احساسات اور جذبات میں عجیب کیف کا عالم تھا۔ اک محبت تھی ہاں یہ محبت ہی تو تھی جس نے مجھے سر سے پاؤں تک بدل دیا تھا۔ میرے اندر کے سارے زہر کو مٹھاس میں بدل دیا تھا۔ ایسی محبت تو مجھے کبھی کسی سے نہ ہوئی تھی۔ نہ بچپن میں اپنی ماں سے..... نہ ہوش سنبھالنے پر اپنے باپ سے۔ نہ جوانی میں کسی خوابوں کے شہزادے سے..... اور..... اور پھر احمد سے بھی۔ احمد سے بھی تو مجھے ایسی محبت نہ تھی۔ اگر ہوتی تو کیا میں احمد کو دھوکا دیتی۔ میری گزشتہ کی ہر محبت میں جھول تھا۔ ریا تھی..... اَنا تھی..... منافقت تھی۔ کتنے ہی پیوند تھے جو میں نے محبت کی مخملیں چادر پر لگا رکھے تھے اور یہ چادر میں نے آئمہ نام کی خود غرض عورت کے وجود کی کھونٹی پر بس یونہی ٹانک رکھی تھی۔ جسے میں وقتاً فوقتاً کبھی کسی کے نام سے اوڑھ لیتی تھی اور کبھی کسی کے نام سے۔ محبت تو میرے لیے سوائے اک چڑھاوے کے کچھ نہ تھی۔ جسے میں اپنی خواہشات کے لاتعداد بتوں کو دان کرتی رہتی تھی۔ میرے لیے کوئی بھی محبوب زیادہ دیر تک محبوب نہ رہتا تھا۔ میرے دل کا صنم خانہ تو بے شمار مورتیوں سے بھرا پڑا تھا۔ ''محبت'' کے نام پر میرے اندر کا اک جذبہ بھی شفاف نہ تھا۔ نہ میں محبت کرنے کا سلیقہ رکھتی تھی اور نہ ہی اس کی حقدار تھی۔ جنہیں میں نے کبھی چاہا..... وہ بھی سارے دنیا دار ہی نکلے اور جنہوں نے مجھے چاہا وہ بھی..... یعنی میں یہ کہہ سکتی تھی کہ محبت اس سے پہلے نہ تو میرا وصف تھی نہ حق..... شاید اس لیے کہ جن کے جذبوں میں کھوٹ ہو۔ یہ نعمت ان کا نصیب ہوتی ہی نہیں مگر یہ کب کہاں..... کس کا نصیب ہو جائے۔ کس کو عنایت ہو جائے یہ بھی ہم نہیں جانتے۔ جیسے کہ میں نہ جانتی تھی کہ کبھی میرا وجدان یہ محبت ہو گی۔

آ..... ہ..... محبت..... میٹھی..... اور پُر کیف..... میں نے کھڑکی کھولی اور اپنے کمرے سے دور..... بہت دور تک دیکھتی چلی گئی۔ آسمان آج مٹیالے بادلوں سے ڈھکا پڑا تھا۔ ہوا بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خاصی تیز تھی۔ لگتا تھا بارش ہونے کو ہے۔ تیز ہوا درختوں کی ٹہنیوں کو زور زور سے ہلا رہی تھی جیسے انہیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگا رہی ہو۔ کچھ یاد دلا رہی ہو..... کیا؟ بھلا ہوا ان درختوں سے کیا کہہ رہی ہو۔ میں نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی تو سائیں سائیں کرتی ہوا میرے وجود کو آن لگی۔ کیا..... کیا؟

میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔ مجھے آج کل خود کلامی کی عادت پڑ گئی تھی نا جس کا ذکر میں نے ابھی ابھی کیا تھا۔

''میں..... ہاں میں.....؟'' ہوا نے اپنی سوالیہ انگلیاں خود میرے وجود پر رکھ دی تھیں۔ ''ہاں واقعی..... میری کیفیت بھی تو پہلے ایسی ہی تھی۔ جب مجھے کہیں قرار نہ تھا۔ نہ دنیائے موسیقی میں کوئی پاپ یا کلاسیکل میری بے کلی کا معالج ہو سکا تھا نہ یوگا کے کسی آسن نے میرے نیم مُردہ احساسات اور منتشر پراگندہ سوچوں کے جال سے مجھے نکالا تھا۔ میرے دل پر پڑی اداسیوں اور ویرانیوں کا پردہ تھا کہ چاک ہی نہ ہوتا تھا۔ میں نے دنیا کے عظیم ترین اسٹیج پر بھی تقاریر کی تھیں مگر میرے اندر کا غبار ہلکا ہی نہ ہوتا تھا۔ میرے خیالات میری سوچیں میرا نصب العین ایک بین الاقوامی تنظیم کا چارٹر بھی بن گئیں مگر لگتا تھا مجھے کوئی جانتا ہی نہیں۔ احمد کی محبت ہر وقت مجھ پر نثار رہتی تھی لیکن لگتا تھا میں تہی داماں ہوں..... ہماری کوئی انڈر اسٹینڈنگ ہی نہیں۔

''اور اب؟'' ہوا کے تیز جھونکے نے میرے خیالات پر ایک طمانچہ رسید کیا۔

''اب..... میں کیا کہوں؟''

''بس کیا کہوں؟''

''اور مجھے کہنے کی بھلا ضرورت بھی کیا ہے؟''

میں نے آسمان کی طرف نگاہ کی۔ مٹیالے بادلوں کے بکھرے ہوئے ٹکڑے یکجا ہو کر سیاہ ہو گئے تھے۔ ایک دم سے بادل گرجنے لگے اور بجلی چمکنے لگی ایسے جیسے کوئی تازیانہ برساتا ہو اور بادل چیختے ہوئے ایک دوسرے میں گھس رہے ہوں۔ جیسے کوئی طاقتور انہیں ہانک ہانک کر اکٹھا کر رہا ہو۔

''یقیناً وہ قہار ہی تھا۔ جس کا قہر زلزلوں، بجلیوں، سیلابوں اور آندھیوں کی شکل میں

نازل ہوتا ہے۔''

میں نے خوفزدہ ہو کر کھڑکی بند کر لی۔ میرا چہلیں کرتا، ہمکتا ٹھمکتا دل سینے کے اندھیرے کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔

❁❁❁

تیز ہوا آندھی کی صورت اختیار کر چکی تھی اور رم جھم پھوار طوفانی بارش کی، میرا پُرسکون ٹھہرا ہوا دل ایک دم سے اتنا گھبرا گیا کہ مجھے سنبھالنا مشکل ہو گیا میری طبیعت اس رات اچانک خراب ہو گئی۔ پیٹ میں اٹھنے والا معمولی سا درد جان لیوا لہروں میں بدل گیا۔ عجیب درد تھا اور اتنا شدید بھی کہ پہلے کبھی میرا وجود ایسی اذیت سے دوچار نہ ہوا تھا۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ احمد بے خبر سو رہے تھے۔ میں نے کچھ دیر تو درد کو برداشت کیا مگر جب بات میری برداشت سے باہر ہو گئی تو میں نے ڈرتے ڈرتے احمد کو جگایا اس وقت میری یہ حالت تھی کہ میں دو قدم بھی نہ اٹھ سکتی تھی کہ جا کر اماں جان کو بتاتی۔

''احمد!..... احمد!'' میری گھٹی گھٹی سی آواز بمشکل نکلی۔

''ہوں..... کیا ہے؟'' وہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھے۔

''کیا مصیبت آن پڑی..... اس وقت؟'' وہ مجھے ناپسندیدگی سے دیکھتے ہوئے بڑبڑائے۔

''احمد میری طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے۔'' میری آواز مزید گھٹنے کے ساتھ ساتھ میری آنکھوں سے آنسو بھی جاری ہو گئے تھے۔

''تو پھر میں کیا کروں؟'' وہ کٹھور پن سے بولے۔

''احمد! مجھے لگتا ہے یہ درد میری جان لے لے گا۔'' میں نے موت کے خوف سے آنکھیں میچتے ہوئے کہا۔

''درد.....'' احمد بستر سے نیچے اتر آئے۔ ''میں اماں جان کو بلا لاتا ہوں۔'' وہ میری زرد پڑتی رنگت دیکھ کر گھبرا گئے تھے۔

''احمد..... احمد.....'' میرے ہاتھ ان کی طرف بڑھے۔ بس اتنا مجھے یاد تھا۔ پھر کیا ہوا۔ مجھے کچھ یاد نہ تھا۔ ہوش آیا تو میں ہسپتال میں تھی۔ مجھے لیبر روم لے جانے کی تیاریاں ہو رہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھیں۔ میں ابھی بھی اسی اذیت ناک درد سے دوچار تھی جو آج میری جان لینے کے درپے تھا۔ میں کچھ ہوش اور کچھ بے ہوشی کے عالم میں تھی۔ تبھی چند آوازیں میرے کانوں میں پڑیں۔

''آپ نے کچھ بتایا نہیں کہ ہم کیا کریں۔ آپ کی بیوی اور بچے میں سے کسی ایک کو بچانے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔ کس کو بچائیں؟ آپ اس فارم پر دستخط کردیں۔'' یہ کسی لیڈی ڈاکٹر کی آواز تھی۔

''میری اور میرے بچے دونوں کی جان خطرے میں ہے۔'' یہ سن کر میری رہی سہی ہمت بھی جواب دینے لگی۔

''رحم میرے مالک رحم۔'' میرے سارے وجود نے التجا کی۔

''میرے بچے کو زندگی دینا یا اللہ..... میرے بچے کو زندگی دینا۔''

میری ممتا تڑپ تڑپ کر دعا کرنے لگی۔ وہ جو میری کوکھ میں اب بھی سانسیں لے رہا تھا جسے میری آنکھ نے نہ دیکھا نہ میری انگلیوں نے چھوا تھا۔ وہ مجھے خود سے زیادہ عزیز تھا اور یہی تو وہ احساس تھا۔ وہ وجود تھا جس نے مجھے بدل دیا تھا۔ اسی کی قربت نے مجھے رب کی حُب دی تھی۔

''یا اللہ! میری خطاؤں کو معاف کردینا۔'' مجھے اس وقت اپنی موت بالکل قریب دکھائی دے رہی تھی۔

''آپ نے دستخط نہیں کیے ابھی تک؟'' ڈاکٹر کی آواز نے دوبارہ اس کمرے کی خاموشی کو توڑا جس میں موجود لوگوں کے ہونٹوں پر چپ کے قفل پڑ چکے تھے۔

''آپ دونوں کو بچانے کی کوشش کریں۔'' ماں جان کی التجائیہ آواز نے کمرے کی چپ توڑی۔

''یہ ناممکن ہے۔'' ڈاکٹر کی آواز میں پریشانی تھی۔

''آپ کو کسی ایک کے بارے میں ہمیں واضح کرنا ہوگا۔'' اب ڈاکٹر کی آواز سے اس کے اندر کی کشمکش صاف اُجاگر ہورہی تھی۔ ادھر میری سانسیں مزید اُکھڑ رہی تھیں۔

''آپ آئمہ کو بچانے کی کوشش کریں۔'' میری ڈوبتی ہوئی سانسوں نے کانوں میں آکر ایک سرگوشی سنی اور پھر میرا دماغ کسی اندھیرے کنویں میں ڈوبتا چلا گیا۔

❁❁❁

میں نے دنیا میں دوبارہ آنکھ کھولی تو ایک ننھا منا سا وجود میرے پہلو میں کسمسا رہا تھا۔

''عائش۔'' میرے لبوں سے بے ساختہ نکلا اور میں نے اسے اٹھا کر سینے سے لگالیا۔ بے تحاشہ چوما۔

''الحمدللہ.....'' میرے خطا کار جسم کا ریشہ ریشہ اس مالک کا شکر گزار تھا بے شک وہ اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرنے والا ہے۔ میں نے اپنے بچے کے لیے اس سے تڑپ کر التجا کی تو اس نے مجھے بھی زندگی عطا کردی ہاں وہی تو ہے۔

مایوسیوں میں امید
اندھیروں میں روشنی
بے بسی میں سہارا
ناامیدیوں میں امید
سب چاہنے والوں سے بڑھ کر چاہنے والا
سب رشتہ داروں سے بڑھ کر خیر خواہ۔

سب لوگ بے حد خوش تھے۔ ہر طرف سے مبارکبادوں کا شور تھا۔ ڈاکٹرز سب حیران تھیں کہ آخر یہ ناممکن کیسے ممکن ہوگیا؟ اور میں بے حد نادم..... بے حد شرمندہ..... اس کے اتنے بڑے احسان تلے دبی..... کہ اس نے آج بھی میری سن لی تھی اور اس سے بھی بڑھ کر اس غمگسار نے میرے غم کا مداوا یہ کیا تھا کہ احمد کے دل میں میری زندگی..... میرے زندہ رہنے کی خواہش کو پھر سے زندہ کردیا تھا۔ ورنہ تو وہ مجھے کئی بار کہہ چکے تھے۔ اب تم میرے جی سے اُتر چکی ہو۔ میرے لیے تمہارا مرجانا یا جینا کچھ اہمیت نہیں رکھتا اور اب..... اب میرا رواں رواں احساسِ تشکر سے جھکتا چلا گیا۔ اپنے حبیب..... اپنے مالک..... اپنے ہمدم کے حضور۔

میری نظر باہر کھڑکی سے پرے گئی تو وہاں پتے ہوا میں تالیاں بجا رہے تھے۔ درخت جھوم رہے تھے اور ہوا پھولوں کے مکھڑوں سے خوشبو چن چن کے فضا میں لنڈھا رہی تھی۔ سب میری خوشی میں خوش تھے اور کوئی میری شہ رگ کو بے حد محبت سے اپنی نرم نرم انگلیوں سے چھوتا ہوا کہہ رہا تھا۔

''میں ہوں..... ہاں..... تمہارے لیے میں ہی کافی ہوں۔''

❁❁❁

میری عائش ایک برس کی ہونے کو ہے۔ میں اس کے ہمراہ بے حد خوش ہوں۔ دنیا کے غم میرے لیے اب بے معنی ہیں۔

میرے ارد گرد دنیا کی نعمتوں، آرائشوں اور آسائشوں کا ڈھیر ہے میرے میکے اور سسرال میں میری بے حد عزت ہے۔

عائش بہت صحت مند ہے اور خوب صورت بھی بالکل میرے جیسی لیکن میں نے سوچ لیا ہے کہ میں اسے ''آئمہ حسن'' نہیں بننے دوں گی۔ اسے ''عائش احمد'' بنانے کا عہد میں نے اس کی پیدائش کے فوراً بعد ہی کر لیا تھا۔

میں نہیں چاہتی میری بیٹی مجھ جیسی نادانیاں اور خطائیں کرے۔

بلکہ میں تو کہتی ہوں کوئی بھی عورت کبھی اپنے شوہر کے ساتھ وہ نہ کرے جو میں نے احمد کے ساتھ کیا تھا۔

چاہنے والے شوہر اس دنیا میں ایک عورت کے لیے رُوئے زمین کی سب سے بڑی نعمت ہوتے ہیں اور اگر کوئی عورت اتنی بڑی نعمت کے ملنے پر شکر گزار نہ ہو۔ اس کی قدر دان نہ ہو۔ تو پھر یہ نعمت زیادہ دیر اسے حاصل نہیں رہتی۔ اللہ نہ کرے کہ کسی بیوی کو اس کے شوہر کی محبت کے بغیر جینا پڑے۔ اس دنیا کے سارے ستم ایک طرف اور شوہر کے دل سے در بدری ایک طرف۔

''ہائے کوئی مجھ سے پوچھے..... اپنے نصف کے بغیر زندگی کیا ہوتی ہے؟''

احمد نے مجھے طلاق نہیں دی۔

نہ ہی انہوں نے مجھے گھر سے نکالا۔

وہ میرا خیال بھی رکھتے ہیں۔

مجھ سے بات چیت بھی ہنس کر کرتے ہیں۔

عائش میں تو ان کی جان ہے۔

یقیناً وہ ایک بہترین شوہر ہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بہترین باپ ہیں۔

لیکن..... لیکن اب وہ میرے احمد صرف میرے نہیں رہے۔

وہ تو میرے محبوب ہیں لیکن اب انہیں مجھ سے کوئی حُب نہیں رہی۔

آہ..... میری کم نصیبی۔

نہیں..... نہیں کم نصیبی نہیں۔

یہ تو میری سزا ہے جو مجھے ہر حال میں ملنی ہی تھی۔

اب کیا مجھے اتنی سزا بھی نہ ملتی۔

نہیں نہیں..... جو ہوا..... وہ ہونا ہی تھا۔ اسے تو میں نے خود اپنے بختوں میں لکھ لیا تھا۔ پھر بھی اتنا کیا کم ہے کہ میں آج ''بانجھ'' نہیں ہوں۔ میری مٹی میں نمی تھی..... میرے وجود سے کونپل پھوٹی ہے..... اور پھر..... مجھے ''وہ'' بھی تو مل گیا ہے۔ جو زندگی کی راہوں میں میرے ساتھ غیر محسوس طریقے سے چل رہا ہے۔ حالانکہ آج بھی میں اسے اکثر بھول جاتی ہوں۔

میں اب بھی اکثر ناموافق حالات کی دلدل میں پھنس جاتی ہوں۔

اپنے نفس کی سازشوں کا شکار ہو جاتی ہوں۔

میرے اندر آج بھی نافرمانی کے جراثیم میرے لہو کے ساتھ گردش کرتے ہیں جو میرے دل و دماغ کو بیمار کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

آج بھی میں دن میں کئی بار شکوے شکایات کرتی ہوں۔ ناشکری تو فطرتاً ہوں لیکن.....

میں صدقے جاؤں اپنے محبوب کے۔

اپنے ہمدم کے.....

اس نے مجھے کبھی دھتکارا نہیں

نہ مجھ پر اپنی عنایات کا سلسلہ بند کیا ہے۔

اس کا غضب مجھ پر برسنے سے پہلے ہی ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔

میری ہمت بندھ جاتی ہے۔

اور میں اس کے دامن عفو میں پناہ ڈھونڈنے لگتی ہوں۔

بے شک اس نے مجھے تنہا نہیں چھوڑا۔

میں نے اپنے ساتھ سوئی ہوئی عائش کے ماتھے پر محبت سے بوسہ دیا وہ سوتے میں بالکل احمد جیسی دکھائی دیتی تھی۔

''ا.....ح.....م.....د.....'' میری سانسیں ٹھنڈی برف ہوگئیں اور میں اپنے آدھے سُونے بستر کو حسرت سے دیکھنے لگی۔ جہاں ایک بھی سلوٹ ایک بھی شکن ایسی نہ تھی جو احمد کی کسی بے تاب کروٹ سے جاگی ہو۔

''آہ..... کسی جوان سہاگن کا بستر سُونا ہو۔ اس سے بڑھ کر قیامت کیا ہوتی ہوگی۔''

میں نے عائش کا سر اپنے بازو سے بہت آہستگی کے ساتھ اُتارا اور بستر سے اُتر آئی۔ رات بھیگ رہی تھی اور میری آنکھیں بھی.....

''پھر بھی تم احمد کا دل نہ جیت سکیں؟'' میرے اندر کی آئمہ نے مچل کر کہا۔ وہ آج بھی میرے نفس میں چھپ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے اندر ابھی تک نافرمانی کے جراثیم موجود تھے۔ جو میری گردش لہو میں انتشار برپا کرنے کی جدوجہد میں لگے رہتے تھے تاکہ میں اپنے ازدواجی حالات کو ناموافق سمجھ کر پھر سے اپنے حقوق کی دلدل میں پھنس جاؤں۔

''اوہ شٹ اَپ۔ تم تو چپ رہو۔'' میں نے اس فساد کی شوقین آئمہ کو جھڑکا۔ ''احمد کا دل میں نے ہی تو توڑا تھا۔ کیا تم نہیں جانتی ہو میں نے احمد کو اپنی جھوٹی خودی کی بھینٹ کس بے دردی سے چڑھایا تھا۔

میں نے کھلے دل سے اپنے جرم کا اقرار کیا۔

''تم بزدل بھی ہوگئی ہو اور شاید پاگل بھی۔'' میرے دل میں انکی پھانس نے آج پھر کئی روز کے بعد اپنا منہ کھولا اور میرے دل پر چٹکی بھر لی۔

''بزدل کیوں؟'' مجھے اس کی بات عجیب لگی۔

''دنیا بھر کی عورتوں کے حقوق کے لیے تحریکیں چلاتی رہی ہو اور آج تم نے اپنا حق کتنی آسانی سے چھوڑ دیا۔ آج اپنی باری آئی تو تمہیں بھی احمد بے قصور دکھائی دے رہا ہے۔ بالکل ان جاہل عورتوں کی طرح جو اپنے مردوں کا ہر ظلم ان کی محبت جان کر برداشت کرتی رہتی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہیں۔'' وہ پھانس میرے دل کے خلیوں میں پھنسنے لگی۔

''احمد نے کیا کیا؟'' میں نے جان بوجھ کر احمد کے سلوک کو نظر انداز کرتے ہوئے بھولپن سے پوچھا۔

''اچھا، کچھ نہیں کیا؟'' میرا دل لمحہ بھر کو دھڑکنا بھول کر محوِ حیرت ہوا۔ ''اس نے تمہیں دھتکار دیا۔ تمہاری خطا کو ہزار معافیاں مانگنے پر بھی معاف نہیں کیا اور تم پھر بھی اس کی حمایت کر رہی ہو۔ وہ تم سے محبت کا دعویدار تھا۔ تمہیں معاف کر دیتا تو کیا ہو جاتا؟ ایک بھول ہی تو تھی ہوگئی تم سے.....''

''وہ ایک بھول نہیں تھی ایک بہتان تھا، تہمت تھی جو میں نے احمد پر ناحق لگائی تھی۔ مرد اور عورت کی تفریق کے بغیر تہمت کی سزا تو ملنی چاہیے۔ تاکہ معاشرت میں انارکی نہ پھیلے۔''

''اچھا تو تمہارے ساتھ اللہ نے کیا کیا؟''

''خبردار! اگر میرے اللہ کے بارے میں کچھ گستاخی کی۔''

میں نے ازلی گستاخ اور نافرمان آئمہ کو دور سے جھڑکتے ہوئے آگے کچھ بھی بولنے سے روک دیا۔ ''میری عمر بھر کی خطاؤں پر اس مہربان نے تو مجھے صرف تنبیہ کی تھی۔ میں اس مالک کی اس ذرہ بھر تادیب سے بے زار نہیں ہونے والی۔ کیونکہ..... اب میں جان گئی ہوں کہ اللہ تعالیٰ جس سے پیار کرتا ہے اور جس کا بھلا چاہتا ہے اسے ہی تنبیہ کرتا ہے۔

❁❁❁

میں نے اپنے بازو پر سے سر رکھے سوئی ہوئی عائش کا سر بڑی آہستگی سے اٹھا کر تکیے پر رکھا اور اسی آہستگی سے بستر سے نیچے آ گئی۔ سامنے سٹڈی سے آتی تیز روشنی کو دیکھا اور دبے قدموں سے سٹڈی روم میں آ گئی۔

احمد آج کوئی کتاب پڑھتے پڑھتے سو گئے تھے میں نے ان کے سینے پر دھری کتاب کو ہولے سے اٹھایا یہ ناصر کاظمی کی ''پہلی بارش'' تھی ان کو اچھی کتابیں پڑھنے کا شوق پہلے ہی تھا مگر اب تو انہوں نے ان کتابوں میں ہی اپنا آپ چھپایا تھا۔ حتیٰ کہ اپنا بستر بھی انہوں نے عائش کی پیدائش کے بعد سے یہیں لگا لیا تھا۔ انہوں نے اپنے دل کی دیواریں مجھ پر اونچی کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی خواب گاہ بھی دیوار کے پار کر لی تھی یہی میری سزا تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قیامت خیز سزا
جلتے سلگتے رتجگوں کی سزا
سونے آدھے بستر پر رات بھر تنہا کروٹیں بدلنے کی سزا
دوزخ سے اپنی جنت کو حسرت بھری نگاہوں سے تکتے رہنے کی سزا
اس سے بڑھ کر
بھلا میری سزا اور کیا ہو سکتی تھی
میں نے انہیں سینے تک کمبل اوڑھایا اور یونہی کتاب کے وہ صفحے پڑھنے لگی جنہیں پڑھتے پڑھتے احمد سو گئے تھے۔

تیرا قصور نہیں، میرا تھا
میں تجھ کو، اپنا سمجھا تھا
اب تجھے کیا کیا یاد دلاؤں
اب تو وہ سب کچھ ہی دھوکہ تھا
دل کو یونہی سا رنج ہے ورنہ
تیرا میرا ساتھ ہی کیا تھا

❁❁❁

''احمد! آپ.....'' میرے لبوں سے بے ساختہ سسکیاں نکلنے لگیں وہ کس قدر دُکھی ہیں ان کے دل کا درد آج بھی تازہ تھا۔

درد جو ان کی محبت کا حاصل تھا۔

وہ محبت جو انہوں نے آئمہ سے کی تھی۔

میرا جی چاہا میں ان کے پیروں سے لپٹ جاؤں اور کہوں بھول جاؤ احمد! بھول جاؤ جو ہونا تھا ہو گیا۔ آؤ ہم پھر سے محبتوں کے ایک نئے دیس کی جانب چلیں وہاں جہاں دھرتی سے آکاش ملتا ہے۔ جہاں خوشیوں کا ٹھاٹھیں مارتا دریا سمندر کی گود میں جا اُترتا تھا۔ آؤ ہم پھر سے ساتھ چلیں۔

''میرا جی چاہا میں ہی وہ سمندر بن جاؤں اور احمد کے سارے درد اپنے اندر سمولوں

احمد!'' میں نے انہیں چھونے کو ہاتھ بڑھایا مگر میں انہیں چھو نہ سکی میرے دائیں پاؤں کے تلوے سے لپک کر کوئی چیز میری انگلی میں آن چبھی تھی۔ جس کی جلن سے میرا لہو لال انگارہ ہونے لگا تھا۔

خود کو اتنا مت گراؤ؟
محبت کے لیے کیا بھیک مانگو گی؟
وہ پھر دھتکار دے گا؟
پتھر کے دریا میں کوئی لہر نہیں اٹھتی؟
آئمہ! تم عورت ہو کسی کے پاؤں کی دھول نہیں۔

میری رگوں میں بے شمار پھانسیں دھنسنے لگیں۔

''اُف..... اس ایک کانٹے نے میرے اندر کتنے بیج بو دیئے تھے۔ جن میں سے بدگمانیوں کی بے شمار بیلیں نکلتی اور میرے دل و دماغ پر لپٹتی رہتی تھیں۔ جو آج بھی مجھے احمد سے بدظن کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتی تھیں۔ انہوں نے تو مجھے احمد سے علیحدہ کر دینے کا بھی کوئی حربہ نہ چھوڑا تھا۔ اگر میرے پاس ان کے زہر کا تریاق نہ آ جاتا تو یقیناً آج میرے دل و دماغ میں ''خناس'' کے ہریاول کے سوا کچھ بھی نہ ہوتا۔ احمد کی محبت کا ہر سوتا اس کی سرانڈ سے مر چکا ہوتا۔

میں نے اپنی پتھر ہوئی انگلیوں کو زبردستی حرکت دی اور احمد کو بڑی آہستگی بڑی محبت سے چھو لیا۔ ''شکر ہے میرے مالک کہ احمد آج بھی میرے سامنے ہیں۔ میری ہر صبح ان کا چہرہ دیکھ کر ہوتی ہے۔ اگرچہ ان کا دل میری دسترس میں ابھی نہیں ہے لیکن! آج میرے دل پر احمد کا اختیار ہے..... مکمل اختیار..... میں نے اپنا آپ پوری ایمانداری سے انہیں ''دان'' کر دیا ہے اور مجھے یقین ہے ان کی نگاہ الفت پھر میری طرف اٹھے گی جس میں محبت کا وہی ایک جہان آباد ہو گا۔ جہاں ٹھنڈی دھوپ کی چھتری تانے پیڑ کے پیچھے پیڑ ہو گا میں نے مسکرا کر احمد کی طرف دیکھا اور وضو کرنے چل دی۔

وضو کرتے ہوئے میری انگلیوں نے میرے دائیں پاؤں کے تلوے پر چلو بھر کے پانی ڈالا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تین برس پہلے رات کے تیسرے پہر میں چبھی پھانس نے گھبرا کر اپنا منہ اندر کر لیا میں
نے پھر پانی ڈالا۔
اور پھر پانی ڈالا
یہاں تک کہ وہ پھانس معمولی تنکا ہو کر اس میں تیرنے لگی۔
میرے تلوے میں پڑا وہ ذرہ برابر گڑھا سمندر ہو گیا اور میری رگ رگ میں بہنے لگا۔
میرے دل و دماغ کی کثافتیں جس کی سطح پر ہلکورے لینے لگی میں چاہتی تو اس پھانس کو چنگ
میں بھر کے نکال سکتی تھی لیکن مجھے اب اس کا ہونا اچھا لگنے لگا تھا یہ دو مونہی پھانس بڑی عجیب
تھی۔ ایک منہ سے مجھے ڈستی تو دوسرے منہ سے خود ہی اپنا زہر چاٹ بھی لیتی تھی۔ ایک م
سے میرا دل کھرچتی تو دوسرے منہ سے میرے زخم صاف کرنے لگتی۔ دشمن کے لبادے میں
میں میری دوست کے بارے میں سوچتی ہوئی جائے نماز پر آ گئی اس یقین کے ساتھ کہ:

میرے اور احمد کے بیچ پتھر کا یہ دریا
کبھی نا کبھی ضرور جل تھل ہو گا
کیونکہ سوکھ گئی جب سکھ کی ڈالی
تنہائی کا پھول کھلا تھا
تنہائی میں یاد خدا تھی
تنہائی میں خوف خدا تھا
تنہائی میرا پائے شکستہ
تنہائی میرا دست دعا تھا

میری آنکھوں کے کناروں سے سمندر چھلکنے لگا اور میرے اندر کی ساری کثافتیں
لگیں۔

ختم شد